احمدی نوجوانوں کیلئے
ماھنامہ
خالد
ربوہ

ڈاکٹر عبد السلام نمبر

دسمبر ۱۹۹۷ء

ایڈیٹر
سید مبشر احمد ایاز

ایک عظیم مؤحد سائنسدان

پروفیسر ڈاکٹر ابو احمد محمد عبد السلام ۱۳۴۴—۱۴۱۷ھ
۱۹۲۶—۱۹۹۶ء

سِلسلہ عالیہ احمدیہ کی صداقت کا عظیم الشّان نشان

حضرت بانیٔ سِلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں :۔

"....خدا نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبّت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے سِلسلہ کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کرے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اِس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچّائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے سب کا مُنہ بند کر دیں گے...

سو اے سُننے والو! اِن باتوں کو یاد رکھو اور اِن پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ کر لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پُورا ہو گا۔"

(تجلّیاتِ الٰہیہ صفحہ ۱۷، ۱۸)

احمدی نوجوانوں کیلئے
ماہنامہ **خالد** ربوہ

پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام نمبر
جلد: ۴۶ ۞ شمارہ: ۲
دسمبر ۱۹۹۷ء/فتح ۱۳۷۶ ہش

قیمت برائے خریداران
۱۲ روپے
قیمت زائد شمارہ
۳۵ روپے

ایڈیٹر
سید مبشر احمد ایاز

الفہرس

اس کے علاوہ مکرم سلیم شاہجہانپوری صاحب، راغب مراد آبادی، عبدالکریم قدسی، ظہور الدین بابر، بشریٰ ربانی، عطاء القدوس اور انگریزی شاعر Fred Reins صاحبان کا منظوم خراجِ عقیدت اور انگریزی اخبارات کے تبصرے اور Many Salams to Dr. Salam

سٹاپ پریس: ٹریسٹے سنٹر اٹلی کا نام ڈاکٹر صاحب کے نام پر "سلام سنٹر" رکھ دیا گیا —— تفصیل صفحہ ۲۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

اداریہ

چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے

قابلِ رشک عظمتوں کے حامل منفرد وجودوں میں سے ایک وجود

ڈاکٹر محمد عبدالسلام

لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد عبدالسلام کو فزکس میں نوبیل انعام ملا تھا اِس لئے ڈاکٹر صاحب بہت بڑی شخصیت ہیں۔ گویا کہ ڈاکٹر صاحب کی عظمت اور مقام اِس لئے ہے کہ آپ کو یہ انعام ملا تھا حالانکہ یہ درست نہیں ـــــ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب عظیم تھے اِس لئے آپ کو نوبیل انعام ملا ـــــ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ دُنیا والوں کے پاس مادی اعتبار سے نوبیل انعام سے بڑا انعام کوئی تھا ہی نہیں اِس لئے جو کچھ بھی تھا وہی انہوں نے پیش کر دیا ـــــ اور یُوں آپ کی عظمت اور مقام کو تسلیم کرنے کا دراصل ایک اظہار تھا جو اس انعام کی صورت میں دُنیا نے کیا ـــــ

درحقیقت وہ "عظمت" کیا تھی جس نے آپ کو ان اعلیٰ بلندیوں تک پہنچایا جس نے عظمتوں کے چاند لگائے اور شہرتوں کے ستارے ٹانکے ـــــ جس نے دُنیا کے بادشاہوں، یونیورسٹیوں کے سربراہوں، چوٹی کے سائنسدانوں، نامور دانشوروں اور فلاسفروں کو ڈاکٹر عبدالسلام کی علمی برتری اور علم و معرفت میں کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ـــــ

وہ کیا بات تھی ـــــ کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ایوارڈ اور اعزاز آپ کی جھولی میں گِر کر خود فخر کرتا رہا ـــــ

ڈاکٹر عبدالسلام کی وہ کیا خوبی تھی کہ امریکہ ہو یا افریقہ، یورپ ہو یا آسٹریلیا ـــــ ایشیا کے ترقی یافتہ ممالک ہوں یا پسماندہ ترقی پذیر ملک ـــــ سب کے سب ڈاکٹر عبدالسلام کو ـــــ اپنا شہری سمجھنے کی حسرت لئے ہوئے تھے ـــــ

ڈاکٹر عبدالسلام میں وہ کیا چیز تھی ـــــ کہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ـــــ کافر ہو یا مومن ـــــ خدا کو ماننے والا ہو یا منکر ـــــ تمام لوگ ایک ہی رنگ میں ـــــ ایک ہی انداز میں آپ کی عزّت و توقیر کرنے پر نہ صرف مجبور ہو جایا کرتے تھے بلکہ اس میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا کرتے تھے ـــــ

وہ کیا خصوصیّت تھی ـــــ کہ بڑے سے بڑا عالم اور ڈاکٹر اور پروفیسر اور محقق ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے کے لئے گھنٹوں سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سننے کے محتاج اور بے تاب ہؤا کرتے تھے ـــــ جس کے لئے ملکوں کی یونیورسٹیاں فخر کرتی تھیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ہماری اعزازی ڈگری کو قبولیّت کا شرف بخشا ہے ـــــ

آخر وہ کیا خوبی تھی کہ جس کے علم و معرفت کا کمال ساری دُنیا کا مُنہ بند کئے ہوئے تھا ـــــ ہر قوم کا فرد فرد جس کے علم و تحقیق کے اس شیریں چشمہ سے آکر پانی پیتا اور سیراب ہو کر جاتا ـــــ اپنی پیاس بجھاتا ـــــ

کیا یہ نوبیل انعام کی وجہ سے تھا ـــــ نہیں نہیں ـــــ عبدالسلام کی عظمت کے بلند میناروں کے سامنے یہ ایک انعام تو بہت چھوٹی اور معمولی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے ـــــ اس کے علم و معرفت کے بحرِ زخّار میں یہ نوبیل انعام کی سند اور میڈل اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باعث ڈوب ڈوب جاتا ہے ـــــ اس کی حقیقت ہی کچھ نہیں ـــــ

تو آخر وہ کیا وجہ تھی کہ عظمتوں کے چاند اس کے ماتھے کا جھومر بن گئے ـــــ میڈل اور اعزاز اسکے ساتھ لگ کر خود اعزاز پا گئے ـــــ وہ کیا چیز تھی کہ مغرب کے دانشور اس کو "پرافٹ آف سائنس" کہنے لگ گئے ـــــ

وہ عظمت بخشنے والا پارس ـــــ اقرارِ توحید ـــــ تھا ـــــ خدائے واحد و لاشریک کا نظریاتی و علمی اور عملی اقرار تھا ـــــ جس عظیم نے اس کو عظمتوں سے مالا مال کر دیا ـــــ

اور اس سُنہری اصول اور کامیابی کے راز کو عطا کرنے کا باعث ـــــ قرآن کریم اور حضرت اقدس محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی تعلیمات اور تحریرات تھیں ـــــ

اور حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے ساتھ کئے جانے والے وہ خدائی وعدے اور بشارتیں جو آپ کے ماننے والوں اور پیروکاروں کے حق میں خدا نے کئے ـــــ

اور ان عظمتوں کی راہ تیار کرنے والے اور ان عظمتوں کے نُور کو ڈاکٹر عبدالسلام کے خون میں منتقل

کرنے والے —— آپ کے بزرگ اور نیک فطرت صالح والدین تھے —— کہ جن کی شب و روز کی دعائیں خون بن کر ڈاکٹر صاحب کے رگ و ریشہ میں سما گئیں ——

اور بلاشبہ —— اور یقیناً یقیناً —— آپ کی تمام تر عظمتوں اور علمی شہرتوں کی اِس ناؤ کو زندگی کے کنارے تک لگانے والے —— وجود —— ناخدا —— خلیفۃ المسیح —— کے نورانی وجود تھے —— کہ جن کی دعاؤں، راہنمائی اور جن کے ساتھ محبت کے ساتھ عقیدت و وابستگی —— ڈاکٹر صاحب کو کمال حفاظت کے ساتھ زندگی کے ایک اُفق سے طلوع کر کے نیک آغاز کے ساتھ نہایت تابناک عظمتوں کی بلندیوں تک لے گئی اور اسی عظمت اور شہرت کے ساتھ آپ کا ایک نیک اور قابلِ رشک انجام ہوا ——

خدا تعالیٰ کی توحید کے قولی و فعلی اقرار، بزرگ ماں باپ کی دعاؤں، مسلسل محنت اور عاجزی و انکساری اور خلافت کے ساتھ گہری محبت اور والہانہ عشق کی بناء پر —— یہ ساری عظمتیں آپ کو نصیب ہوئیں ان کے بغیر یہ سب کچھ ناممکن تھا —— نوبیل انعام تو ویسے بھی ملا کرتے ہیں اور یوں تو نوبیل انعام یافتہ بھی ہؤا کرتے ہیں —— لیکن وہ محمد عبدالسلام —— نہیں ہؤا کرتے ——

اِسی عبدالسلام —— کے متعلق یہ نمبر ترتیب دیا گیا ہے تا ہم دیکھیں کہ وہ کیا امور تھے کہ جو آپ کو اِس مقام تک پہنچا گئے اور یُوں ہم بھی ان نیک باتوں کو اپنی زندگیوں میں عمل کے ساتھ یاد رکھیں اور حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے ساتھ کئے جانے والے خدائی وعدوں اور بشارتوں کے مصداق بنیں تا رہتی دُنیا تک ایسے نیک وجودوں کے ساتھ ہمارا نام شامل ہو اور خدائے عظیم و لازوال کی نعمتیں عظمتوں کی صورت میں ہمیں اور ہماری نسلوں کو بھی نصیب ہوں —— سیرت و سوانح کے ایسے خاص شماروں میں ان بزرگوں کی سوانح شائع کرنے کا وہی بنیادی مقصد ہؤا کرتا ہے ——

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اِس مضمون کی اہمیّت و افادیّت کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"..... سوانح نویسی سے اصل مطلب تو یہ ہے کہ تا اس زمانہ کے لوگ یا آنیوالی نسلیں اُن لوگوں کے واقعاتِ زندگی پر غور کر کے کچھ نمونہ اُن کے اخلاق یا ہمت یا زہد و تقویٰ یا علم و معرفت یا تائیدِ دین یا ہمدردی نوعِ انسان یا کسی اَور قسم کی قابلِ تعریف ترقی کا اپنے لئے حاصل کریں اور کم سے کم یہ کہ قوم کے اولوالعزم لوگوں کے حالات معلوم کر کے اس شوکت اور شان کے قائل ہو جائیں جو قوم کے عمائد میں ہمیشہ سے پائی جاتی رہی ہے تا اس کو حمایتِ قوم

میں مخالفین کے سامنے پیش کر سکیں اور یا یہ کہ ان لوگوں کے مرتبت یا صدق اور کذب کی نسبت کچھ رائے قائم کر سکیں .....؛"

(کتاب البریہ صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲ حاشیہ روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰ حاشیہ)

جاننے والے تیری محبت کو
دل کی دھڑکن کے ساتھ رکھیں گے
راہِ منزل پہ زندگی کے چراغ
تیری یادوں سے روشنی لیں گے
تیرے قدموں کے برگزیدہ نشاں
رہ نوردوں کو حوصلہ دیں گے
کام آئے گی تیری عظمتِ فکر
زیست کی عظمتیں بھی دیکھیں گے
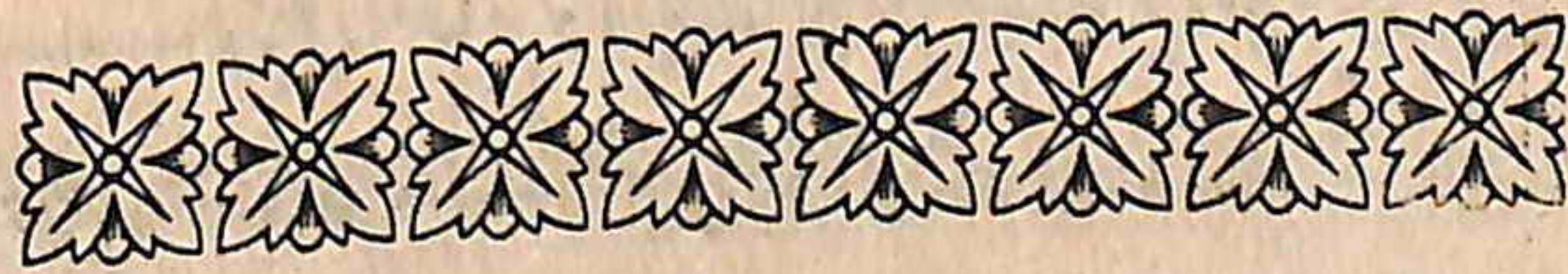
ہم آسمانِ احمدیت کے درخشندہ ستارے نوبل انعام یافتہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام

کی وفات پر دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات کو بلند فرمائے، اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور سینکڑوں عبدالسلام کی صورت میں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

قائد و اراکینِ عاملہ

مجلس خدام الاحمدیہ ضلع کراچی

غیر اُس کے سب ہیں فانی

★ بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بُنیادیں اِنسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں ــــ ڈاکٹر عبدالسّلام صاحب انہیں وجودوں میں سے ایک وجود ہیں ــــ

★ جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے ــــ ویسا کوئی اَور سائنسدان اِس جیتی دُنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا ــــ

★ دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہ عزّت کرتے تھے اور خدمت کر کے تسلّی پاتے تھے۔

★ ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ ــــ ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جُدا ہُوا ــــ

★ اللہ کے حوالے ــــ اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں۔

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع

ایدہ اللہ تعالیٰ کا پروفیسر ڈاکٹر عبدالسّلام صاحب

کا محبّت بھرا ذکرِ خیر ــــ

کل من علیھا فان ٥ و یبقی وجه ربک ذوالجلل والاکرام ٥ فبای الاء ربکما تکذبن ٥ یسئله من فی السموات والارض کل یوم ھو فی شان ٥ فبای الاء ربکما تکذبن ٥

(سورۃ الرحمان: آیات ۲۷ تا ۳۱)

حضور نے فرمایا:۔

یہ سورۃ رحمان کی آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس پر یعنی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے "و یبقی وجه ربک ذوالجلل والاکرام" اور صرف تیرے رب کی شان جمال و جلال ہے جو باقی رہے گی۔ وہ صاحب جلال ہے اور صاحب اکرام ہے۔ "فبای الاء ربکما تکذبن" پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرتے ہو یا تکذیب کروگے۔ "یسئله من فی السموت والارض" اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں "کل یوم ھو فی شان" ہر وقت ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ "یوم" یہاں وقت کے پیمانے کے طور پر ہے۔ اس کے لئے لمحہ لمحہ بھی یہاں یوم کے مفہوم میں داخل ہے۔ "فبای الاء ربکما تکذبن" پس تم اپنے رب کی کن کن آیات کی تکذیب کروگے۔ یہاں دونوں کا لفظ خطاب میں شامل ہے مگر جب ہم اردو میں تم کہتے ہیں تو لازم نہیں ہوا کرتا کہ "دونوں" لفظ کو دہرایا جائے مگر قرآن کریم نے یہاں جب بھی سوال اٹھایا ہے تو تم دونوں کہہ کر اٹھایا ہے۔ تو تم دونوں کن کن باتوں میں یعنی خدا تعالیٰ کی کس کس شان اور جلوہ گری کی تکذیب کرتے ہو یا کروگے۔

......پس یہی وہ مضمون ہے جو ساری دنیا میں سب کے لئے قدر مشترک رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انسان اپنی فنا پر ویسا یقین نہیں رکھتا جیسا یقین اس کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا جانتے ہوئے کہ موت مقدر ہے پھر بھی اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتی تو قرآن کریم کا اس شان کے ساتھ اس مضمون کا ذکر فرمانا جو بظاہر دنیا میں سب کو معلوم ہو یہ بتا رہا ہے کہ تمہیں وہم ہے کہ تم جانتے ہو، تم نہیں جانتے کہ ہر چیز فانی ہے اور جب ہر چیز کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد یہ ہے اعلان "و یبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام" کہ ہاں تیرے رب کا جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہے گا اور دوسرا "وجه" کا مطلب رضا ہے جو باقی رہے گی۔ یعنی خدا کی رضا جس کو باقی رکھنا چاہے گی اسے رکھے گی اور جو کچھ بھی رہے گا رضا کی بنا پر، اس سے لٹک کر، اس کے سہارے رہے گا۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو اللہ کے جلال اور جمال کا جلوہ باقی رہے گا اور جس پر اس کی دائمی ازلی ابدی رضا کی نگاہ پڑی ہے وہ بھی باقی رہ سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی رضا میں شامل ہو کر اس سے الگ رہ کر نہیں۔

دوسری بات جو اس میں خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ چیزوں کے فنا کا، ان کی عظمت کے ساتھ جو تعلق ہے یہ مضمون اس بات کو خوب کھول کر بیان فرما رہا ہے کہ تمہاری عزتیں، تمہاری دنیا کی نمود کی کمائی جو کچھ بھی ہے اس کی خاطر تم دنیا سے چمٹے ہوئے تھے تو یاد رکھو کہ وہ بھی فنا ہیں اور اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں ایک خدا کے جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ اس

نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان پاکستان کی سائنسی ترقی کی خواہش دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وہ تمام زندگی پاکستان کے نوجوان سائنس دانوں کو تربیت دینے کے لئے پاکستان میں ادارہ قائم کرنے کے خواب دیکھتے رہے۔ تاہم ایوب خان سے لے کر بے نظیر بھٹو تک کوئی حکومت انہیں پاکستان لانے کی جرات نہ کر سکی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کی محبّت اور شفقت کا انمول انداز

(ڈاکٹر محمد عبد السلام صاحب دربار خلافت میں)

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
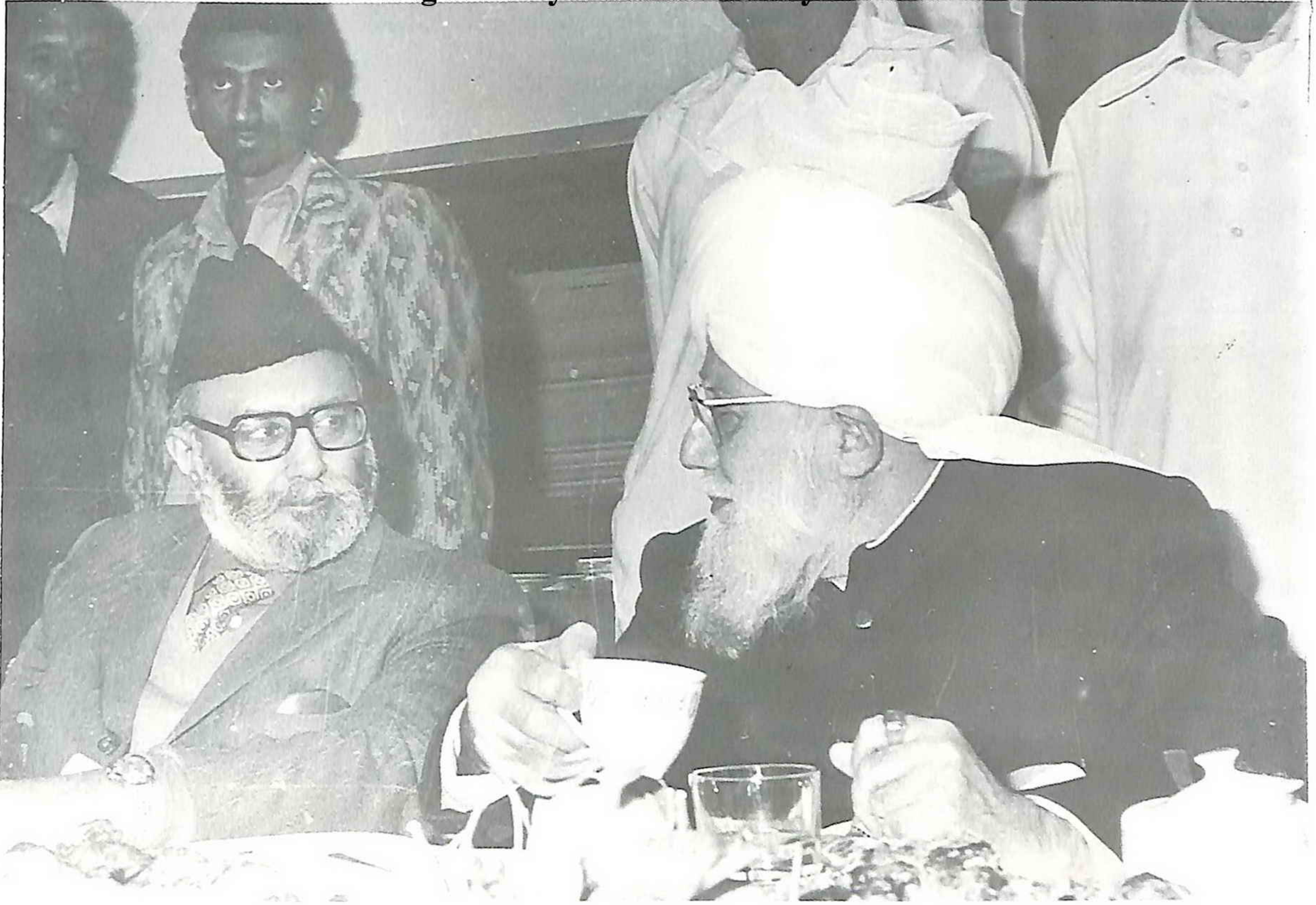
حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ساتھ محوِ گفتگو

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث [illegible]

نوبیل انعام لینے کے بعد ربوہ آمد پر

۱۹۷۹ء میں ربوہ آمد پر اہالیانِ ربوہ کی طرف سے منعقدہ استقبالیہ تقریب

اِک چراغ علم کا روشن تھا، بجھا تیرے بعد
دَہر میں اَب کوئی تجھ سا نہ رہا تیرے بعد

کسرِ صلیب کانفرنس ۱۹۷۸ء منعقدہ لندن کے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے

لئے اگر عزتوں کی خاطر تم کچھ کرتے ہو' اپنی دنیا کی نام و نمود کے لئے محنتیں کرتے ہو تو وقت آئے گا جب وہ چیزیں مٹ جائیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور بعض لوگوں اور بعض بڑے بڑے بادشاہوں کی عزت اور نام و نمود تو ہمیں دنیا میں پیچھے باقی رہتی دکھائی دیتی ہے یہ کیوں باقی رہی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اول تو یہ کہ اس مضمون کا آخری فنا کے فیصلے سے تعلق ہے اس لئے اگر اس وقت سے پہلے کہ دنیا میں انسان کی صف لپیٹ دی گئی کسی کی عزت و جاہ و جلال کا تذکرہ باقی رہ بھی جائے تو اس کی حقیقت کوئی نہیں کیونکہ خدا کے علم میں یا خدا کے فیصلوں میں وقت کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انسان کے علم اور فیصلوں میں وقت کی حیثیت ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی زمانہ تقسیم نہیں کرتا۔ نہ ماضی' نہ حال' نہ مستقبل۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور یہی اس کی ازلیت اور ابدیت ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے سوا ہر چیز کو فنا ہے۔ کسی چیز کو بھی ازل اور ابد کا دعویٰ نہیں ہے' نہ ہو سکتا ہے اور پہلے جو توہمات تھے دنیا کے مثلاً آریہ سماج کا عقیدہ کہ دنیا ازل سے ہے اور بعض یورپین فلسفیوں کا بھی یہ خیال ہے کہ کوئی چیز عدم سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی اس لئے ازل سے ہے۔ اس خیال کو کلیتہ غلط ثابت کرنے میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بھی ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ پہلے جو یہ خیال تھا کہ پروٹان کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ایک Law تھا یعنی نظریہ نہیں اس کو Law کہتے ہیں۔

Indestructability of Atom جو کچھ مرضی ہو جائے ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ڈاکٹر عبدالسلام کے دور سے پہلے سائنس دانوں نے ثابت کر دیا کہ ایٹم تو Destroy ہو سکتا ہے اگر نہ ہو سکتا تو ایٹم بم کیسے بن جاتا اور پھر جب کائنات پر زیادہ گہری نظر ڈالی تو Black Hole کا جو تصور ابھرا ہے اور اس کا علم اور اس کی ماہیت سے متعلق جو سائنسی اندازے لگائے گئے تو پتہ لگا کہ Black Hole تو بنتا ہی اس وقت ہے جب کہ ایٹم آپس میں کچلے جاتے ہیں اور الیکٹرانز کے فاصلے اپنے مرکز سے اس دباؤ کی طاقت سے جو Gravitaional Pull ہے یعنی کشش ثقل اس کے نتیجے میں یوں آپس میں اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ بہت عظیم الشان وسیع کائنات

سمٹ کر گویا ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو جاتی ہے جو پھر سمٹتا اور سمٹتا اور پھر اپنی طاقت کے زور کے ساتھ ایک خودکشی کر لیتا ہے یعنی وجود اس طاقت کی عظمت کے سامنے جھک کر ایک فنا کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کے متعلق انسان کچھ نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہے اس کی پرلی طرف' اس کو کہتے ہیں Event Horizon تو یہ حصہ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے اس معاملے میں تو سائنس دانوں کی آنکھیں کہ یہ کائنات ازل سے بہرحال نہیں ہے مگر جہاں تک ابد کا تعلق ہے اس بات پر کافی اٹکے رہے ہیں کہ پروٹان Indestructable ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم و مغفور نے اس نظریہ میں بہت بڑا کام کیا ہے اور بیماری سے پہلے مجھ سے اس بارے میں جو گفتگو کا موقع مجھے ان سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے Mathematically یعنی حساب کی مدد سے جو ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پروٹانز کی عمر اتنی ہے۔ نظریہ کے طور پر تو اب سائنس دان اسے قبول کر چکے ہیں لیکن دو تین نظریئے ہیں۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں اس سے ایک حصہ کم بعض کہتے ہیں ایک حصہ زیادہ مگر جو حصہ ہے وہ بھی بڑا تصور ہے اس لئے آپ کو میں عددی تصورات میں الجھانا نہیں چاہتا۔

تو Raise to The Power of ۳۲ ہے یا ۳۳ یا ۳۴ یہ بحث چل رہی ہے بس۔ اور ۳۲ اور ۳۴ میں اتنا فرق ہے بظاہر ایک کا فرق ہے لیکن جب Power میں باتیں کی جاتی ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر عام انسانی ذہن اس کا تصور کر ہی نہیں سکتا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ مگر سائنس دان اللہ کے فضل کے ساتھ اور حساب دان بہت باریک باتوں کو اپنے استدلال کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں اور کائنات کے کناروں تک کی خبریں اپنے استدلال کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے جہاں تک مجھے یاد ہے Raise to The Power of ۳۳ کا نظریہ پیش کیا تھا اور مجھے بتا رہے تھے بلکہ کئی دفعہ بتایا کہ اس وقت دنیا میں لیبارٹری بڑی بڑی عظیم بے انتہا خرچ کر کے کام کر رہی ہیں۔ ان میں ایک امریکہ میں بھی ہے ایک اٹلی میں بھی ہے اور شاید ایک اور جگہ بھی اور اب تک جو خبریں ملی ہیں وہ امید

افزا ہیں۔ اگر یہ قطعیت سے ثابت ہو گیا تو ہرگز بعید نہیں کہ ایک اور نوبل پرائز ان کو مل جائے یعنی بطور حق کے ان کو ایسا Nobel Laureate بننے کی توفیق ملے کہ دو دفعہ زندگی میں Nobel Laureate بنیں۔

تو یہ ایک دنیا کا انعام و اکرام ہے جو ممکن تھا کہ ہو جاتا مگر جہاں تک عقلی تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کی فضیلت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے۔ کوئی دنیا کا سائنس دان نہیں ہے جو عظمت کی نگاہ سے آپ کو نہ دیکھے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ ایک وہ سائنس دان ہے جس کی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے اور حقیقت میں ان کے سامنے عظمت کے ساتھ سر جھکاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف گفتگو میں مجھے انہوں نے کئی دفعہ بتایا کہ فلاں ملک کا سربراہ اس طرح مجھ سے پیش آتا ہے' فلاں ملک کا اس طرح پیش آتا ہے' دعوتیں دیتے ہیں کہ ہمارے پاس آؤ ہم شاہی اعزاز کے ساتھ تمہاری خدمت کر کے کچھ تسلی پائیں کہ ہم نے بھی کسی بڑے انسان کی کوئی خدمت کی ہے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام و نشان نہیں تھا اور یہ وہ اصل عظمت کردار تھی جس کا میڈل سے تعلق نہیں ہے۔

پس اس مضمون کو اس طرف منتقل کرتے ہوئے میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں گا مگر اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں عامتہ الناس کے لئے بھی ایک عجیب پیغام ہے جو کوئی بلندی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کو یہ پیغام ہے کہ تم بھی تو یا بڑے لوگوں میں ہو چھوٹے لوگوں میں ہو مگر بڑے بھی مٹ جانے ہیں' چھوٹے بھی مٹ جانے ہیں اور بڑے بھی اپنی بڑائی کی شانوں کے ساتھ مٹا دیئے جائیں گے اور چھوٹے بھی جو قدریں بھی وہ رکھتے ہیں ان کے سمیت مٹا دیئے جائیں گے تو اس عارضی چیز کے لئے تم کیوں کسی سے حسد کرو کیوں تکلیف میں مبتلا رہ کر زندگی گزارو کہ فلاں تو اتنا بڑا ہو گیا' فلاں نے اتنا علم حاصل کیا' فلاں کو اس طرح دنیا نے عزتیں دیں۔ فرمایا دنیا' دنیا کی عزتیں یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں' اس سے کیوں نہیں تعلق جوڑتے جس کی رضا کا چہرہ کبھی فنا نہیں ہو گا۔

یہ وہ مضمون ہے جو ان آیات میں ہر بنی نوع انسان کی محرومی کے زخموں پر ایک ایسا پھایا رکھتا ہے کہ ہر دکھ کا علاج ہے لیکن اگر انسان اپنی توجہ پھیرے۔ چنانچہ آج صبح ڈاکٹر صاحب کے لئے دعا کے وقت یہ مضمون میرے ذہن میں ابھر کر میری دعا کو ایک اور رخ دے گیا۔ میں نے کہا یہ دنیا کی عزتیں تو آج نہیں تو کل فنا ہونے والی ہیں۔ کچھ بھی ان کا نہیں رہتا لیکن جو تیری رضا کی عزت ہے' جس کا "وجہ ربک" میں ذکر آیا ہے وہ دائمی ہے۔ پس ان کے لئے قرآن کے الفاظ میں میں نے یہ دعا کی "ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" اے مطمئن روح! اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ راضیہ ہو۔ تو اپنے رب سے راضی ہو اور "مَرْضِيَّة" ہو پس "وجہ ربک" کی جو لازوال زندگی اور لازوال وجود کی خوشخبری ہے وہ ان دو لفظوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

کوئی انسان جو اپنے رب سے راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔ کوئی انسان جس سے خدا راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔ پس اس مضمون کے ساتھ ہی میری توجہات بدل گئیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ آج ہم سے ایک ایسا وجود رخصت ہوا جس کے نتیجے میں ایک خلاء پیدا ہو گیا اور جماعت کو آئندہ یہ خلاء محسوس ہوتا رہے گا میں نے کہا وہ مضمون کیوں نہ میں بیان کروں جو ہمیشگی کا مضمون ہے اور لازوال مضمون ہے۔ پس نیک انجام کے ساتھ میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی اور مجھے خیال آیا کہ درحقیقت لوگ اچھے انجام کی طرف دیکھتے دیکھتے اس سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات آغاز کا خیال ہی نہیں کرتے حالانکہ بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہیں وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔

جیسے چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب..... ان کو جو عظمتیں ملی ہیں وہ بار بار یاد کرایا کرتے تھے دنیا کو کہ میری ماں کی دعائیں تھیں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا' اس کا غیر متزلزل اور محکم یقین خدا کی وحدانیت پر اور غیر اللہ کو رد کرتے چلے جانا یہ وہ خوبیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ان کے لئے ایک نعمت کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ پس میں اپنی پاک

بزرگ ماں کی دعاؤں کا ایک پھل ہوں اور یہ مضمون ان کو انکساری کی طرف لے جاتا تھا کہ کھل کر باتیں کرتے تھے۔ مجھ سے تو بہت بے تکلفی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ بس قصہ وہی ہے سارا' میں کیا' میرا وجود کیا' دعاؤں کا پھل ہوں۔

اور ڈاکٹر صاحب بھی دعاؤں ہی کا پھل تھے۔ ان کے والد بزرگوار چوہدری محمد حسین صاحب اور ان کی والدہ ہاجرہ بیگم غالباً نام تھا ان کا' دونوں ہی بہت مقدس وجود تھے۔ بہت پاکیزہ' صاف ستھرے' خالص پاکیزہ زندگی گزارنے والے اور احمدیت کے بعد تو سونے پر سہاگے کا عالم تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی پیدائش سے پہلے رویا دیکھا کہ ان کو ایک خوبصورت پاک بیٹا عطا کیا جا رہا ہے اور اس کا نام عبدالسلام بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت مصلح موعود کو رویا لکھی اور چونکہ بہت منکسر المزاج تھے اپنی رویا کی بنا پر خود نام نہیں رکھا خواب لکھ کر حضرت مصلح موعود سے پوچھا کہ میں اس بچے کا کیا نام رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا یہ اللہ نے تمہیں بتادیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا یہی نام رکھ لو۔ پس عبدالسلام اس بیٹے کا نام الہی منشاء اور رضا کے مطابق رکھا گیا جو ان کی خاص دعاؤں کا پھل تھا اور ساری زندگی پھر اس نے اس رؤیا کی سچائی کو ظاہر کیا اور اپنے ماں باپ کے خلوص کی قبولیت کو ظاہر کیا۔

تو اس میں ایک اور بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ ایک وجود گزر گیا مگر اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے اے اللہ احمدیت کو اور نوبل لارئیٹ عطا کر مگر "ویبقی ربک ذوالجلال والاکرام" نوبل لارئیٹ کتنے ہیں اور کتنوں کا مقابلہ کرے گی احمدیت' ہزارہا نوبل لارئیٹ ہیں اور بنتے چلے جائیں گے۔ چار اور بھی لے لئے احمدیت نے مانگ مانگ کر تو کتنا فرق پڑے گا۔ لیکن وہ انعام جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کی چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں' اس کے پاؤں کی خاک چومنے میں فخر محسوس کریں تو چھوٹی باتوں پہ ہم کیوں راضی ہوں' چھوٹی دعائیں کیوں مانگیں۔ وہ دعائیں مانگیں جیسی ڈاکٹر عبدالسلام کے باپ نے بیٹے کے لئے کی تھیں اور جن کو خدا نے اس طرح قبول فرمایا کہ اپنی رضا کا مظہر بنایا اور اس بات کا قطعی ثبوت آپ کی زندگی کے لمحہ لمحہ نے دیا ہے۔

سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ تک پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل۔ بلکہ ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے اور بھی سائنس دان اب ماننے لگے ہیں۔ پہلے سے بڑھ گئے ہیں لیکن جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ویسا کوئی اور سائنس دان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا اور پھر خدائے واحد یگانہ کی عظمت کے نتیجے میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں ہمیشہ رہا۔ نظام جماعت کے سامنے خادمانہ حیثیت کی حفاظت کی ہے۔

اب میں ان کی عمر کے لحاظ سے چھوٹا علم کے لحاظ سے تو دنیا کے علم کے لحاظ سے تو حیثیت ہی کوئی نہیں مگر جب مجھ سے گفت و شنید کرتے تھے' ملتے تھے وہ عزت و احترام کے تمام تقاضے جو خلافت سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ان کو اس طرح پورا کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا اور باتوں میں مشورہ کر کے وہ کہتے تھے جو میں کہتا تھا' وہ کرتے تھے جو میں بیان کرتا تھا یا مشورہ نہیں لیں گے' مشورہ لیں گے تو قبول کریں گے اس کو۔ غرضیکہ مجھے ان کی انکساری کو دیکھ کر رشک آتا تھا کہ کتنا بڑا عالم ہے سائنس کے مضامین میں۔ سوچیں میں ان سے بحث کر رہا ہوں۔ یہ نہیں کبھی کہا کہ آپ کو پتہ کچھ نہیں" آپ کو حساب بھی نہیں آتا تو آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہے ہیں مگر انتہائی توجہ سے بات سن کر دلیل سے قائل کرنے کوشش کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ رفتار کے اوپر بحث چلی کہ سائنس کا یہ اور خاص طور پر حساب دانوں کا یہ قطعی نظریہ کہ روشنی کی رفتار سے کوئی چیز آگے نہیں بڑھ سکتی تو میں نے ان سے کہا کہ یہ جو حد لگائی جا رہی ہے یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کے اوپر حد بندی نہیں ہو سکتی' خالق کے اوپر نہیں ہو سکتی۔ حساب کھول دیئے باقاعدہ۔ اپنا حساب دان کھول لیا اور نقشے بنائے اور دائرے بنائے اور بتایا کہ یہ دیکھیں حسابی رو سے ناممکن ہے اور فزکس کے نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ ناممکن ہے۔ میں نے باتیں سمجھیں۔ میں

نے کہا آپ نے جو باتیں کہی ہیں دلیل کے ساتھ ہیں میں دلیل کا انکار نہیں کر سکتا۔ میں ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ یہ ساری باتیں آپ کے کائنات کے تصور سے وابستہ ہیں اور مشروط ہیں جواب تک آپ ظاہر ہوا ہے اور کیا یہ درست نہیں کہ مادہ میڈیم ہے لہروں کے لئے اور اگر مادہ نہ بھی ہو تو کوئی میڈیم ہونا چاہئے اور میڈیم کی صفات ہیں جو رفتار طے کرتی ہیں تو کیا ایتھر کے علاوہ کوئی اور میڈیم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایتھر نہیں ہے تو پھر خود یہ محل نظر ہے کہ چیز حرکت میں کیسے رہتی ہے اور ویو (Wave) کیسے بنتی ہے جب کہ ویو (Wave) مادے کی صفت ہے اور حرکت کی صفت نہیں ہے۔ یہ باریک باتیں تھیں ڈاکٹر صاحب کو تو ایک لمحہ نہیں لگا ان باتوں کو سمجھنے کا۔

مجھے انہوں نے جواب میں کہا کہ آئن سٹائن تو قائل ہے کہ ایتھر ہے اور ایتھر ہی کی صفات ہیں جو جلوہ گر ہیں مگر باقی سائنس دان قائل نہیں ہوئے ابھی' اور ابھی تک قطعی ثبوت کوئی نہیں مل سکا۔ میں نے کہا مل سکتا ہے کہ نہیں؟ کہا کہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا اگر ایتھر کے سوا کوئی اور میڈیم ہو جس کی صفات مختلف ہوں تو رفتار بڑھ سکتی ہے؟ انہوں نے کہا بڑھ سکتی ہے۔ میں نے کہا اب یہ بتائیں کہ اگر کسی چیز کو مادی میڈیم کی ضرورت نہ ہو اور وہ روحانی وجود ہو؟ آپ خدا کی ہستی کے قائل تھے اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے تھے تو اس کو کون سا قانون پابند کرے گا کہ اس کا پیغام روشنی کی رفتار سے ان گنت زیادہ تیزی کے ساتھ جہاں وہ پہنچانا چاہے پہنچا دے تو اس کے بعد وہ نہیں بولے پھر۔ صرف کہا ہاں اصولاً میں مان گیا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے یہ ہو سکتا ہے مگر معلوم دنیا میں اب تک جو ہے وہ یہی ہے اس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

تو اس رنگ میں ان کے اندر یہ حوصلہ تھا اور یہ انکسار تھا کہ بالکل ان پڑھ' سائنس کے ابتدائی علم سے بھی عاری انسان جس کا ماضی سے علم کا ان کے علم میں تھا کیا حیثیت رکھتا تھا کچھ بھی نہیں۔ اس سے اتنے بڑے مضامین کے اوپر بڑے حوصلے کے ساتھ گفتگو کرنا' اسے سمجھانے کی کوشش کرنا اور جب کوئی ایسی دلیل دی جائے جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق تسلیم ہونی چاہئے تسلیم کر لی' کر لیتے تھے تو یہ بھی رفعت کی علامت ہے یعنی انکسار' اور ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں تبھی سجدے کا رفعتوں سے تعلق ہے۔ رفعت (راء کی زیر کے ساتھ) لفظ عربی میں تو ہے مگر اردو میں بعض لوگ رفعت (راء کی زبر کے ساتھ) بھی کہہ دیتے ہیں اس لئے میں رفعت بھی کہہ دیا کرتا ہوں مگر اصل لفظ رفعت ہے۔ تو رفعتیں جو انسان کو عطا ہوتی ہیں ان کا انکساری سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ سجدے میں "ربی الاعلیٰ" کی دعا سکھائی گئی ہے۔ رب سب سے اعلیٰ ہے اور مراد یہ ہے کہ تم نے اس کے حضور جب ماتھا ٹیک دیا ہے جتنا نیچے ہو سکتے تھے ہو گئے ہو اب رب اعلیٰ کو یاد کرو تو تم اس سے فیض پاؤ گے اور رفعتیں حاصل کرنے والا اتنا ہی زیادہ جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں مضمون لازم و ملزوم ہیں۔ سب سے زیادہ انکسار دنیا میں آنحضرت ﷺ نے دکھایا ہے اور سب سے زیادہ رفعتیں آپ کو عطا ہوئی ہیں۔

پس ایک بڑے آدمی کے گزرنے کے ساتھ ان مفاہیم پر گفتگو ہونی چاہئے جو لوگوں کو بڑا بنانے والے ہیں اور سب کے لئے برابر کا پیغام رکھتے ہوں۔ اب علم کیلئے اگر میں کہہ بھی دوں کہ دعا کرو کہ اللہ ہمیں سو نوبل لارئیٹ عطا کر دے تو کیا اس کا آخری نتیجہ نکلے گا؟ کیا وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ جائیں گے جنہیں کسی مکتب میں بیٹھنے کی توفیق نہیں ملی۔ تمام صاحب علم انسانوں سے اور ذی روح' ذی شعور وجودوں سے علم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود آگے بڑھ گیا تو ان رفعتوں کیلئے کیوں نہ دعا مانگی جائے جس میں ہم سب برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ چھوٹا بڑا' غریب ایک تیسری دنیا کا آدمی' ایک ترقی یافتہ مغربی ملک کا باشندہ ان سب کے لئے قدر مشترک ہے کہ اصل علم کا منبع' اصل عزتوں کا منبع جس کا علم اور جس کی عزتیں باقی رہنے والی ہیں وہ اللہ کی ذات ہے اسی کی طرف جھکو' اسی کی طرف دل لگاؤ۔ تم میں سے ہر ایک کو پھر وہ رفعتیں عطا ہو سکتی ہیں کہ جو اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔

تو اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے ان کو بہت بلند مرتبے عطا فرمائے اور ان کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ انکی اولادوں اور نسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ بعض بچے ان کی اولاد میں سے بہت سعید فطرت اور ایسا وجود رکھتے ہیں جن پر توقع سے نظریں پڑتی ہیں۔ ان کی بیٹی عزیزہ ہے۔

حمید الرحمٰن اور عزیزہ کا چھوٹا بیٹا جب بھی میں اس کو دیکھتا ہوں میں ان کو کہتا ہوں کہ اس میں تو مجھے ڈاکٹر سلام نظر آرہا ہے۔ ایک اور ڈاکٹر سلام۔ تو یہ میری مراد ہرگز نہیں کہ وہ صرف نوبل لاریٹ بن جائے گا کسی وقت' میں جب کہا کرتا ہوں تو میں ان کو سمجھا رہا ہوں کہ میری یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ اس میں وہ خوبیاں پیدا کردے جو روحانی رفعتوں کی علم بردار ہوتی ہیں اور روحانی رفعتوں کے مقابل پر دنیا کی رفعتوں کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتیں۔ پھر اس کے صدقے میں نوبل لاریٹ بھی بنے تو کیا کمی' کیا بات ہے سبحان اللہ' نور علی نور یعنی نوبل لاریٹ کے اوپر رضا کی نظر جب پڑے گی تو نور پر نور نازل ہو جائے گا تو یہ دعا اس بچے کیلئے تو میں کرتا ہی ہوں آپ بھی یاد رکھیں اور اپنی اولادوں کیلئے یہ دعا کریں۔ اگر دنیاوی طور پر عظمتیں اور رفعتیں مقدر میں نہیں ہیں تو صرف ایک بات ہم مانگتے ہیں کہ تیری نظران پر ایسی پڑے کہ ان کی پیدائش بھی سلام کی پیدائش ہو اور ان کا وصال بھی سلام کا وصال ہو۔

وہ انعام یافتہ جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کے چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں۔

"سَلَامٌ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا" جو حضرت مسیح کی دعا بچپن کی بتلائی گئی ہے وہ یہ وہ سلام ہے جس کے متعلق میں آپ کو توجہ دلا رہا ہوں۔ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے ہی وہ سلام لکھ دیا تھا جو سلام موت کا سلام بھی بن گیا اور زندگی کا سلام بھی بن گیا۔ پس جب بھی خدا سے عظمتیں طلب کریں تو انکساری کی عظمتیں طلب کریں اور اس سلام کی عظمتیں طلب کریں جو آسمان سے اترتا ہے اور پھر وہ جس شکل میں بھی نازل ہو بہت ہی خوبصورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کسی سے توقع رکھنا اور بات ہے اور اس توقع کا پورا ہونا ایک اور بات ہے۔ یہ دعا بھی ہونی چاہئے کہ ہر منزل کے خطرات سے بچا کر کسی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے عروج تک پہنچائے۔ پس جن بچوں میں نجابت دیکھتا ہوں' اعلیٰ اقدار دیکھتا ہوں ان کی ذہانت ان کے چہرے بشرے سے ٹپکتی ہے ان کے لئے میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ خدا اس کو اس کے آسمانی نقطہ عروج تک پہنچائے۔

اب میں حضرت مصلح موعود کی پیش گوئی میں یہ بہت ہی عارفانہ نکتہ ہے جو بیان ہوا ہے کہ ہر شخص کا ایک آسمانی نقطہ عروج ہے اور وہاں تک وہ بلند ہو سکتا ہے اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا لیکن بھاری اکثریت ہے' اتنی بھاری اکثریت کے شاید اس کو اعدادوشمار میں شمار ہی نہ کیا جاسکے جو اس نقطہ عروج سے نیچے رہ کر مرجاتی ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو اس نقطہ عروج کی طرف حرکت کرنے کی بجائے مختلف سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ اس مضمون کو قرآن کریم کی اس آیت نے کھولا ہے اور میں بارہا سمجھا چکا ہوں "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" ایک بدنصیب کا ذکر قرآن کریم فرماتا ہے اگر اللہ اسے چاہتا تو جو صلاحیتیں ہم نے عطا کی تھیں ان کے نتیجے میں اسے اس نقطہ عروج آسمانی کی طرف بلند کر لیتا جو اس کا منتہی تھا۔ "ولكنه اخلد الى الارض" وہ زمین کی طرف جھک گیا۔

پس آغاز اچھا ہونا ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے اور دعاؤں کی ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے کہ ایسے وجود جن پر تمہاری محبت اور پیار کی شفقت کی نظر ہو جن سے تم توقعات رکھتے ہو کب تک تم ان کی حفاظت کر سکو گے' کب تک ساتھ دو گے' کب تک یہ یقین رکھو گے کہ دنیا کے اثرات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ لیں گے اس لئے یہ دعا بھی لازم ہے کہ اسے نیک انجام تک اللہ پہنچائے اور اس نقطہ نگاہ سے سب سے پیاری دعا جو میری زندگی کی جان ہے جس کے لئے میں کئی دفعہ' بعض دفعہ لوگوں کو رمضان سے پہلے بھی عاجزانہ خط لکھ کر خصوصیت سے متوجہ کرتا ہوں وہ یہ دعا ہے کہ ان میں شامل کردے جن کیلئے آسمان سے یہ آواز اٹھے' ان کا استقبال اس آواز کے ساتھ ہو یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" تو جسے یہ نیک انجام نصیب ہو جائے اس سے بہتر کیا انسان تصور کر سکتا ہے۔

پس اس جانے والی پاک روح کیلئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان

کو ان لوگوں میں شمار فرمائے جن کی وفات کے وقت یہ آواز کان میں سنائی دی ہو۔ جس کی روح سے خدا اس طرح مخاطب ہوا ہو اور ان کی اولاد کو بھی وہ وجہ عظمت عطا کرے جو تعلق باللہ کی وجہ ہے۔ جہاں تعلق باللہ وجہ عظمت بنتا ہے، جہاں رفعتیں سجدے میں مضمر ہیں، جہاں ربی الاعلیٰ کی دعا اس طرح اٹھتی ہے کہ انسان پھر ادنیٰ رہ ہی نہیں سکتا، وہ اعلیٰ سے تعلق جوڑ کر ضرور اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ یہ دعائیں اپنے لئے بھی، اپنی اولادوں کیلئے، سب گزرے ہوئے اور آئندہ لوگوں کیلئے بھی کریں کیونکہ جزا کا وقت تو ابھی باقی ہے یعنی آخری فیصلے تو قیامت کے دن ہونے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کو یہ عظمتیں نصیب فرمائے اور پھر اپنے نشان کے طور پر دنیا کی برکتیں بھی بخشے کیونکہ دنیا کی آنکھ ان باتوں کو دیکھتی نہیں ہے مگر جب خدا کی عظمتیں دنیا کے نشانوں میں ظاہر ہوتی ہیں تب وہ آنکھیں کھلتی ہیں اور ان باتوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

اب میں مختصراً کچھ یہ مضمون جو تھا میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا لمبا مضمون ہے اس کے جو پہلو میرے ذہن میں تھے وہ پورے تو میں بیان نہیں کر سکا مگر امید ہے مرکزی نکتہ احباب جماعت کو سمجھ آگیا ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے احوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جو صاحب رویاء و کشوف بزرگ تھے ان کا نکاح بھی حضرت مصلح موعود نے پڑھایا تھا۔ ان کی والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ یہ حکیم فضل الرحمٰن صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ حکیم فضل الرحمٰن صاحب وہ مبلغ ہیں جو تیئس سال تک اپنی جوانی میں اپنی بیوی سے الگ رہے اور اف تک نہیں کی کبھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں زندگی گزاری۔ نہایت پاکباز اور بہت ہی با اخلاق اور جاذب نظر شخصیت تھی۔ یہ ہمارے امریکہ کے ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ (سہو ہے۔ حکیم فضل الرحمن صاحب ڈاکٹر حمید الرحمن صاحب کی والدہ کے خالو تھے) ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ماموں اور ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ ثریا بیگم جن کا وصال ابھی ہوا ہے جن کی نماز جنازہ پڑھائی تھی ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر حمید الرحمان کی والدہ تھیں۔ تو یہ خاندان آپس میں اس طرح بڑے قریبی تعلق میں بندھا ہوا ہے اور بہت پاک روایتیں ہیں جو اس خون میں جاری ہیں۔ پس دعا کریں کہ یہ آئندہ بھی ہمیشہ جاری رہیں۔

بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہی وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔ وہ مجھے جو یاد تھا کہ رویا میں دیکھا تھا وہ رویا نہیں بلکہ کشفی طور پر آپ کو یہ دکھایا گیا تھا یہ نوٹس ہیں ان میں لکھا ہے۔

"تین جون ۱۹۲۵ء کو خدا نے کشفی طور پر دکھلایا کہ ایک فرشتہ ظاہر ہوا جس کے ہاتھوں میں ایک معصوم بچہ تھا۔ فرشتہ نے وہ بچہ چوہدری محمد حسین صاحب کو پکڑا دیا اور کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹا عطا فرمایا ہے۔ آپ نے اس بچے کا نام پوچھا تو آواز آئی عبدالسلام"

یہ رویا انہوں نے جب لکھ کر حضرت مصلح موعود کو بھجوائی اور نام کی درخواست کی تو آپ نے لکھا۔

"جب خدا تعالیٰ نے خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں"

یعنی یہ بات حضرت مصلح موعود کا لکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی رویا اور کشوف کی سچائی پر آپ کو کامل یقین تھا اور ویسے بھی انکسار کا پھر یہی تقاضا ہے جب کہہ دے خدا نے نام رکھ دیا ہے مگر محض اس وجہ سے نہیں مجھے یقین ہے کہ چونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ ایک صاحب کشف انسان ہیں اس لئے یہی لکھنا اس وقت یا صرف یہی لکھنا جائز تھا کہ جب خدا نے نام رکھ دیا تو ہم کیسے دخل دیں۔

چنانچہ پھر یہ بڑھے ہیں تو اللہ کے فضل سے دعاؤں کے ساتھ، اب یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ باقی بھی تو بہن بھائی ہیں ان کا تعلیمی کردار، بڑے ذہین ہیں، ہوشیار بھی ہیں، اچھے اچھے مرتبے حاصل کئے، کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ ایسا ہے جیسے کوئی چیز شوٹ (Shoot) کر کے ایسا اوپر نکل جاتی ہے کہ باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اس کے مقابل پر کوئی نسبت نہیں ہے۔ ہر میدان میں ایسے ایسے انہوں نے میڈل بچپن سے حاصل کرنے شروع کئے ہیں، ریکارڈ پر ریکارڈ توڑتے چلے گئے ہیں اور بعض ایسے ریکارڈ جو پھر اور ہو ہی نہیں سکتے۔ جب سو فیصدی نمبر لے لو گے تو ریکارڈ کیسے ٹوٹے گا۔ اور پھر جب پاکستان میں ناقدری کی گئی تو انگلستان کی حکومت کی فراخدلی ہے یا قدر شناسی کہنا چاہئے، فراخ دلی کا سوال نہیں، انہوں

نے بڑی عزت کا سلوک کیا امپیریل کالج کی پروفیسر شپ کی سیٹ عطا کی اور مسلسل ان کے ساتھ بہت ہی عزت اور احترام کا سلوک جاری رکھا ہے۔

پھر اٹلی نے آپ کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے جو ایک تحریک کی کہ میرے نزدیک وہاں ٹریسٹ میں ایک سنٹر بنانا چاہئے سائنس کے فروغ کا تو حکومت اٹلی نے بڑا حصہ خرچ کا ادا کیا پھر دوسرے اداروں نے بھی اس میں حصہ لیا اور خاص طور پر غریب ممالک کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں دے کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کو نقطہ عروج تک پہنچانا یہ آپ کا مقصد تھا اور اس میں قطعاً مذہبی تعصب کا اشارہ تک بھی نہیں تھا۔ غیر احمدی پاکستانی، غیر پاکستانی، پولینڈ کے لڑکے، عیسائی، دہریہ سب پر یہ فیض برابر تھا جو رحمانیت کا فیض ہے اور اللہ کے فضل سے اس کے ساتھ بنی نوع انسان کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔

اب تعلیمی ڈگریاں اور میڈل بیان کرنے کا وقت نہیں ہے میں نے جو چیزیں اہمیت کی سمجھیں وہ بیان کر دیں۔ اب یہ ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ، دنیاوی علوم میں بھی، روحانی علوم میں بھی ترقی کرنے والا ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جدا ہوا۔ اللہ کے حوالے، اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں اور ان کو سنبھال لیں اور اس کے علاوہ ان کی اولاد کیلئے بھی یہی دعا کریں کہ خدا ان سے ہمیشہ حسن سلوک رکھے، شفقت اور رحمت کا سلوک رکھے اور ان دعاؤں کو آگے بھی ان کے خون میں ان کی نسلوں میں جاری کردے جو ان کے حق میں قبول ہوئیں۔"

(الفضل انٹرنیشنل ۱۰ تا ۱۶ جنوری ۱۹۹۷ء)

ڈاکٹر عبدالسلام

بالیقیں تھے ڈاکٹر عبدالسلام
برگزیدہ عابدِ ربّ الانام

رحمتِ باری ہو ان کی قبر پر
جنت الماوٰی میں ہو ان کا مقام

نام پاکستان کا روشن کیا
چرخ شہرت کے تھے وہ ماہِ تمام

نوبل انعام ان کا حق تھا جو ملا
ان کی عظمت کو میسر ہے دوام

منفرد سائنس داں تھے ان سے بھی
آبرو سائنس کی ہے لا کلام

خوبیوں کا ان کی ہے احصا محال
ہے نہایت ہی بلند ان کا مقام

نامِ نامی ان کا لب پر آئیگا
اہل علم و فن کے باصد احترام

ان کا اب نعم البدل کوئی نہیں
بے بدل بیشک رہیں گے وہ مدام

خاک میں ربوہ کی آسودہ ہیں آج
"قدسی عنصر ڈاکٹر عبدالسلام"

۱۴۱۷ھ

راغب مراد آبادی

(بشکریہ ہفت روزہ لاہور ۱۲ اپریل ۱۹۹۷ء صفحہ ۹)
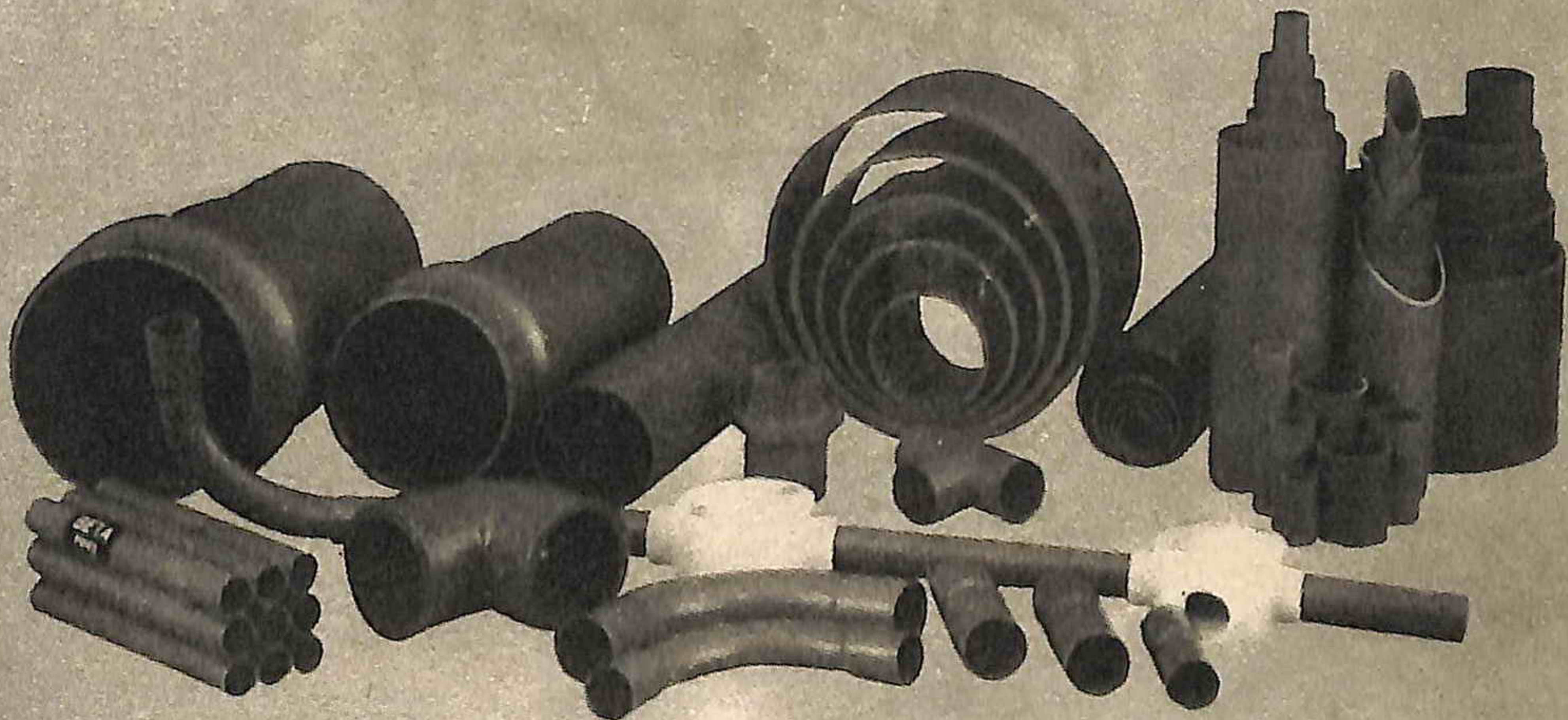
پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے عالمی اعزازات کی تفصیل

"ڈاکٹر آف سائنس" کی اعزازی ڈگریاں

پنجاب یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)	۱۹۵۷ء
ایڈنبرا یونیورسٹی۔ برطانیہ	۱۹۷۱ء
ٹریسٹ یونیورسٹی۔ اٹلی	۱۹۷۹ء
اسلام آباد یونیورسٹی۔ پاکستان	۱۹۷۹ء
نیشنل ڈی انجینئرا یونیورسٹی۔ پیرو	۱۹۸۰ء
سان مارکس یونیورسٹی۔ پیرو	۱۹۸۰ء
نیشنل یونیورسٹی آف سان انطونیو آباد۔ پیرو	۱۹۸۰ء
سائمن بولیور یونیورسٹی۔ وینزویلا	۱۹۸۰ء
روکو لو یونیورسٹی۔ پولینڈ	۱۹۸۰ء
یرموک یونیورسٹی۔ اردن	۱۹۸۰ء
استنبول یونیورسٹی۔ ترکی	۱۹۸۰ء
گورونانک یونیورسٹی امرتسر (بھارت)	۱۹۸۱ء
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (بھارت)	۱۹۸۱ء
نہرو یونیورسٹی بنارس (بھارت)	۱۹۸۱ء
چٹاگانگ یونیورسٹی۔ بنگلہ دیش	۱۹۸۱ء
برسٹل یونیورسٹی۔ برطانیہ	۱۹۸۱ء
عبدو گوری یونیورسٹی۔ نائیجیریا	۱۹۸۱ء

فلپائن یونیورسٹی کوئزون سٹی۔ فلپائن	۱۹۸۲ء
خرطوم یونیورسٹی۔ سوڈان	۱۹۸۳ء
میڈرڈ یونیورسٹی۔ سپین	۱۹۸۳ء
سٹی یونیورسٹی۔ سپین	۱۹۸۳ء
سٹی یونیورسٹی آف نیویارک۔ امریکہ	۱۹۸۴ء
نیروبی یونیورسٹی۔ کینیا	۱۹۸۴ء
کیتھولک نیشنل یونیورسٹی کیویو۔ ارجنٹائن	۱۹۸۵ء
نیشنل ڈی لاٹا یونیورسٹی۔ ارجنٹائن	۱۹۸۵ء
کیمبرج یونیورسٹی۔ برطانیہ	۱۹۸۵ء
گیٹنبرگ یونیورسٹی۔ سویڈن	۱۹۸۵ء
سوفیا کلائی منیٹ اورڈسکی یونیورسٹی۔ بلغاریہ	۱۹۸۶ء
گلاسگو یونیورسٹی۔ سکاٹ لینڈ	۱۹۸۶ء
یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی۔ چین	۱۹۸۶ء
سٹی یونیورسٹی۔ لنڈن (یو۔کے)	۱۹۸۶ء
پنجاب یونیورسٹی۔ چنڈی گڑھ (انڈیا)	۱۹۸۷ء
میڈیسینا آلٹرنیٹو۔ کولمبو (سری لنکا)	۱۹۸۷ء
نیشنل یونیورسٹی آف بینن۔ کوٹونو (بینن)	۱۹۸۷ء
ایکسٹر یونیورسٹی۔ یو۔کے	۱۹۸۷ء
پیکنگ یونیورسٹی۔ چین	۱۹۸۷ء
گینٹ یونیورسٹی۔ بلجیئم	۱۹۸۸ء

ایوارڈز

ستارہ پاکستان	۱۹۵۹ء
تمغہ وایوارڈ حسن کارکردگی	۱۹۵۹ء
نشانِ امتیاز	۱۹۷۹ء

ہاپکن پرائز کیمبرج یونیورسٹی ۱۹۸۵ء

نشانِ اندرس بیلو وینزویلا ۱۹۸۰ء

نشانِ استقلال۔ اردن ۱۹۸۰ء

نشانِ میرٹ۔ اٹلی ۱۹۸۰ء

آنرری نائٹ کمانڈر ایوارڈ آف برٹش ایمپائر ۱۹۸۹ء

اعزازات

ایڈمنز پرائز کیمبرج یونیورسٹی ۱۹۵۸ء

پہلا میکسویل میڈل اور ایوارڈ (فزیکل سوسائٹی لنڈن) ۱۹۶۴ء

ہیوز میڈل رائل سوسائٹی لنڈن ۱۹۶۴ء

ایٹم برائے امن کا میڈل اور ایوارڈ ۱۹۶۸ء

جے رابرٹ اوپن ہائمر میموریل میڈل اور پرائز میامی یونیورسٹی۔ امریکہ ۱۹۷۱ء

گوتھرائی میڈل اور پرائز انسٹی ٹیوٹ آف فزکس۔ لنڈن ۱۹۷۶ء

سردیوپرشاد سرداھیکاری گولڈ میڈل۔ کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۷۷ء

تیوسی میڈل اکیڈمی نیشنل۔ روم ۱۹۷۸ء

جان ٹورنس ٹانٹے میڈل امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس ۱۹۷۸ء

رائل میڈل، رائل سوسائٹی لنڈن ۱۹۷۸ء

نوبیل انعام برائے طبعیات۔ نوبیل فاؤنڈیشن ۱۹۷۹ء

آئن سٹائن میڈل یونیسکو۔ پیرس ۱۹۷۹ء

شری آر ڈی برلا ایوارڈ۔ انڈین فزکس ایسوسی ایشن ۱۹۷۹ء

جوزف سٹیفن میڈل جوزف سٹیفن انسٹی ٹیوٹ ۱۹۸۰ء

گولڈ میڈل برائے حسنِ کارکردگی طبعیات اکیڈمی آف سائنس چیکوسلواکیہ ۱۹۸۱ء

امن میڈل چارلس یونیورسٹی پیراگ ۱۹۸۱ء

گولڈ میڈل یو ایس ایس آر اکیڈمی آف سائنس ۱۹۸۲ء

پاکستان میں تقرریاں

رکن اٹیمی انرجی کمیشن	۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۴ء
مشیر تعلیمی کمیشن	۱۹۵۹ء
رکن سائینٹفک کمیشن	۱۹۵۹ء
مشیر اعلیٰ سائنس صدر مملکت	۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۴ء
صدر انجمن ترقیٔ سائنس پاکستان	۱۹۶۱ء - ۱۹۶۲ء
صدر سپارکو	۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۴ء
پاکستان کی جانب سے بین الاقوامی اٹیمی انرجی ایجنسی کے گورنر	۱۹۶۲ء - ۱۹۶۳ء
رکن نیشنل سائنس کونسل پاکستان	۱۹۶۳ء - ۱۹۷۵ء
رکن مجلس انتظامیہ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن	۱۹۷۳ء - ۱۹۷۷ء

تقرریاں

پروفیسر گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ہیڈ آف میتھامیٹکس ڈیپارٹمنٹ	۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء
منتخب فیلو سینٹ جان کالج کیمبرج	۱۹۵۱ء - ۱۹۵۶ء
رکن انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈی۔ پرسٹن	۱۹۵۱ء
لیکچرار کیمبرج یونیورسٹی ۔ کیمبرج	۱۹۵۴ء - ۱۹۵۶ء
پروفیسر نظری طبعیات لندن یونیورسٹی۔ امپیریل کالج	۱۹۵۷ء تا ۱۹۹۳ء
بانی ڈائریکٹر بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبعیات۔ اٹلی	۱۹۶۴ء تا وفات
منتخب آنرری لائف فیلو سینٹ جان کالج۔ کیمبرج	۱۹۷۱ء

اقوام متحدہ کے عہدے

سائینٹفک سیکرٹری جنیوا کانفرنس (جوہری توانائی کے پُرامن استعمال کے لئے جتنی بھی کانفرنسیں ہوئیں)	۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء
رکن مجلس مشاورت سائنس و ٹیکنالوجی ۔ اقوام متحدہ	۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۵ء

رکن مجلس قائمہ برائے اقوام متحدہ یونیورسٹی — ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء

چیئرمین مجلس مشاورت سائنس و ٹیکنالوجی۔ اقوام متحدہ — ۱۹۷۱ء - ۱۹۷۲ء

رکن مجلس مشاورت اقوام متحدہ یونیورسٹی — ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۳ء

رکن کونسل امن یونیورسٹی — ۱۹۸۱ء

چیئرمین یونیسکو مجلس مشاورت برائے سائنس و معاشرہ — ۱۹۸۱ء

رکن سائنٹیفک کونسل و بین الاقوامی امن تحقیقی ادارہ — ۱۹۷۰ء

نائب صدر انٹرنیشنل یونین برائے خالص و اطلاقی طبعیات — ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۸ء

اکیڈمیاں اور سوسائٹیاں

منتخب فیلو پاکستان اکیڈمی آف سائنس۔ اسلام آباد — ۱۹۵۴ء

رائل سوسائٹی لنڈن کے پہلے پاکستانی منتخب فیلو — ۱۹۵۹ء

منتخب فیلو رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنس سٹاک ہوم — ۱۹۷۰ء

منتخب رکن امریکن اکیڈمی برائے آرٹس و سائنسز۔ بوسٹن — ۱۹۷۱ء

منتخب رکن یو۔ ایس۔ ایس۔ آر اکیڈمی آف سائنس۔ ماسکو — ۱۹۷۱ء

منتخب اعزازی فیلو سینٹ، جان کالج کیمبرج — ۱۹۷۱ء

منتخب رکن یو۔ ایس۔ اے نیشنل اکیڈمی آف سائنس۔ واشنگٹن — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن اکیڈمی نیشنل۔ روم — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن اکیڈمی تبرینا، روم — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن عراقی اکیڈمی۔ بغداد — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ برائے بنیادی تحقیق۔ بمبئی — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن کورین فزکس سوسائٹی سیئول جنوبی کوریا — ۱۹۷۹ء

منتخب رکن اکیڈمی مراکش، رباط — ۱۹۸۰ء

منتخب رکن اکیڈمی نیشنل برائے سائنس، روم — ۱۹۸۰ء

منتخب رکن یوروپی اکیڈمی برائے سائنس وفنون، پیرس — ۱۹۸۰ء

منتخب رکن جوزف سٹیفن انسٹی ٹیوٹ — ۱۹۸۰ء

منتخب رکن انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۸۰ء
منتخب رکن بنگلہ دیش اکیڈمی برائے سائنس۔ ڈھاکہ ۱۹۸۰ء
منتخب رکن سائنس اکیڈمی ویٹی کن سٹی ۱۹۸۰ء
منتخب رکن سائنس اکیڈمی لزبن۔ پرتگال ۱۹۸۱ء
بانی ڈاکٹر ورلڈ اکیڈمی آف سائنس ۱۹۸۳ء
منتخب رکن یوگوسلاویہ اکیڈمی آف سائنس زغرب ۱۹۸۳ء
منتخب رکن گھانا اکیڈمی آف سائنس وفنون ۱۹۸۴ء
منتخب رکن پولش اکیڈمی آف سائنس ۱۹۸۵ء
منتخب رکن پاکستان اکیڈمی آف میڈیکل سائنس ۱۹۸۷ء
منتخب رکن انڈیا اکیڈمی آف سائنس۔ بنگلور ۱۹۸۸ء
منتخب رکن ڈسٹنگوش انٹرنیشنل آف سگماچی ۱۹۸۸ء
منتخب رکن برازیلین مینتھامیٹیکل سوسائٹی ۱۹۸۹ء
منتخب رکن نیشنل اکیڈمی آف اکزکٹ۔ فزکس اینڈ قدرتی سائنس (ارجنٹینا) ۱۹۸۹ء
منتخب رکن ہنگیرین اکیڈمی آف سائنس ۱۹۹۰ء
منتخب رکن اکیڈمی یوروپیا ۱۹۹۰ء

اہم ترین اعزاز ـــــ اور سعادت

یہ فہرست "نامکمل" رہے گی اگر ڈاکٹر صاحب کے ایک اور اعزاز کا تذکرہ نہ کیا جائے اور وہ یہ کہ آپ حضرت خلیفۃ المسیح کی منظوری سے ۱۹۶۶ء سے لے کر وفات تک مجلسِ افتاء کے اعزازی ممبر رہے۔

عظمتوں کا مینار

مشہور چار دانگ تیرا انکسار ہے

(خصوصی تحریر مکرم نصیر احمد صاحب انجم مدیر اعلیٰ تشحیذ الاذہان)

زمین پر حضرت انسان کا وجود لاکھوں سال سے ہے اور فی زمانہ بھی چھ ارب کے لگ بھگ انسان اس عالم رنگ و بو میں بستے ہیں کل بنی نوع انسان میں سے انبیاء علیہم السلام کا گروہ سرخیل کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔ ان کے افضل مقام میں سے کسی کو کلام نہیں ہے۔ باقی انسانوں کے انبوہ کثیر میں سے لاکھوں انسان دنیا سے بے شناخت گذر جاتے ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جو عمریں کھپانے کے باوجود بے نیل مرام رہتے ہیں پھر کتنے ہیں جو حوادث زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہت ہیں جو جنگ و جدال کے مہیب خطرات میں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ نیرنگی کائنات ہمیں کئی رنگ دکھاتی ہے۔ اور معدودے چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے میدان عمل میں کامرانیوں کی انتہاء کو چھو لیتے ہیں۔ یہی لوگ نابغۂ روزگار کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

قارئین محترم! ایسے ہی ایک عبقری ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہیں جو پاکستان ایسے پسماندہ ملک کے پسماندہ ضلع میں پیدا ہوئے مگر کامیابی کے زینے کے بعد زینے طے کرتے چلے گئے تمام ناموافق حالات اور نامساعد کیفیات بھی آپ کو علو مرتبت کے حصول سے باز نہ رکھ سکیں۔ آپ اہل علم و دانش میں ایک بلند مینار بن کر ابھرے۔ ایک ایسا منیار جس کی طرف دیکھنے کیلئے لوگوں کو اپنی ٹوپیاں اور پگڑیاں سنبھالنی پڑتی تھیں۔ عالم طبیعات کا یہ شہنشاہ اس صدی کے کئی دہاکوں تک ماہرین فن کی آنکھوں کو خیرہ کرتا رہا۔ آپ کی عظمتوں کو ارباب دانش کدوں نے برملا تسلیم کیا۔ اور مغرب و مشرق کے ایوانوں میں آپ کی قابلیت کے گن گائے گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے فزکس کی دنیا میں وہ کام کر دکھایا جو آئن سٹائن کے بس سے بھی باہر تھا۔

۱۹۷۹ء میں جس تھیوری پر آپ کو نوبیل انعام ملا وہ ہر جہت سے قابل ذکر ہے۔ لیکن میرا وجدان اس سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا ایک انوکھا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ آپ خدا کے فضل سے دین حق کے پیروکار اور مخلص احمدی تھے۔ آپ کا نظریہ دراصل یہ تھا کہ کائنات میں کارفرما قوت ایک ہی ہے۔ جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ آپ کی تھیوری سے قبل سائنس یہاں تک پہنچی تھی کہ بنیادی طور پر کارفرما قوتیں چار ہیں۔ آپ نے یہ عظیم کام کر دکھایا کہ یہ چار نہیں بلکہ تین قوتیں ہیں۔ یوں توحید کی طرف سفر پر آپ رواں دواں تھے۔

محترم ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ میں قارئین کو اپنے ایک تاثر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ نوبل پرائز پانے کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے از راہ شفقت ملاقات کی سعادت بخشی۔ مصافحہ اور معانقہ ہوا۔ میں نے وہ تصویر دیکھی ہے۔ مصافحہ کرتے ہوئے سائنس کا یہ بطل جلیل اپنے روحانی امام کے سامنے جس طرح عاجزی و انکساری کا مرقع بنا ہوا ہے۔ تصویر سے یہ تاثر نمایاں ہو کر ابھرتا ہے کہ آپ کو خلافت سے کیسا مخلصانہ انس فدایانہ بلکہ عاشقانہ تعلق تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب کی عظمت کردار کا یہ قابل تقلید انداز تھا۔ آپ اپنے زمانہ عروج میں جب دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اپنے آبائی شہر جھنگ تشریف لے گئے۔ جہاں سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اس سکول نے آپ کو دعوت پر بلایا۔ سکول میں آپ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے لوگ اُمڈ آئے تھے۔ اس جم غفیر میں آپ کے پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی نظر

جونہی ان پر پڑی آپ مہمان خصوصی کی کرسی سے اٹھے اور اپنے استاد محترم سے جا کر ملے اور انہیں اپنے قریب بٹھایا۔ کیونکہ یہی وہ شخص تھا جس نے یہ چھتنار درخت اس وقت سینچا تھا جب یہ نازک پودا اپنی کونپلیں نکال رہا تھا۔

قارئین کرام! اس مادی دور میں جب کہ تھوڑی سی دولت نظریں پھیر دیا کرتی ہے اور ذرا سا عہدہ ملنے سے غرور آجایا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنے تمام تر مراتب کے باوجود بوڑھے استاد سے حسن سلوک آپ کی عظمتوں کا ایک اور باب وا کرتا ہے۔

قارئین! آپ سے ایک آخری بات یہ بھی کہنا ہے کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ ہم جانے والے کی عظمت کا اقرار تو کرتے ہیں مگر ہم محض پدرم سلطان بود کہہ کر ماضی کے جھروکے سے جھانکتے نہیں رہتے بلکہ ہم سلطان است جیسے محاورے ایجاد کرنے والے اور مستقبل پر کمندیں ڈالنے والے لوگ ہیں۔

إِذَا سَيِّدٌ مِنَّا خَلَا، قَامَ سَيِّدٌ
قَؤُولٌ لِمَا قَالَ الْكِرَامُ فَعُوْلُ

کہ جب بھی ہمارے اندر سے کوئی سردار دنیا سے اٹھتا ہے تو اس کے قول و فعل کے امین بہت سے معزز سردار اس کی جگہ لینے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ احمدی سائنسدانوں کو ڈاکٹر صاحب کا مشن آگے بڑھانے کی توفیق بخشے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر عبدالسلام

اللہ پہ یقین سے بھرپور اک وجود
حبِّ رسولؐ سے رہا پُر نور اک وجود
رہتا تھا عشق دل میں مسیحا کا موجزن
اک شان سے تھا عجز کی راہوں پہ گامزن
سائنس کو اس نے دین سے ایسے ملا دیا
گل کو اٹھا کے دھول سے کیسے سجا دیا
سائنس کو حق نے بخشا تھا عالم وہ بے بدل
قرآں سے پیش کرتا تھا ہر مسئلے کا حل

طبیعات ان کے علم کا میدان خاص تھا
فضل خدا سے نوبل انعام ان کے پاس تھا
اٹکا تھا اس کا دل سدا جس پاک خاک میں
آرام کر رہا ہے وہ اس ارض پاک میں
اپنی دعا خدا سے ہے ہر روز صبح و شام
اس قوم میں ہوں پیدا بہت ڈاکٹر سلام

(عطاء القدوس طاہر حیدر آباد)

چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے

اک حسین تھی شخصیت حرارتیں لیے ہوئے
عظیم تر تھی زندگی سعادتیں لیے ہوئے
ڈاکٹر عبدالسلام ایک ایسا نام ہے
حرف حرف جس کا تھا بشارتیں لیے ہوئے
اس کی محنتوں کا ثمر بحر و بر پہ چھا گیا
صف بہ صف عالم رہا رقابتیں لئے ہوئے
دین و دنیا میں ترقی اس نے پائی بے شمار
بڑھتا رہا قدم قدم عبادتیں لئے ہوئے
اور جب مانا گیا وہ فرد اعظم ایک دن
زمانہ سنگ سنگ تھا صداقتیں لئے ہوئے
دل میں چھپا کے یار سے ملنے کی اک گہری تڑپ
چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے
تھا ذرہ ذرہ مضطرب جب آخری دیدار تھا
لمحات وہ بھی کٹ گئے قیامتیں لیے ہوئے
اے خدا کر اور پیدا ایسے بابرکت وجود
جن کا قول و فعل ہو امانتیں لیے ہوئے
دل نے چاہا جب ربانی چند لفظوں کو لیے
آ گئے اس بزم میں جسارتیں لیے ہوئے

(بشریٰ ربانی ایم اے لاہور)

سعادت

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب (موجودہ امام ہمام عالمگیر جماعتِ احمدیہ)، ڈاکٹر محمد عبدالسلام صاحب،
اور حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب "رفیق" حضرت مسیح موعود علیہ السلام

"بیت" النور فرینکفرٹ (جرمنی) کی سلور جوبلی کے موقعہ پر

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب جرمنی تشریف لے گئے اور وہاں اس تقریب سے خطاب
فرمایا

54 Physics World January 1997

people

Abdus Salam 1926–96

Tom Kibble and Chris Isham

Abdus Salam was one of the leading theoretical physicists of his generation. He won a share of the 1979 Nobel Prize for Physics for developing the electroweak theory – the unified theory of weak and electromagnetic interactions that now forms part of the standard model of particle physics. He was also a tireless campaigner for the cause of science in the Third World. He founded and became the first director of the International Centre for Theoretical Physics (ICTP) in Trieste, Italy, and was the first president of the Third World Academy of Sciences.

Salam was born in 1926 in Jhang, a small town in the Punjab, the son of a minor educational official. At 14 he won a scholarship to Government College in Lahore, with the highest marks ever recorded. He was just 17 when his first paper was published, on the solution of a set of simultaneous nonlinear algebraic equations previously discussed by the Indian mathematical genius Srinivasa Ramanujan.

Salam made an equally strong impression as a student at the University of Cambridge, gaining a double first in physics and mathematics. After briefly trying experimental research in the Cavendish Laboratory and finding it not to his liking, he asked Nicholas Kemmer to suggest a theoretical problem. Kemmer directed him to another student, Paul Matthews, who was then just finishing his PhD, saying that he might have some problems left over.

The great excitement at this time was the development of renormalization theory – a way of circumventing the infinities that had plagued quantum electrodynamics (QED) since its inception. The main work in this area was being done by Julian Schwinger, Sin-itiro Tomonaga, Richard Feynman and Freeman Dyson. Matthews had been using Dyson's methods to extend renormalization theory to the meson theories that were then thought to describe the strong nuclear forces. He suggested that Salam should try to fill in a gap in Dyson's proof of renormalizability – the treatment of "overlapping divergences" – and was astonished when Salam returned within days with a complete solution. Salam became Matthews' student and spent a year with him in the Institute for Advanced Study at Princeton in the US. Thus began their close and lasting friendship and collaboration.

Salam's first paper on renormalization theory made a considerable impact and established him as a world-class physicist. In 1951 he returned to Pakistan as professor of mathematics at both Punjab University and Government College, hoping to continue his research while contributing to the development of his country. However, he found little support or encouragement, and after three years he decided to return to Cambridge as a lecturer and fellow of St John's College.

In 1957 Salam became professor of theoretical physics at Imperial College, London – a post that he held until his retirement in 1993 – at the invitation of Patrick Blackett, then head of physics at the college. Salam asked that Matthews should come with him as a reader. Over the next few years they built up one of the finest theoretical physics groups in the world.

World leader in theoretical physics – Abdus Salam

One of the principal themes of research in the Imperial College group was finding the patterns of symmetry of particle interactions. Indeed, the SU(3) symmetry of strong interactions, christened the "eightfold way" by Murray Gell-Mann, was developed independently by Yuval Ne'eman, who was one of Salam's students. Salam's main interest, however, was in unification, particularly using gauge theories.

The first gauge theory beyond QED was proposed as a theory of strong interactions, by Yang and Mills, in 1954. Salam tried to find a similar description of the weak interactions with his collaborator John Ward. This work culminated in 1967 in the discovery of the electroweak theory. This theory made some specific predictions, notably the existence of the W and Z particles and of "neutral currents". These were all triumphantly confirmed, mainly at CERN, the European laboratory for particle physics. For this discovery Salam shared the 1979 Nobel Prize for Physics with Sheldon Glashow and Steven Weinberg, both of Harvard University in the US. Meanwhile he continued his work, looking for higher symmetries and further unification.

Salam regretted having to leave Pakistan to pursue his research, and determined to do what he could to help others avoid this problem. He conceived the idea of an international centre of excellence, to which theoretical physicists from Third World countries could come for regular visits, providing contact with international research. As Pakistani delegate to the International Atomic Energy Agency, he managed to get them to support the idea, and persuaded the Italian government to provide most of the funds on the understanding that the centre would be located in Trieste.

The ICTP came into being in 1964, with Salam as its director. Covering a variety of topics in theoretical physics, the ICTP has provided a lifeline for many physicists from the Third World who come on a regular basis, and return to work in their own countries. Salam collaborated with many scientists over the years – in particular, with a succession of young researchers who spent periods of time at the ICTP.

Working directly with Salam was quite an experience, and not everyone who took up the challenge survived the pressure for long. Salam thought nothing of working for 15 hours a day and he took it for granted that his young collaborators would be similarly dedicated. Thus it was not unusual to be woken at around five in the morning – Salam was a notorious early riser – with a lengthy phone call in which he would reveal his latest ideas for the piece of work in progress. These would usually involve many lengthy equations that he would dictate at speed using his own personal shorthand for the superscripts, subscripts and other such mathematical niceties with which the equations were invariably adorned.

Collaborating with Salam was, however, far from being just a matter of hard grind. He had a charismatic personality and generated great loyalty from those who worked with him closely, whether they were fellow scientists or the secretaries at the ICTP charged with keeping his affairs in some degree of order. Salam was a complex man and people who encountered him in a variety of circumstances experienced him in different ways. His young collaborators invariably thought of him with respect and affection, and there is a fund of "Salam stories" waiting to be told that speak of his good humour and warm personality.

From 1958 onwards, Salam acted as scientific adviser to the president of Pakistan, Ayub Khan. He played an important role in international affairs, for example as member and chairman of the United Nations Advisory Committee on Science and Technology.

However, after the fall of Ayub Khan, Salam's relations with the Pakistani government became increasingly strained. They reached breaking point in 1974, when Zulfikar Ali Bhutto – the father of the recently deposed prime minister – declared the Ahmadiyya sect, to which Salam belonged, non-Muslim. (The Ahmadiyya are regarded by many orthodox Muslims as heretical because of their belief that their 19th-century founder, Mirza Ghulam Ahmad, was the Mahdi, the true successor of Mohammed.) For this reason, Salam has been less honoured in his native country than one might have expected.

Salam had always believed that the key to progress for Third World countries was to concentrate on the development of the science and technology infrastructure. He urged the Islamic world in particular to return science to prominence. His articles on this theme are real *cris de coeur*. Another of his initiatives was the founding of the Third World Academy of Sciences, of which he became the first president.

Salam won innumerable honours including an honorary KBE, and membership of both the Soviet and the US academies of science. He became the youngest fellow of the Royal Society at the age of 33 and was later awarded its top honour, the Copley medal. He was also an honorary fellow of the Institute of Physics.

However, in the mid-1980s he developed a degenerative neurological disorder, which gradually made life more difficult. He bore it with astonishing stoicism, and continued to work both on new ideas in theoretical physics and for Third World development. He died peacefully at his home in Oxford in the early hours of 21 November.

Tom Kibble and Chris Isham are professors of theoretical physics at Imperial College of Science Technology and Medicine, London

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے برگزیدہ آباؤ اجداد

(مضمون نگار مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب)

احمدیت کے اس مایہ ناز سپوت اور دنیا کے عظیم سائنس دان کے حالات زندگی، کارنامے، افکار و نصائح اخبار الفضل اور دیگر ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آج اس عظیم سائنس دان کے آباؤ اجداد کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے اپنی سوانح میں لکھا ہے:۔

"میرے اب امجد ایک ہندو راجپوت خاندان کے شاہزادے تھے۔ نہایت پاک سیرت ہونے کی وجہ سے حق شناسی کا مادہ ان میں بہت تھا۔ حضرت غوث بہاء الحق ذکریا علیہ الرحمہ جب اعلائے کلمہ اللہ کیلئے ہندوستان تشریف لائے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ حضرت ممدوح کی تبلیغ نے ان کے دل کی تہ تک اثر کیا۔ آخر انہوں نے دین حق کو قبول کرلیا۔ ان کا نام بڈھن (یہ ہندوانہ نام تھا اور دعائیہ نام تھا کہ لمبی عمر پانے والا) سے سعد بڈھن رکھا گیا۔ پھر کیا تھا۔ تخت کو چھوڑا اپنے آقا سے سچی لو لگائی اور باقی عمر ساتھ نہیں چھوڑا۔ درد دل سے دعائیں کرنا ان کا کام تھا اور یہ ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ ان کی اولاد ہمیشہ قرآن مجید کی خادم رہی اور دنیاوی حیثیت میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔"

دادا

آپ کے دادا کا نام میاں گل محمد تھا۔ جو کہ پیشہ کے لحاظ سے طبیب تھے۔ نہایت ہی عالم باعمل انسان تھے۔ اگرچہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت نہیں کی تھی لیکن آپ کے مصدق تھے۔

دادی

آپ کی دادی بہت نیک خاتون تھیں۔ تہجد باقاعدگی سے ادا کرتیں۔ اپنے تینوں بچوں کے نام لے لے کر دعائیں کرتیں۔ نماز کی ادائیگی کیلئے سخت تاکید کرتیں۔

تایا

آپ کے تایا جو آپ کے خسر بھی بنے ان کا نام چوہدری غلام حسین تھا۔ ۲۱ جنوری ۱۸۷۴ کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ مڈل کا امتحان مڈل سکول جھنگ سے دیا اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ سے پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوم آئے۔ وظیفہ لیکر مشن کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔ ڈیرہ غازیخان، کرنال، فیروز والا، لدھیانہ میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۳۲ء میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محلہ دار الفضل قادیان میں اپنا مکان تعمیر کرایا جہاں تقسیم ملک تک قیام پذیر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں سکونت اختیار کی جہاں اپنی وفات جو ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو واقع ہوئی تک مقیم رہے۔

وہ مولوی محمد حسین بٹالوی کے زبردست معتقد تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی حضرت بانی جماعت احمدیہ کی مخالفت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

انہی دنوں منشی الٰہی بخش اکونٹنٹ اور ان کے ساتھ جو مولوی محمد حسین بٹالوی کے معتقدین میں سے تھے کے اکسانے پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "عصائے موسیٰ" رکھا گیا۔ اس کتاب سے حضرت بانی جماعت احمدیہ کو بہت تکلیف پہنچی جس کا آپ نے اپنی کتاب "اعجاز احمدی" جو ۱۵ نومبر ۱۹۰۲ء کو شائع کی تھی۔ تحریر فرمایا:۔

"کیا محمد حسین کا دل ہدایت پر آجائے گا یہ کون گمان کر سکتا ہے عجیب بات ہے اور خدا کے نزدیک سہل اور آسان ہے تین آدمی اس کے ساتھ اور ہیں ایک ان میں سے الٰہی بخش اکونٹنٹ ملتانی ہے بس سن اور سنا دے۔ تیری قسم کہ ہم نے بغیر گناہ کے ان کے نیزوں کا مزا چکھا۔ پس ہمیں یہی اچھا معلوم ہوا کہ ان کے حق میں دعا کرتے ہیں۔"

کچھ عرصہ بعد الٰہی بخش اکونٹنٹ اور ایک ساتھی طاعون سے ہلاک ہو گیا اور چوہدری غلام حسین صاحب کو سخت قسم کا ہیضہ ہو گیا۔ جس کے بعد آپ کا دل احمدیت کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت بانی جماعت احمدیہ کی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ خدا کے حضور دعائیں مانگیں جس کے نتیجہ میں ایک خواب دیکھا اور بالآخر احمدیت قبول کر لی مگر انہیں افسوس اس بات کا رہا کہ یہ سعادت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی زندگی میں حاصل نہ ہوئی۔ جب ابتداء میں احمدیت کے مخالف تھے تو نہایت زور اور شدت کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ جب خدا تعالیٰ کی توفیق سے احمدیت کو اختیار کیا تو پھر نہایت پر جوش اور مخلص احمدی ثابت ہوئے۔ بڑی دلیری کے ساتھ دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دیتے گویا انہیں اس کا جنون تھا اور وہ اس سے کسی حالت میں بھی باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اسی مقدس مشغلے میں بسر کی۔ شان و شوکت، رعب داب اور فخرو مباہات کی زندگی سے ہمیشہ الگ رہے۔ نہایت ہی سادہ وضع، سادہ حالت اور سادہ پوشش رکھتے۔ نیکی و پاکبازی کی ایسی حیرت انگیز قوت رکھتے تھے کہ پاس بیٹھنے والوں پر اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ نام و نمود اور دکھاوے سے ہمیشہ متنفر رہے۔

شاید ہی کوئی احمدی ہو گا جس نے اپنے متعلق جماعت احمدیہ کے تمام خلفاء کی قبولیت دعا کا نشان نہ دیکھا ہو اور بار بار نہ دیکھا ہو۔

اخبار الفضل مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء (جوبلی نمبر) میں حضرت چوہدری صاحب نے "ہر آڑے وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کی طرف رجوع" کے موضوع کے تحت لکھتے ہوئے تحریر کیا۔

"گو خوف و ہراس میرے دل پر کبھی مستولی نہیں ہوا۔ مگر میری زندگی تکالیف اور صدمات سے پر گذری ہے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جو تشویش سے خالی ہو۔ لیکن میں نے ہر آڑے وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف رجوع کیا اور جتنا جلدی ہو سکا دعا کے لئے لکھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنے اس محبوب کی ایسی خاطر منظور ہے کہ لفافہ لیٹر بکس میں گیا اور ادھر مشکل حل ہونی شروع ہو گئی اور اگر حل نہ ہوئی تو اس نے کوئی ایسا رنگ اختیار کر لیا جو خوبی میں پہلے سے بھی بڑھ کر نکلا۔ جب سے یہ نسخہ میرے ہاتھ آیا ہے میں نے کئی دوستوں کو بتایا اور انہوں نے خواہ وہ غیر از جماعت بلکہ غیر مسلم بھی تھے اس سے فائدہ اٹھایا اور حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں بطور شکریہ نذرانے بھیجے خوش اعتقادی میں ایک حقیقت ہے جو واقعات پر مبنی ہے۔ میں مشاہدات کی بناء پر جو ایک نہیں بلکہ کئی ہیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اکثر حالات جو ابھی سربستہ راز ہوتے ہیں حضرت امام پر کھولے جاتے ہیں۔ ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ میں نے پچیس روپے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی نذر کرنے چاہے مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سندھ تشریف لے گئے ہیں۔ میں بیمار اور صاحب فراش۔ میں نے وہ روپے الگ کر کے بطور امانت رکھ دیا تاکہ اور روپے کے ساتھ خرچ نہ ہو جائے۔ اچانک محاسب صاحب کی استفساری چھٹی پہنچی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے سندھ سے بذریعہ فون دریافت فرمایا ہے کہ آیا میں نے کوئی روپیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی امانت فنڈ میں جمع کرایا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یہ نذر اس مالک حقیقی کے حضور قبول ہو گئی"

آپ نہایت صاحب فراست بااخلاق، متقی، بردبار، ذکی الطبع، غربا کے ہمدرد، یتیم پرور، بیواؤں کے خبر گیران، امیر ہو کر فقیر منش، فرمانبردار بیٹے، مہربان بھائی اور شفیق باپ تھے غرض آپ کا وجود احمدیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ آپ صاحب کشف بزرگ تھے۔ حضرت رسول مقبول ﷺ کی خواب میں کئی بار زیارت ہوئی تھی۔

کشف القبور کے متعلق کئی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے شیخ سعدی کو کشف میں دیکھا اور باتیں کیں آپ کے اعمال اور افعال قرآن اور حدیث کے مطابق تھے۔ سلسلہ کی ہر تحریک میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ چنانچہ تحریک جدید دفتر اول میں ان کا آخر تک حصہ رہا اور دفتر اول کے انیس سال مکمل کئے۔ آپ موصی تھے۔ جھنگ شہر میں اپنے آبائی قبرستان میں امانتاً تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں۔ سب سے بڑی بیٹی نے تینتیس برس اور سب سے چھوٹے بیٹے نے ۱۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر آپ نے صبر کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

نانا

آپ کا نام حضرت حافظ نبی بخش صاحب تھا۔ آپ موضع فیض اللہ چک جو قادیان سے قریباً ۵۔۴ میل کے فاصلے پر تھا کے رہنے والے تھے۔ آپ ان معدودے چند خوش قسمت احباب میں سے تھے جنہیں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی طرف سے ان کے دعویٰ سے طویل عرصہ قبل بار بار حاضر ہونے اور فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ آپ سے بے تکلفانہ حسن سلوک فرماتے تھے۔ آپ کو ان ایام میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے سونے کے کمرہ یعنی بیت الفکر میں اس ارادہ سے سونے کا موقع ملتا تا تہجد کیلئے بیدار ہو سکیں۔ آپ کم عمر نوجوان ہی تھے کہ معدودے چند اشخاص کی طرح آپ کو بھی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ ایک شخص کیلئے دعائیں کرنے اور خواب آئے تو بتانے کیلئے فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ ابھی آپ بالکل کم عمر تھے اس وقت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا آپ کو دعا کیلئے کہنا گویا حضرت بانی سلسلہ کی خداداد فراست کے مطابق آپ کی فطری رشد اور جبلی سعادت پر دلالت کرتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کی امامت میں حضرت بانی سلسلہ نے نماز پڑھی تھی۔ اپنے گاؤں میں آپ بیعت کرنے والے تیسرے اور ضلع گورداسپور میں تینتسویں فرد تھے۔ آپ نے ۱۰ مارچ ۱۸۹۰ء کو بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہونے کا شرف پایا۔ رجسٹر بیعت میں اس تاریخ میں آپ کا اندراج یوں ہے۔ آپ کا نمبر ۱۸۱ (ایک سو اکاسی) ہے۔ "شیخ نبی بخش ولد شیخ کریم بخش ساکن فیض اللہ چک ضلع گورداسپور پیشہ ملازمت"

یہ ایک عظیم سعادت تھی جو آپ کو نصیب ہوئی سچ ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی پیدائش غالباً ۱۸۶۷ء میں ہوئی چودہ پندرہ برس کی عمر میں یعنی ۸۲۔۱۸۸۱ء میں حضرت بانی سلسلہ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا کیں۔ بڑے بیٹے شیخ عبدالرحمٰن کی نو عمری میں وفات پر آپ نے رضا بالقضا کا بہترین نمونہ دکھانے کی وجہ سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی خاص دعائیں لینے کا موقعہ پایا۔ آپ کے دوسرے بیٹے حکیم فضل الرحمان صاحب کو ربع صدی تک گولڈ کوسٹ (غانا) سالٹ پانڈ اور لیگوس (نائیجیریا) میں بطور مربی انچارج خدمت کرنے کی توفیق ملی۔ جہاں وہ ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ تشریف لے گئے۔ آپ کے تیسرے بیٹے ملک حبیب الرحمان تھے جو سرگودھا سے بطور ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ریٹائر ہوئے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ان کا وقف منظور فرماتے ہوئے تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کا مینجر مقرر فرمایا۔ بعد میں آپ نے بطور ہیڈ ماسٹر خدمات سرانجام دیں۔ محلہ دار البرکات کے صدر بھی رہے۔

حضرت حافظ نبی بخش صاحب نے اپنے فرزند ارجمند حکیم فضل الرحمٰن صاحب کے کہنے پر اپنے کچھ حالات تحریر فرمائے جو درج ذیل ہیں۔

اپنے حالات لکھنے کے بعد آخر میں آپ نے تحریر فرمایا

"بالآخر میں عزیز لخت جگر مبلغ افریقہ کو تحریر کرتا ہوں کہ میری یہ تحریر بحفاظت رکھے اور آئندہ میری نسل اس سے فائدہ اٹھائے اللہ کی توفیق سے۔

"چند باتیں میں اپنے حالات گزشتہ کی درج ذیل کرتا ہوں۔ تمہید کے طور پر یہ حروف بھی تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے والد صاحب حضرت حکیم کریم بخش صاحب موضع فیض اللہ چک تحصیل و ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ ملازمت محکمہ انہار میں گزرا۔ جو پہلے پہل متفرق جگہوں میں مقیم رہے۔ آخرش ان کی تبدیلی امرتسر میں ہوئی۔ اس وقت ان کی جائے

قیام خاص امرتسر ہو گئی۔ اس وقت شہر میں مولوی ابو عبید اللہ غلام علی صاحب قصوری، قصور سے ہجرت کر کے امرتسر میں مقیم ہو گئے تھے اور انہوں نے قصور سے اس لئے ہجرت کی تھی کہ ان کا مذہب اہلحدیث یا موحد تھا۔ قبر پرستی اور پیر پرستی وغیرہ سے ان کو بہت تنفر تھا اور باشندگان قصور اکثر قبر پرست اور پیر پرست تھے۔ اس لئے ان کا ان کے عقائد میں سخت اختلاف ہو گیا۔ حضرت والد صاحب مولوی صاحب کے پاس آنے جانے لگے اور ان کی صحبت سے عقائد سابقہ میں تبدیلی ہونے لگی۔ یہاں تک تبدیلی ہو گئی کہ باشندگان فیض اللہ چک ان کو وہابی کے لفظ سے پکارنے لگے۔ میں بھی اپنے والد صاحب کے پاس رہتا تھا اور حافظ محمد بخش کڑہ سفید (کڑھیگیاں) میں مولوی صاحب موصوف کی مسجد میں مقیم تھے۔ ان سے قرآن کریم پڑھتا اور حفظ کیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب موصوف خود درس قرآن کریم دیتے تھے جس میں شامل ہو کر قرآن شریف پڑھتا تھا۔

مولوی غلام علی کی صحبت سے متاثر ہو کر رشوت ستانی سے بیزار ہو کر حضرت والد صاحب نے ملازمت چھوڑ دی اور ایک شخص نامی شیخ بڈھا صاحب جو امرتسر میں چمڑے کی آڑھت کرتے تھے ان کے ہاں بہی کھاتہ لکھنے کی ملازمت اختیار کر لی اور محض حصول رضائے خدا اور روزی حلال کمانے کی خاطر ایک اچھی آمدنی کی جگہ چھوڑ کر معمولی سے گذارہ والی جگہ اختیار کر لی۔ میں قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد فیض اللہ چک میں آ کر منڈی کرال میں جو کہ فیض اللہ چک سے قریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے پرائمری سکول میں داخل ہو گیا۔

یہ چند حروف اس لئے لکھے ہیں کہ بتلایا جائے کہ میں اپنے والد صاحب کے پاس رہنے اور مولوی غلام علی صاحب کی صحبت میں رہنے اور ان سے قرآن شریف پڑھنے کے باعث بچپن میں ہی شرک و بدعت سے ایسا بیزار اور متنفر ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ایسی بات یا حرکت کرتا جس میں شرک و بدعت کی بو محسوس کرتا تو میں اسے سننا یا دیکھنا پسند نہ کرتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے شرک و بدعت کی جڑ میرے دل سے بچپن میں ہی اکھاڑ دی تھی۔ ان ایام میں میرے تایا صاحب قادر بخش صاحب تحصیل بٹالہ میں ملازم تھے اور وہ قادیان میں سرکاری کاموں کے واسطے اکثر جایا کرتے تھے اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے ملتے تھے۔ کھانا بھی حضور ہی اندر سے ان کے واسطے لاتے تھے۔ جب کبھی تایا صاحب فیض اللہ چک جاتے تو حضور کا ذکر نہایت اخلاص اور محبت سے کرتے تھے۔ اور بڑی شد و مد سے حضور کے اخلاق حسنہ کا ذکر کرتے۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں حضور کی زیارت کا شوق بلکہ حضور کیلئے ایک عشق پیدا ہو گیا اور دل چاہنے لگا کہ اڑ کر بھی حضور کی زیارت کروں۔ حتی کہ میں قادیان پہنچا اور حضور سے ملا اور ایک رات قادیان ٹھہر کر واپس فیض اللہ چک چلا گیا اس کے بعد دل میں ایک تڑپ سی رہنے لگی اور جب تک حضور کی زیارت نہ کر لیتا چین نہ آتا۔ حضرت حافظ حامد علی صاحب خادم حضور پر نور میرے قادیان جانے سے پہلے حضور کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے میں ان کے ذریعہ حاضر حضور ہوا تھا۔ حافظ صاحب موضع غلام نبی کے رہنے والے تھے اور میرے رشتہ داروں میں سے تھے۔ پہلی دفعہ کی حاضری کے بعد میری آمد و رفت کا راستہ کھل گیا کیونکہ میں نے حضور کے اخلاق حمیدہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر پائے جو ہمارے تایا جان بتلاتے تھے۔ حتی کہ میں یہ یقین کرنے لگا کہ حضور مجھ سے کسی پر زیادہ شفقت نہیں کرتے۔ پھر میں اور حافظ نور محمد صاحب جو فیض اللہ چک کے ہی رہنے والے تھے مل کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہاں ٹھہرتے۔ بیت مبارک کی شمال کی طرف جو چوبارہ ہے جس کا نام بیت الفکر ہے اس کے مشرقی دروازہ کے سامنے ایک تخت پوش چوبی رکھا ہوا تھا۔ اس پر میں اور جو کوئی مہمان بھی ہوتا بیٹھ کر کھانا کھاتے اور حضرت اقدس کھانا اندر سے اپنے دست مبارک سے لا کر ہم مہمانوں کے آگے رکھتے اور خود بھی شامل ہو جاتے۔ ایک چھوٹی چائے دانی بیت الفکر میں موجود رہتی اور قہوہ تیار رہتا اور پاس ہی مصری پڑی رہتی میں دن میں جتنی دفعہ چاہتا قہوہ پی لیتا۔ حضور فرماتے اور پیئو اور پیئو۔ ایک چھوٹی چارپائی بھی بیت الفکر میں موجود رہتی جب کبھی میں سردی کے موسم میں اکیلا حاضر ہوتا تو اسی بیت الفکر میں تخت چوبی شمالی دیوار کے پاس بچھا ہوتا۔ میں خود ہی عرض کر دیتا کہ حضور میں اسی پر سوؤں گا۔ اور اس میں میری غرض یہ ہوتی تھی کہ میں دیکھوں کہ حضور رات کو کس وقت جاگ کر نماز میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس بیت الفکر میں (اس تخت پوش کی پائنتی کی طرف ایک چارپائی ہوتی جس پر حضور رات کو اور صبح کی نماز کے بعد استراحت فرماتے تھے۔ (حافظ حامد علی بھی وہاں ہوتے تھے) جب کبھی

میری آنکھ کھلتی تو میں حضور کو اسی تخت پوش کے ایک طرف نماز میں مشغول پاتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ حضور میرے پاس ہی نماز گزارتے اور مجھے کبھی نہ جگاتے اور نہ ہی یہ فرماتے کہ ایک طرف ہو جاؤ۔

ایک دفعہ میں قادیان میں حاضر ہوا تو مجھے وہاں تین چار دن ٹھہرنا پڑا۔ میرے پاس ایک گائے ہوتی تھی میں اس کے لئے صرف ایک دو دن کا چارہ جمع کر کے چھوڑ آیا تھا۔ چار دن کے بعد جب میں نے واپس جانے کی اجازت چاہی اور ساتھ ہی گائے کا ذکر کیا تا اس کی وجہ سے مجھے اجازت مل جائے تو اس وقت حضور نے حافظ نور محمد صاحب کو جو پاس ہی موجود تھے تبسم کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی گائے بھی بنی اسرائیل کی گائے کی طرح ہی ہوئی۔ حضور کی عادت میں داخل تھا کہ چھوٹا ہو یا بڑا "تو" کے لفظ سے کسی کو نہ بلاتے بلکہ "آپ" کا لفظ استعمال فرماتے۔ حالانکہ میں چھوٹا بچہ تھا لیکن مجھے بھی کبھی "تو" نہ کہتے۔

حضور نماز عشاء سے فارغ ہو کر جب سونے کے لئے بیت الفکر میں تشریف لے آتے تو بعض دفعہ میرا اپنا دل ریوڑیاں کھانے کو چاہتا تو میں خود ہی اونچی آواز سے کہہ دیتا کہ حضور حافظ نور محمد صاحب ریوڑیاں کھائیں گے۔ حافظ صاحب وہاں موجود ہوتے مگر بیچارے کچھ نہ بولتے۔ حضور میری عرضی سنتے ہی حافظ حامد علی صاحب کو آواز دیتے اور فرماتے کہ میاں حامد علی بازار سے ریوڑیاں لاؤ مگر کڑاکے دار لانا۔ حافظ صاحب فوراً تعمیل ارشاد کرتے اور ریوڑیاں لے آتے۔ حضرت اقدس اپنے دست مبارک سے نہایت خندہ پیشانی سے ہمیں ریوڑیاں دیتے اور خود بھی کھاتے تھے۔"

یہ سب واقعات حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دعویٰ سے پہلے کے ہیں۔ اسی طرح کے اور کئی واقعات اور روایات انہوں نے تحریر فرمائی تھیں۔ بیعت کرنے کے بعد کا ایک واقعہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ میں کمزوری نظر کی شکایت لیکر حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی خدمت میں علاج دریافت کرنے کیلئے حاضر ہوا۔ تو حضرت خلیفۃ المسیح الاول نے فرمایا۔ شاید موتیا اترے گا۔ میں بہت ہی پریشان اور مضطرب حال ہوا اور ان کے رقعہ پر اور ڈاکٹروں (جناب ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب اور ڈاکٹر محمد حسین صاحب) سے بھی آنکھوں کا معائنہ کرایا۔ سب نے ہی کہا کہ پانی اترے گا۔ جس پر میں اور پریشان ہوا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام حال زبانی عرض کیا۔ حال عرض کرنے سے پہلے چونکہ میں دیر کے بعد آیا تھا۔ حضور نے فرمایا آپ دیر سے آئے ہیں۔ میں نے کہا حضرت میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ حضور نے فرمایا ٹھہرو اور اسی وقت الحمدللہ پڑھ کر آنکھوں پر پھونک دی اور دست مبارک پھیر کر فرمایا کہ میں دعا کروں گا۔ اس کے بعد نہ وہ موتیا اترا اور نہ وہ کم نظری ہی رہی۔"

آپ کی شادی محترمہ عظیم بی بی صاحبہ دختر چوہدری غلام غوث صاحب سے ہوئی۔ وہ اعلیٰ پایہ کی موحد اور شرک سے پرہیز کرنے والی تھیں اور نہایت ہی نیک، صابرہ بااخلاق اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ وہ تمام اقارب سے محبت اور رواداری سے پیش آتیں۔ حضرت حافظ نبی بخش صاحب کی ملازمت گو معمولی یعنی پٹواری کی حیثیت سے تھی لیکن آپ کا قیام جہاں بھی رہا آپ اپنے اخلاق حسنہ، رعب اور شخصیت کے باعث مسلم کیا اور غیر مسلم کیا تمام ہی آپ کو بزرگ اور باپ جیسا شفیق و بہی خواہ سمجھتے تھے اور اپنے ذاتی خاندانی و دیگر تنازعات آپ سے فیصلہ کراتے۔ افسر بھی آپ سے احترام سے پیش آتے اور اکثر امور میں آپ کا مشورہ قبول کرتے۔ آپ رسومات و تکلفات سے بالا تھے۔ آپ مذہب کے معاملہ میں بڑے باغیرت تھے۔ آپ کے حلقہ احباب اور افسران میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ آپ کی موجودگی میں احمدیت یا بزرگان سلسلہ کے متعلق ناروا رنگ میں لب کشائی کریں۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے دارالفضل قادیان میں مستقل سکونت کرلی۔ دارالفضل کے سیکرٹری تعلیم و تربیت تھے۔ آپ کو ذیابیطس کا مرض مدت سے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی حتیٰ کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ آخر طویل علالت کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو آپ نے وفات پائی۔ آپ بہشتی مقبرہ قادیان میں مدفون ہیں۔

والد ماجد

مکرم ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار کا نام حضرت چوہدری محمد

حسین صاحب تھا۔ وہ ۲ ستمبر ۱۸۹۱ء کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ شہر میں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لیا۔

قبول احمدیت

اپنے کالج کی بلڈنگ کے اوپر ایک ڈارمیٹری میں رہتے تھے۔ ایک روز ایک شخص میاں پیر بخش پٹرنگ سکنہ بھاٹی دروازہ لاہور ان کے پاس آیا اور کہا کہ اس نے مرزائیوں کے خلاف ایک انجمن بنائی ہے جس کا نام تائید اسلام رکھا ہے اور ان سے اس انجمن کا ممبر بن جانے کیلئے کہا جس کا ماہوار چندہ چار آنے تھے۔ آپ نے پیر بخش صاحب سے کہا کہ اگر وہ شخص (مراد حضرت بانی سلسلہ احمدیہ) سچا ہو تو ہم کدھر جائیں گے؟ پیر بخش نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ اس انجمن کے ممبر نہ بنے بلکہ پیر بخش سے کہا کہ فیصلہ خداوند کریم سے دریافت کریں۔ آپ نے دلیل دی کہ ریلوے اسٹیشن لاہور کا راستہ اگر کسی نابکار شخص سے بھی دریافت کریں تو وہ بھی غلط نہ بتائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رحیم و کریم خدا سے سیدھا راستہ طلب کریں اور نہ بتائے چنانچہ اس دن سے آپ نے "ہمیں سیدھا رستہ دکھا" کا ورد اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے شروع کر دیا اور چالیس روز تک کیا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ جھنگ شہر میں ہمارے پرانے مکان میں ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ عمو یم حاجی اللہ داد خاں انسپکٹر پولیس سامنے کھڑے ہیں اور مجھے بتاتے ہیں کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی آپ تلاش میں تھے۔ میں نے ان بزرگ کی معیت میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ گھمیانہ کی طرف چل پڑے جس راستہ سے وہ گئے وہ ہونے والی بیت احمدیہ جھنگ سے گزرتا ہوا چوک کو جاتا تھا۔ ساتھ ہی اشارہ :" یہ قادیان والے تھے" پھر آپ خود بیان فرماتے ہیں:-

"اس کے بعد میں موقع پا کر قادیان گیا۔ سہ پہر کے وقت پہنچا مجھے بتایا گیا کہ مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاول اپنے مطب میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کے مکان کے اندر گیا قریباً تین آدمی ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ مجھے آخری جگہ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ تھوڑی دیر بعد خلیفۃ المسیح الاول تشریف لائے آپ کو حضرت مفتی محمد صادق صاحب اور مرزا خدا بخش صاحب نے سہارا دیا ہوا تھا۔ آپ نے سیدھے میرے طرف آنے کی تکلیف کی اور مجھ سے ایسے طریق سے پوچھا جیسے وہ مجھے پہلے جانتے تھے اور کہا کہ کیا آپ آگئے ہیں۔ میں نے بھی پہچان لیا آپ نے پوچھا کہ کیا بیعت کرنا چاہتے ہیں؟ میں چپ ہو گیا۔ آخر آپ نے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھو اور میں جو کہے جاؤں تم بھی کہتے جاؤ جس وقت کوئی لفظ طبیعت کے موافق نہ ہو ہاتھ اٹھا لینا۔ میں نے دل میں کہا کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے چنانچہ سب حاضرین میرے ساتھ الفاظ دہرانے میں شامل ہوئے اور میری بیعت ختم ہوئی۔ میں نے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جلدی ملنا۔ (اٹھارہ روز بعد آپ وفات پا گئے۔) حضرت مفتی محمد صادق صاحب میرے ساتھ امرتسر تک تشریف لائے اور مجھے راستہ میں سمجھاتے رہے۔ دوسرے روز لاہور میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ پڑی۔ چونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ میں سچ ہی بولتا رہا آخر مخالفین نے احمدیت پر میرے ایمان کو مضبوط کر دیا۔

زمانہ قیام لاہور میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے از راہ شفقت انہیں سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل لاہور کا عہدہ عطا فرمایا۔ ہوسٹل کے ساکنین میں اکثر وہ لوگ تھے جو بعد میں سلسلہ احمدیہ کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ چند ایک کے نام درج ہیں۔ حضرت ملک غلام فرید صاحب، مکرم مرزا عبدالحق صاحب، حضرت شیخ احمد دین صاحب، حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر، حضرت حضرت صوفی غلام محمد صاحب اور دیگر بہت سارے احباب

لاہور میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ جھنگ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کی شادی سعیدہ بیگم دختر چوہدری خدا بخش صاحب سے ہوئی جن کے بطن سے پہلی لڑکی مسعودہ بیگم پیدا ہوئیں۔ لڑکی کی پیدائش کے فوراً بعد آپ کی بیوی وفات پا گئیں۔ ۱۲ مئی ۱۹۲۵ء کو آپ کی دوسری شادی ہاجرہ بیگم بنت حضرت حافظ نبی بخش صاحب جو حضرت بانی سلسلہ عالیہ کے اولین رفقاء میں سے تھے کے ساتھ ہوئی۔ ان کے بطن سے سات فرزند اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ جن میں سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سب سے بڑے ہیں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں بطور انگلش ماسٹر ملازمت کی۔ بعد میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز جھنگ کے

دفتر میں ملازمت اختیار کی۔ ۲ جنوری ۱۹۴۱ء کو انہیں انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن کے دفتر میں بطور ڈویژنل ہیڈ کلرک تعینات کیا گیا۔ جہاں سے آپ ۱۹۵۱ء میں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت نہایت ہی دیانت داری، فرض شناسی، محبت اور لگن سے کام کیا۔ اپنے افسران بالا اور ماتحت عملہ سے خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو تعریفی سند دی گئی۔

ریٹائرمنٹ سے قبل سرکاری ملازمین کی کارکردگی کے بارے میں ان کی سالانہ رپورٹ میں لکھا گیا Excellence Work and sterlino character اپنی سوانح میں ایک جگہ آپ نے لکھا کہ "میں نے ایک حدیث پڑھی کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے فرمایا جو شخص تیرا نام نامی سنے اور درود شریف نہ پڑھے اس کا ناک خاک آلودہ ہو۔ چونکہ میرے نام کا پہلا حصہ حضور کے نام نامی سے شروع ہوتا ہے میرے دل میں ڈر آگیا کہ مجھ پر بھی دستخط کرتے وقت ہمیشہ درود شریف پڑھنا فرض ہے۔ مجھے منصبی طور پر دن میں بے شمار بار دستخط کرنے پڑتے تھے۔ میں نے ہر بار درود شریف پڑھنا اپنے لئے لازمی قرار دے دیا۔ چنانچہ ہندو سکھ مسلمان حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا پڑھتا رہتا ہے۔"

قیام ملتان کے دوران آپ کو جماعت احمدیہ کی بطور سیکرٹری تعلیم و تربیت، صدر اور امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع ملتان جس میں ملتان، وہاڑی، کبیر والا، خانیوال، میلسی، شجاع آباد، لودھراں کی تحصیلیں تھیں خدمت کرنے کی توفیق ملی۔ مرکز سلسلہ سے دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں جو بھی علماء و بزرگ ملتان کا دورہ کرتے ان کا قیام آپ کے ہاں ہی ہوتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں سے اپریل ۱۹۵۹ء میں آپ لندن تشریف لے گئے اور اپنے فرزند محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ لندن میں اپنے قیام کے دوران آپ نے بے شمار تربیتی لیکچر دیئے خاص طور پر نوجوانوں کی تربیت کیلئے بہت کوشاں رہتے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے مجھے جرمنی میں لکھا تھا تحریر فرمایا۔

"میں آپ کے والد صاحب محترم کو تحریک کرتا رہتا ہوں کہ لندن کے نوجوان پاکستانیوں کی تربیت کا کام سنبھالیں۔ اب قریباً دو سو احمدی نوجوان وہاں پہنچ چکا ہے۔ انہیں اگر منظم کیا جائے تو بڑی طاقت ہے"

پھر کئی دفعہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے اپنے خطوط میں لکھا کہ "میں آپ کی ہمت پر رشک کرتا ہوں اور اس بات پر بھی رشک کرتا ہوں کہ کس طرح پیرانہ سالی میں آپ جماعت کی خدمت بجالا رہے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "اپنی اولاد کی عزت کرو" پر ہمیشہ عمل پیرا ہوتے۔ اپنے بچوں کو کبھی تم یا تو کے الفاظ سے مخاطب نہ ہوتے بلکہ ہمیشہ تسیں یا آپ کے الفاظ سے مخاطب ہوتے۔

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کی کامل اتباع اور خلافت احمدیہ کے ساتھ دلی وابستگی کے طفیل آپ کو جو غیر معمولی قبولیت اور نصرت عطا ہوئی اس کا ایک زندہ اور درخشندہ و تابندہ ثبوت اس عاجزانہ دعا کا قبول ہو کر منصہ شہود پر آنا ہے جو آپ نے شادی کے بعد ایام جوانی میں مانگی اور خدا نے متواتر رویا و کشوف کے ذریعے آپ کو اس کی قبولیت کی بشارتیں عطا فرمائیں۔

حضرت چوہدری صاحب نے بعد میں آنے کے باوجود بتائید و توفیق الٰہی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں اس قدر تعہد اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا کہ حسب وعدہ الٰہی آپ کے قلب صافی سے بھی محبت الٰہی اور ہمدردی بندگان خدا کا پاک چشمہ پھوٹا اور ایسے ہی دوسرے ہزارہا قلوب سے پھوٹنے والے چشموں کے ساتھ مل کر اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر دریا کی صورت میں بہتا ہوا نظر آیا۔ آپ کا وجود ان چراغوں میں سے ایک چراغ کی مانند تھا جنہیں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اور آپ کے عالی مرتبہ خلفاء کرام سے اکتساب نور کی بدولت اونچی جگہ پر رکھا گیا۔ جو مشرق و مغرب میں اپنی روشنی پھیلاتے رہے۔ آپ کا دل محبت الٰہی میں گداز تھا۔ قرآن مجید، آنحضرت ﷺ اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے والہانہ عشق آپ کی خاص صفت تھی۔ خلافت کے ساتھ دلی وابستگی نظام سلسلہ کے احترام اور بندگان خدا پر شفقت کرنے میں آپ تعہد سے کام لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ عشق الٰہی، عشق کلام پاک، عشق رسول ﷺ، عشق بانی سلسلہ احمدیہ، خلافت کے ساتھ دلی وابستگی، نظام سلسلہ کے احترام اور شفقت علی خلق اللہ کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے میں آپ

احمدیت کے درختِ وجود کی ایک سرسبز شاخ جس کو ڈاکٹر عبدالسلام جیسا ثمرِ شیریں لگا

حضرت چوہدری محمد حسین صاحب ـــــ والد بزرگوار ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ـــ زندگی کے مختلف ادوار
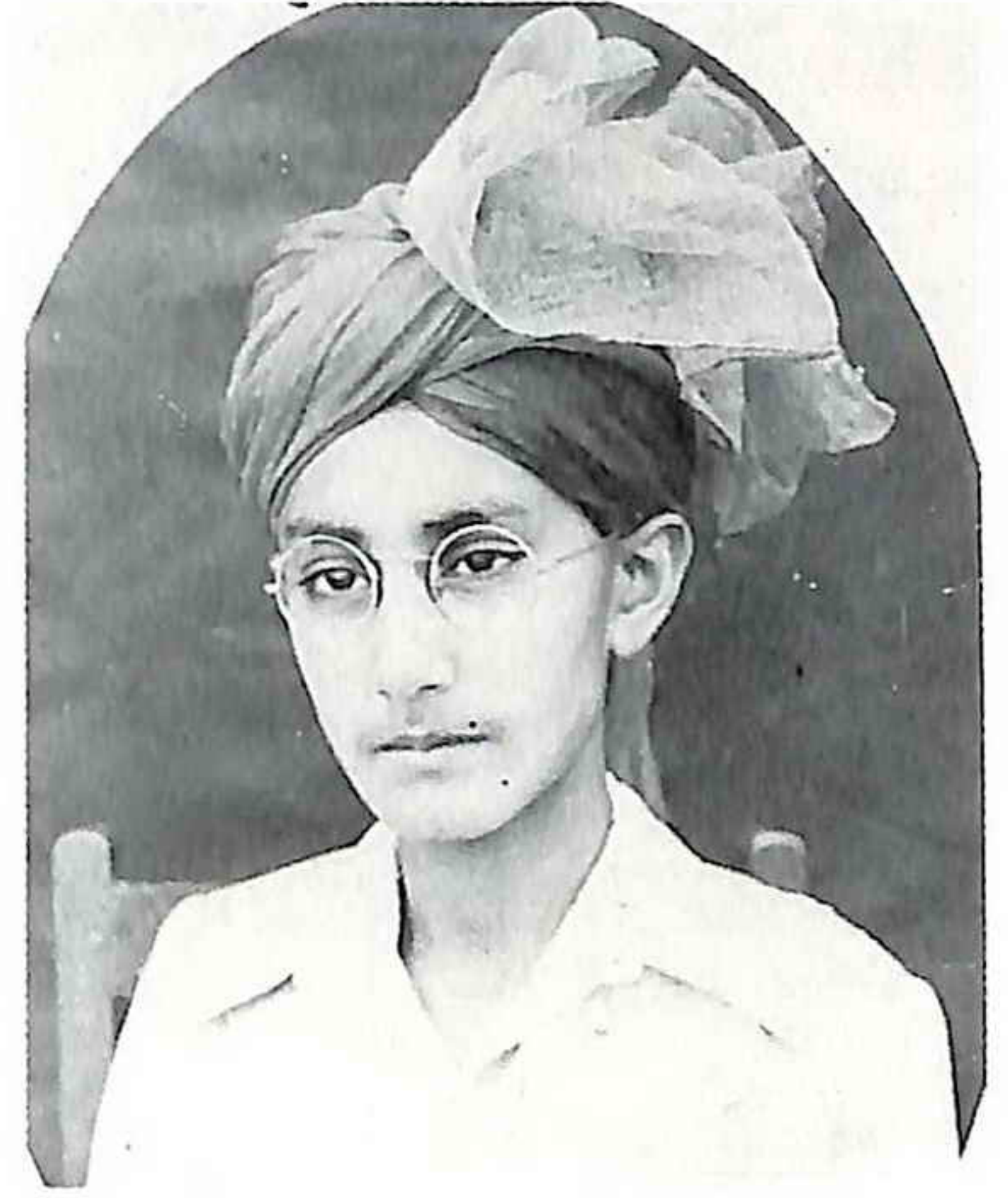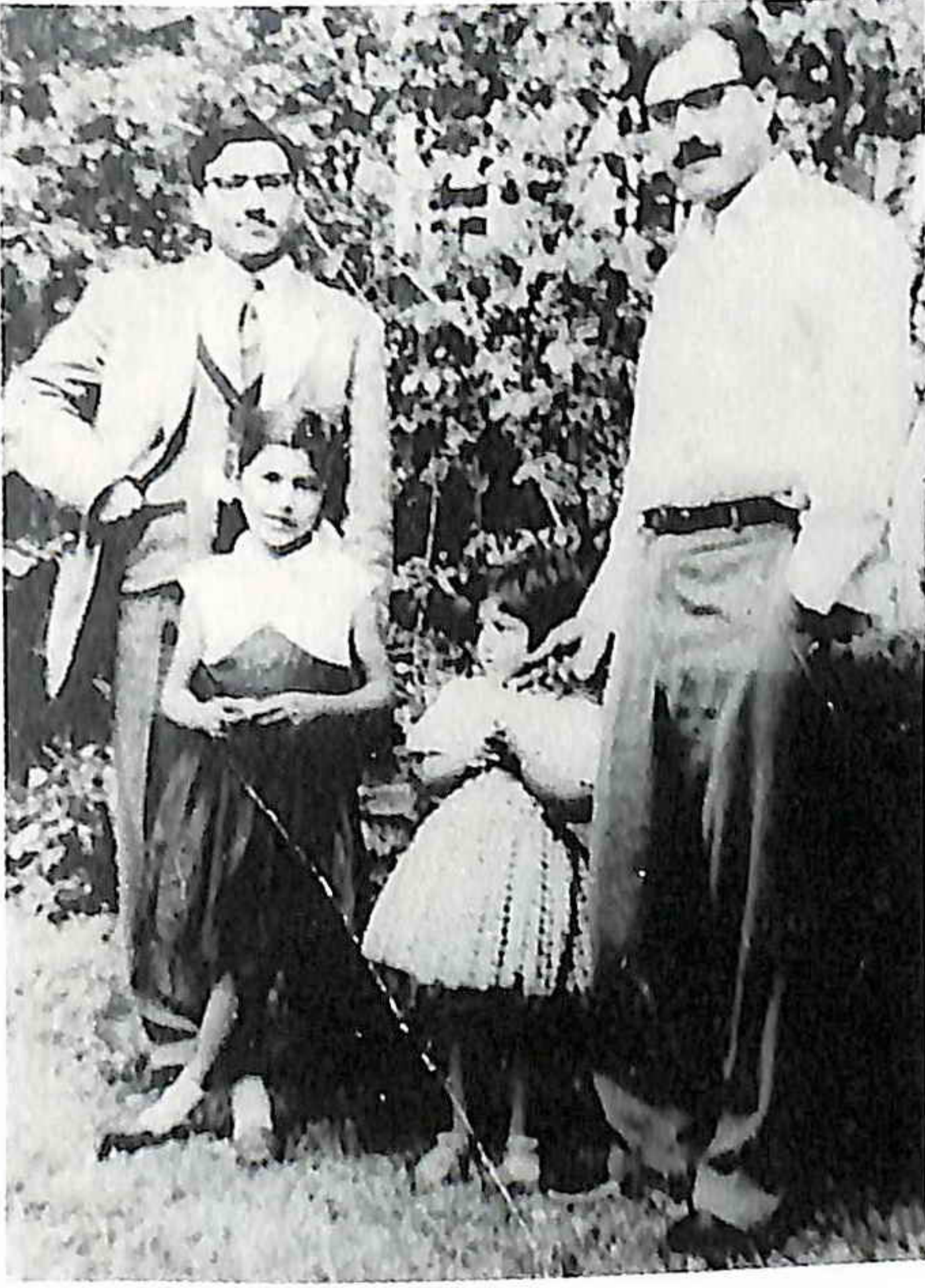
میٹرک کا نتیجہ نکلنے والے دن

ڈاکٹر صاحب اپنے بھائی اور ۲ دو بیٹیوں عزیزہ اور آصفہ کے ہمراہ

نوجوانی کا عالم ـــ
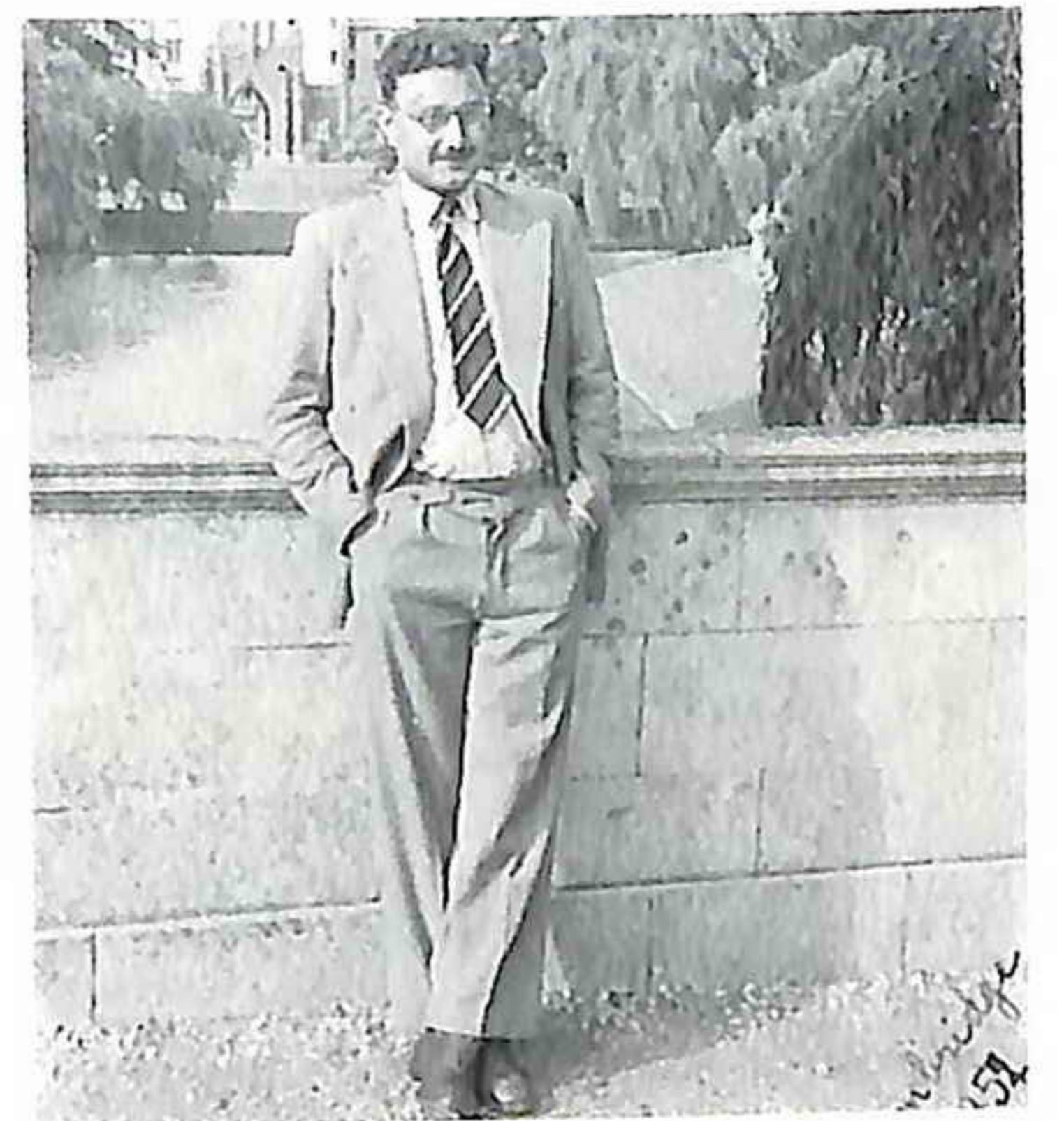
اپنے والد بزرگوار کے ساتھ (دائیں سے) چوہدری عبدالحمید صاحب،

ہر آن کوشاں رہتے تھے اور اس میں خاص لذت محسوس کرتے تھے۔ پاکیزہ جذبات اور قوت عملی کے باہمی امتزاج نے آپ کی شخصیت میں ایک عجیب دلاویزی پیدا کردی تھی جس کے زیر اثر آپ سراپا محبت نظر آتے تھے۔ عبادت اور ذکر الٰہی آپ کی روح کی غذا تھی۔ آپ اس کثرت سے دعا کرتے تھے کہ ہر آن دعاؤں میں مصروف رہنا آپ کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ اس حقیقت پر کہ دعا بجائے خود قوت اور طاقت کا ایک زبردست خزانہ ہے اور یہ غیر ممکن کو بھی ممکن میں بدل دیتی ہے۔ آپ کو ایسا پختہ ایمان حاصل تھا کہ اس بارہ میں حق الیقین کے مرتبہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ دعائیں کرنے کی تلقین کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے تھے۔ حتی کہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور دیگر احباب جماعت کے نام آپ کا کوئی خط ایسانہ ہوتا تھا جس میں دعاؤں کی پر زور تلقین نہ ہوتی۔ آپ کے یہی اوصاف تھے جو غیر معمولی رنگ میں جذب فضل الٰہی کا موجب ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل اور نشان کے طور پر آپ کو غیر معمولی قبولیت اور نصرت سے نوازا۔ اسی غیر معمولی قبولیت اور نصرت سے جس کا حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے کامل متبعین کے حق میں۔ حضرت بانی سلسلہ سے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں وعدہ فرمایا تھا۔

"ہمیشہ قیامت تک ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت اور نصرت دی جائے گی۔"

(اشتہار ۴ مارچ ۱۸۸۹ء)

حسب وعدہ الٰہی آپ کو جناب الٰہی سے جو غیر معمولی قبولیت اور نصرت عطا ہوئی اس پر آپ کی ساری زندگی آپ کی سیرت اور آپ کا کردار شاہد ناطق کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدائی افضال و انعامات آپ پر بارش کی طرح برسے اور آپ اللہ تعالیٰ کی اس دین اور عطا پر ہر بار جذبات شکر سے لبریز ہو کر پہلے سے بھی بڑھ کر اس کے آستانہ پر جھکے اور اللہ تعالیٰ کا قرآنی وعدہ "اے لوگو! اگر تم شکر گذار بنے تو میں تمہیں اور بھی زیادہ دوں گا" بار بار آپ کے حق پورا ہوتا چلا گیا۔

اپنی وفات سے پہلے اپنی اولاد کو مندرجہ ذیل وصیت فرمائی۔

خدمت دین کو اک فضل الٰہی جانو۔ اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو۔

۲۔ یعنی اگر تم مومن بنو تو اعلیٰ مقام (دین و دنیا میں) پاؤ گے۔

۳۔ یہ احمدی جماعت ہی ہے جس کا فرض اولین نیکی پھیلانا اور بدی سے روکنا ہے۔ اے میری اولاد تم پر فرض ہے کہ خود بھی اس کے عامل ہو اور اپنی اولادوں کو بھی اسی رستہ پر تربیت کرتی جاؤ۔

۴۔ خلافت کے ساتھ وابستگی لازمی ہے یہی تمام سعادتوں اور الٰہی تجلیوں کا مظہر ہے۔ جنہوں نے خلافت کو چھوڑا وہ دین و دنیا میں ناکارہ ہو گئے۔

۵۔ تم میں سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے کا ہمیشہ خیال رکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ کریم نے اپنی محبت کیلئے چنا تو ساتھ ہی خوشی سے فرمایا۔

یعنی ابراہیم! میں تمہیں دنیا کا امام (لیڈر) بناتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شوق ظاہر کیا کہ کیا میری اولاد کو بھی اسی امامت کے مقام سے نوازا جائے گا تو فرمان ہوا "کہ...... میرا عہد تیرے نقش قدم پر چلنے والوں پر پورا ہوگا۔ جو ظالم ہوں گے وہ میری نعمت امامت سے سرفراز نہیں کئے جائیں گے۔"

۶۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں...... یعنی سخت جھگڑالو شخص اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ بس جھگڑے سے پرہیز لازم ہے۔

۷۔ میری اپنی ساری اولاد کیلئے یہ دعا ہے کہ

اہل وقار ہوویں فخر دیار ہوویں
حق پر نثار ہوویں مولیٰ کے یار ہوویں
بابرگ و بار ہوویں اک سے ہزار ہوویں

۸۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ والدین کی وفات کے بعد اولاد کا فرض ہے کہ ان کیلئے دعا اور استغفار کرتی رہے ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آئے اور ان کے دوستوں کی عزت کرے۔ (ابوداؤد)

پس میری اولاد بھی میرے بعد اس حدیث نبوی پر عمل کرے۔ اللہ اس کے ساتھ ہو۔

آپ نے ایک مختصر علالت کے بعد ۷ ماہ شہادت ۱۳۴۸ ہش مطابق ۷ اپریل ۱۹۶۹ء بروز دوشنبہ ۳ بجے علی الصبح کراچی میں وفات پائی۔ آپ کا جنازہ اسی روز کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز لائلپور (فیصل آباد) لایا گیا اور پھر وہاں سے بذریعہ ایمبولینس کار شام سوا سات بجے

ربوہ پہنچا۔ اسی رات دس بجے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث (اللہ کی رحمت ان پر ہو) نے احاطہ بیت مبارک میں نماز جنازہ پڑھائی جس میں ربوہ کے مقامی احباب کے علاوہ جھنگ اور ملتان کے بعض احباب نے بھی شرکت کی۔ نماز جنازہ پڑھانے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے خاصی دور تک جنازہ کو کندھا دیا۔ بعد ازاں جنازہ بہشتی مقبرہ لے جاکر آپ کے جسد خاکی کو قطعہ خاص میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے جسد خاکی کو خاص اس قطعہ میں دفن کئے جانے کی خصوصی منظوری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے عطا فرمائی تھی۔

والدہ ماجدہ

آپ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ ان کے والد حضرت حافظ نبی بخش صاحب حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اولین رفقاء میں سے تھے۔ ان کا وطن فیض اللہ چک تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور تھا جو قادیان سے چند کوس دور تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی۔ محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ چونکہ ان کے والد صاحب حافظ قرآن تھے ان کی صحبت میں رہ کر انہیں بھی قرآن مجید کا اکثر حصہ حفظ ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر چوہدری محمد حسین صاحب کو جب کبھی کسی آیت کے حوالہ کی ضرورت پڑتی تو وہ سورۃ کا نام اور رکوع بتا دیا کرتیں۔ جھنگ اور ملتان میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے بے شمار بچوں اور بچیوں کو قرآن ناظرہ پڑھانے کی توفیق پائی۔ نہایت ہی صابر و شاکر منکسر المزاج خاتون تھیں۔ اپنے بچوں سے نہ ہی ناراض ہوتیں اور نہ ہی کبھی ان پر سختی کرتیں بلکہ ہمیشہ پیار و محبت سے ان کے ساتھ پیش آتیں۔ اپنی ساتوں بہوؤں کے ساتھ ان کا سلوک مثالی تھا اور بہوئیں بھی ان سے ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتیں۔ بہت ہی عبادت گزار اور دعا گو خاتون تھیں۔

انہوں نے ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو لندن میں اپنے بیٹے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے پاس مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی۔ چونکہ وہ 1/5 حصہ کی موصیہ تھیں۔ ان کے جسد خاکی کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب براستہ فیصل آباد ربوہ لائے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جسد خاکی کو قطعہ خاص میں ان کے خاوند حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کے عین سرہانے کی طرف دفن کئے جانے کی خصوصی منظوری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے عطا فرمائی۔ آپ اس قطعہ خاص میں دفن ہونے والی واحد خاتون ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام

(عبدالکریم قدسی صاحب)

بڑے دناں تو کوئی خط نہیں لکھیا سلام صاحب
عجب رجھیویں نے حال کیتا سلام صاحب
تہاڈی صحت دا حال کیہ اے اوہ کیہ مرض سی
تہاڈا جنہے نہ پچھا چھڈیا سلام صاحب
اوہ سائیں سوہنا اوہ شیر افضل ، اوہ جعفری
خدا نوں اوہ وی ہے پیارا ہویا سلام صاحب
بڑی چنگی غزل سی لکھ دا نظم سی لکھ دا
اوہدی نثر دا سواد وکھرا سلام صاحب
جمیل عالی دے ہیسی کالم وچ نوبل انعام
ملے گا تہانوں او مڑ دوبارہ سلام صاحب
ایہہ بخت آور پنجاب ساڈا چناب ساڈا
ہے جنہے جنیاں سپوت ایسا سلام صاحب
پنجاب دھرتی دی بولی دا وی ہے حق تساں تے
کوئی وقت کڈھ کے ایہہ قرض لاہنا سلام صاحب
وڈیرے سجناں نوں خط لکھے ہن میں نظم اندر
اوہنا چوں اک ہے تہانوں لکھیا سلام صاحب

۱۹۹۴ء میں خاکسار نے پینتیس دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کو منظوم خطوط لکھے تھے۔ یہ سارے پنجابی زبان میں لکھے گئے خطوط "قلم کبوتر" کی صورت میں چھپنے کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے جواب میں اپنی بیماری کی تفصیل لکھی تھی اور اپنی مادری زبان پنجابی میں کچھ لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

خدائے "السلام" کا بندہ ——

پروفیسر ڈاکٹر —— محمد عبدالسلام

(تحریر مکرم ناصر احمد طاہر صاحب)

اسم بامسمی "عبدالسلام" بزرگ والدین کی دعائیں اور الٰہی پیش گوئیاں جس کے حق میں پوری ہوئیں، اللہ کا ایک عاجز بندہ جس نے عصر حاضر کی دنیائے سائنس کو نئی جہتیں عطا کیں اور خدائے واحد کی طرف رخ موڑا، عالم اسلام کا سر فخر سے بلند کیا، پاکستان کا قابل فخر سپوت ثابت ہوا۔ پاکستان نے اس کی قدر نہ کی مگر وہ سب جہالتوں، تعصبات، ناقدریوں کے باوجود اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرتا رہا۔ اس کا ایک ایک سانس "حب الوطن من الایمان" کا ثبوت دیتا رہا۔

وہ جس کا نام نیوٹن اور آئن سٹائن کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ وہ جس کی غریبوں کے لئے ہمدردیاں غریب فرد واحد سے شروع ہو کر غریب ملکوں تک اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ تیسری دنیا کے لئے غریب ملکوں کے لئے "انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی فزکس" قائم کر کے عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیتے ہیں تو اس غریب شخص کو بھول نہیں جاتے جس کو ابتداء سے وظیفہ دے رہے ہیں۔ نظریاتی یا مالی امداد دے رہے ہیں۔ لاکھوں ڈالر کے انعامات میں سے کچھ بھی تو اپنے لئے نہ رکھا۔ سب کچھ غریبوں کو حصول تعلیم کے لئے دے دیا۔ نوبل انعام پاتے ہیں تو "بیت الفضل لندن" میں سجدات شکر بجالاتے ہیں۔

مجھے تو ان کے قول میں، ان کے فعل میں محبت الٰہی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ دنیا ان پر ایوارڈز کی بارش کر رہی ہے۔ انعامات کے پھول نچھاور کئے جا رہی ہے۔ ان پر فخر کر رہی ہے مگر وہ اپنی عاجزی میں مست ہیں۔ ان کی توجہ اللہ کو راضی کرنے پر ہے۔ فخر و تکبر نام کو نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یہ پیشگوئی آپ کے حق میں پوری ہوتی نظر آتی ہے (اور اس کے بارے میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے پہلے ہی آپ کے والد محترم کو خبر دے دی تھی)۔

"میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے"۔ (تجلیات الٰہیہ)

آپ کا نام "عبدالسلام" اللہ نے رکھا

آپ کے والد محترم صاحب رؤیا و کشف بزرگ تھے۔ اللہ نے آپ کی پیدائش کی خبر اور نام "عبدالسلام" انہیں عطا فرمایا۔ اس واقعہ کو وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

"۳ جون ۱۹۲۵ء بادشاہ انگلستان کا یوم پیدائش تھا۔ کچہری میں چھٹی تھی۔ میں شام کی نماز کی سنتیں.... (بیت) احمدیہ جھنگ شہر کے موزنہ کے پاس پڑھ رہا تھا کہ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ...الخ کی دعا پڑھی۔ جس پر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لڑکا پکڑا دیا گیا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لے لیا۔ میں نے اس کا نام دریافت کیا تو بتایا گیا کہ اس کا نام عبدالسلام ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور دوسرے روز بذریعہ چٹھی اپنی بیوی کو اس کے میکے اس کشف سے آگاہ کیا۔ اسی روز محترم میاں ناصر علی صاحب بی۔اے احمدی جو اس وقت دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب جھنگ میں ملازم تھے کو جھنگ شہر و کچہری روڈ پر کپاہیاں کی بستی کے سامنے یہ کشف بتایا۔ وہ بھی حیران رہ گئے۔ آخر ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء بروز جمعۃ المبارک بوقت نماز جمعہ عزیز عبدالسلام کی پیدائش ہوئی۔ حضرت اقدس کی خدمت میں تمام ماجرا

لکھا اور نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضور نے فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ نے از خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔ چنانچہ یہی نام رکھا گیا اور عزیز نے بھی اپنے اسی نام کو برقرار رکھا۔

(سوانح محمد حسین: صفحہ ۳۶۔۳۵: مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی: مطبوعہ ۱۹۷۴ء: شائع کردہ محمد احمد اکیڈمی: رام گلی نمبر ۴: لاہور)

بشارات ربانی

پھر فرماتے ہیں:۔

"الحمدللہ بشارت ربانی کے ماتحت پیدا ہوا۔ اس کے لئے بہت دعائیں کیں کہ وہ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ہو۔ الحمدللہ عزیز نے دنیا میں بھی شہرت پائی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اسے دین کا ستون بھی بنائے اور آخرت میں بھی وجیہہ اور مقرب الٰہی ہو۔ آمین۔

ایک روز عزیز سخت بیمار ہو گیا۔ جان کا بھی خطرہ محسوس ہوا۔ بہت دعا کی تو خواب میں عزیز کو ایک اچھے خاصے قد والا جوان دکھایا گیا۔ اس پر میں نے خدا تعالیٰ کی حمد کی۔"

(سوانح محمد حسین: صفحہ ۳۶۔۳۵: مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی: مطبوعہ ۱۹۷۴ء: شائع کردہ محمد احمد اکیڈمی: رام گلی نمبر ۴: لاہور)

یہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی

عام طور پر بچے جس عمر میں بولنا شروع کرتے ہیں عبدالسلام اس عمر کو پہنچ گئے لیکن ابھی بولتے نہ تھے۔ ان کے والدین نے ایک احمدی بزرگ حضرت مولوی غلام رسول صاحب راجیکی سے دعا کروائی۔ چنانچہ ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی چند روز ہمارے گھر جھنگ شہر میں مہمان رہے۔ عزیز عبدالسلام کی عمر اس وقت چھوٹی تھی اور وہ بولتا نہ تھا جس کا اس کی ماں کو سخت احساس تھا۔ حضرت مولوی صاحب کے پاس عزیز سلام سلمہ کو لے جا کر شکایت کی کہ یہ بولتا نہیں دعا کریں۔ مولوی صاحب نے بڑی محبت کے لہجے میں عزیز سے خطاب کیا اور کہا "او گونگلو کیوں نہیں بولتا" اور فرمانے لگے کہ انشاء اللہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی"۔

(پہلا احمدی ...... سائنسدان عبدالسلام: صفحہ ۱۹: تصنیف محمود مجیب اصغر: طبع اول ستمبر ۱۹۸۳ء: پرنٹر محمد محسن: لاہور آرٹ پریس ۱۵ نیو انار کلی لاہور)

عبدالسلام کیلئے خلعت تیار کیا جا رہا ہے

میاں ناصر علی صاحب جھنگ صدر تحریر کرتے ہیں:۔

"عبدالسلام ابھی بچہ تھا۔ ایک روز غریب خانہ پر بھائی صاحب تشریف لائے۔ میں اس وقت اپنے ایک عزیز کے مکان پر بیٹھا تھا اور بھی کئی دوست وہاں تھے۔ بھائی صاحب وہیں ہمارے پاس بیٹھ گئے اور اپنی روحانی باتوں سے مجلس کو ذکر الٰہی کی مجلس بنا دیا۔ پھر اپنا ایک تازہ رویا سنایا۔ فرمایا کہ رویا میں ایک نہایت بلند درخت دکھایا گیا جس کی شاخیں فضا میں نہایت ارفع چلی گئی ہیں۔ عزیز عبدالسلام اس درخت پر چڑھ رہا ہے اور بڑی پھرتی سے چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ دیکھ کر میں ڈرا کہ معصوم بچہ ہے گر نہ جائے اور اسے زور سے آواز دینے لگا کہ سلام اب بس کرو اور نیچے اترو۔ بچہ میری طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ ابا جان فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے پھر اوپر ہی اوپر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر گیا کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(سوانح محمد حسین صفحہ ۲۵۹)

سلام یہ سب وظیفے لے گا

آپ کے والد بزرگوار نے بچپن سے ہی آپ کی تعلیم و تربیت میں بہت محنت کی تھی۔ بہت دعائیں کی تھیں اور وہ اپنے رب سے ان دعاؤں کی قبولیت کا یقین بھی رکھتے تھے چنانچہ آپ کے والد محترم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سلام کی پڑھائی کیلئے خود انتظام فرماتا رہا۔ قابلیت کی بناء پر انہوں نے امام جماعت احمدیہ سے بھی وظیفے حاصل کئے۔

"دسمبر ۱۹۳۹ء میں سر چوہدری محمد ظفر اللہ خان نے جماعت احمدیہ میں ۲۵ سال خلافت ثانیہ کے گذرنے پر جوبلی فنڈ کی تجویز کی اور تین لاکھ روپیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو پیش کیا۔ حضور نے جلسہ

سالانہ ۱۹۳۹ء میں اعلان فرمایا کہ نوجوانوں کی ہمت بڑھانے کیلئے اعلان کرتا ہوں کہ جو طالبعلم جماعت احمدیہ کا اپنے سکول میں اول آئے گا اسے اس فنڈ سے تین روپے ماہوار کا وظیفہ ایف۔ اے کے دو سال میں دیا جائے گا۔

پھر جو ایف۔ اے میں اول آئے گا اسے ۴۵ روپے ماہوار (وظیفہ) بی۔ اے کلاسوں میں دیا جائے گا۔ ازاں بعد جو بی۔ اے میں اول آئے گا اسے ایم۔ اے کلاسز میں دو سال ۶۰ روپے ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد جو لڑکا مغرب کی کسی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے جائے گا اسے نصف خرچ اس فنڈ سے دیا جائے گا۔"

اسی شام ملاقات کے دوران سلام کے والد صاحب نے حضور کو بتایا کہ سلام یہ سب وظیفے لے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں حضور نے آپ کے خطبہ نکاح کے دوران فرمایا:۔

"ہر باپ اپنے بیٹے کی تعریف کرتا ہے عزیز (سلام) کے والد نے بھی ایسی توقعات کا اظہار کیا تھا۔ الحمدللہ عزیز (سلام) نے ان سب کو پورا کرنے کی توفیق پائی۔"

سلام کی عاجزی

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

"ڈاکٹر سلام کی عزت اور مرتبہ کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی کانفرنس ہو رہی ہو اور اس میں روس، امریکہ اور دیگر ممالک کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوں اور یہ (یعنی ڈاکٹر عبدالسلام۔ ناقل) بعد میں کانفرنس ہال میں داخل ہوں تو...... سارے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ...... کوئی خیال نہیں کہ میں اتنا بڑا انسان ہوں اور دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق ہے۔"

(روزنامہ الفضل ۲۲ دسمبر ۱۹۹۶ء: صفحہ ۵)

انکے نیک انجام سے میری توجہ نیک آغاز کیطرف ہو گئی

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے آپ کی فضیلت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ سائنسدان ہے جس کی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام و نشان نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ان کے نیک انجام سے میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی۔ ان کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا خدا کی وحدانیت پر غیر متزلزل ایمان، غیر اللہ کو مسلسل رد کرتے چلے جانا۔ آپ سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ پر پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل تھے پھر خدائے واحد و یگانہ کی عظمت کو ماننے کے نتیجہ میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں رہا ہے۔ حضور نے محترم ڈاکٹر صاحب کی خلافت سے وابستگی اور وفا اور اطاعت و خلوص کا بھی ذکر فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ وہ اتنے بڑے انسان تھے اس کے باوجود آپ میں کسی قسم کے غرور یا تکبر کا شائبہ نہیں تھا۔ اپنے تمام تر مقام کے باوجود خلافت سے اتنا گہرا اطاعت اور عاجزی کا تعلق رکھتے تھے کہ میں حیران ہو جاتا تھا۔ حضور نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں اور نسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ آمین

(بحوالہ ماہنامہ خالد جنوری ۱۹۹۷ء صفحہ ۳)

بقیہ از صفحہ 44

حال جمع ہے۔

اس ضمن میں ایک بات یاد آ رہی ہے چوہدری ظفراللہ خان صاحب کی۔ انگلستان میں وہ ایک ہسپتال میں داخل تھے۔ میں عیادت کیلئے گیا اور ساتھ شمائل ترمذی لے گیا۔ انہیں دی اور کہا کہ اگر خدا نے توفیق دی تو مستقبل میں میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ پھر میں Trieste چلا گیا۔ جب کئی مہینے بعد لندن واپس گیا اور ان کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ لئے بیٹھے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں وقت نہ ملے اور میرے پاس ہسپتال میں وقت تھا تو میں نے ترجمہ کر ڈالا۔ میں ہر طالب علم کو مشورہ دوں گا کہ وہ شمائل ضرور پڑھے اس کے پڑھنے سے بہت کچھ حاصل ہو گا۔

DAWN FRIDAY, NOVEMBER 22, 1996

A hero is gone

By Dr Pervez Hoodbhoy

WITH the death of Prof Abdus Salam, the world has lost one of the mightiest intellectuals born on the subcontinent, and the most powerful and influential advocate of science for developing countries. To the world of physics he has left a legacy, known as the Unification Theory, that is now a benchmark against which future progress in physics will be measured. To the countries of the Third World, he has left behind a unique institution in Italy which invites and benefits over a thousand scientists each year.

I first saw Prof Salam in 1972 when he came to Cambridge, Massachussetts, to give a talk at MIT. I was nearing the end of my masters degree in physics, but I understood nothing of his lecture and just sat in awed wonder. From the critical appreciation of the audience, who included some of the most well-known physicists at MIT and Harvard, I was however able to infer that this was no ordinary seminar and Salam was considered no ordinary visitor.

It was many years later, and after having had to learn a great deal more of physics, that I was able to understand Salam's incredibly deep and beautiful work of physics which earned him the Nobel Prize in 1979. It is hard to describe something so sophisticated in simple words but an analogy might help. More than a century ago, James Clark Maxwell had showed that magnetism and electric forces were actually the same thing, an achievement which led to the discovery of radio waves and much else.

In 1968, Salam showed that electromagnetism and the so-called "weak forces", which lead to light and heat being emitted from the sun and stars, were also actually just different aspects of a more fundamental "electroweak" force. His discovery, and prediction of certain particles completely unknown at that time, sparked a wave of interest all over the world and billion-dollar experiments were set up to check the predictions.

Salam was an intimidating personality. I can remember that the first time I asked him a physics question was after I had received my doctorate in nuclear physics in 1978. "Go look it up in a book", was his curt reply. I felt thoroughly chastened and small. It wasn't until 1984 that I approached him again. It was different this time, and we developed an understanding which grew deeper and firmer with each passing year. He asked me to co-author with him an article. I accepted instantly, feeling distinctly proud of honour.

In interacting with Salam, I could see that two strong passions governed his life. Physics research occupied him intensely; his mind would lock onto a problem making him oblivious to all else. He would engage only the most challenging and difficult problems of the field, problems that only the greatest can dare try. The elegance of his solutions were startling, as for example in his brilliant creation of what are called superfields. Without this powerful mathematical concept, physicists would have a very hard time to progress beyond a certain point in grappling with the basic laws of nature.

Salam's other passion was Pakistan. I have never been able to understand why he was so dedicated to the country of his birth given that he was virtually ostracized there, being an Ahmadi. I can remember that when the members of the physics department at Quaid-i-Azam University sought to invite him for a lecture after he received the Nobel Prize, the idea was vetoed when the student arm of a vociferous religio-political party threatened to use violence if he came to the campus. In spite of this and much more, Salam was never embittered and he never gave up trying to do whatever he could for his country.

Many people ask why Salam did not stay in Pakistan, choosing to stay as a professor at the Imperial College in London and the director of the Physics Centre in Italy. I think his decision was wise. His genius as a scientist would have been wasted had he stayed on in Pakistan; the loss to physics would have been certain and enormous. Moreover, he would have had little real chance to make a big difference because priorities in Pakistan have always been skewed heavily against the development of science. The most Salam could have achieved was a slight amelioration, if at all.

Salam is gone. There is no Pakistani, or for that matter any scientist from any Muslim country, who even remotely approaches him in stature. The loss is irreparable. Let us mourn.

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

کچھ یادِ ماضی — کچھ گزارشات

(پروفیسر عبدالسلام صاحب کے قلم سے)

(گورنمنٹ کالج لاہور کے سوا سو سالہ جشن کے موقعہ پر کالج کے مجلّہ "راوی" کے لئے خصوصی تحریر)

— بشکریہ "راوی" —

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ کالج لاہور اپنی سوا سو سالہ زندگی کے موڑ پر ایک جشن منا رہا ہے اور اس پر مسرت موقع پر "راوی" اپنا خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ دوسرے اولڈ راو-ینز کی طرح کچھ تو یاد رفتہ کے طور پر اور کچھ گزارشات موجودہ مسائل کے ضمن میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یاد ماضی کی باتیں زیادہ تر چالیس پچاس سال پرانی ہیں۔ وطن عزیز کا حال اچھا نہیں ہے جو ہماری ہی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ حال بہتر کیا جا سکتا ہے اور زیادہ تر گزارشات اسی سلسلہ میں ہیں۔

میرا آبائی گھر "جھنگ" میں ہے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں آنے سے پہلے میں جھنگ کالج کا طالبعلم تھا۔ ۱۹۳۸ء میں میں جھنگ کالج کا طالبعلم بنا۔ اس زمانہ میں یہ کالج ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ تعلیمی کیریئر کی بنیاد اس کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی حقیر کامیابیاں جھنگ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم اور ان کالجوں کے استادوں کی شفقتوں کی مرہون منت ہیں۔

۱۹۴۲ء میں میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں انڈر گریجوایٹ کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ چار سال تک گورنمنٹ کالج کا طالبعلم رہا اور ۱۹۴۶ء میں ریاضی میں ایم۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد کالج کو الوداع کہا۔ اس چار سال کے عرصہ کی جو باتیں بھلائی نہیں جا سکتیں اور اب بھی یاد آتی ہیں وہ اس کے استادوں، دوستوں اور ساتھیوں کی ہیں جو کہ مسلمان بھی تھے۔ ہندو بھی اور سکھ بھی۔ بہترین تعلیم کا معیار بھی ابھی تک یاد ہے۔ انگریزی کے استاد پروفیسر ایش کمار تھے۔ وہ اب اسی سال کے ہیں زندہ ہیں اور ہندوستان میں چنڈی گڑھ میں رہتے ہیں۔ پروفیسر کمال موقع موقع پر اقبال کے شعر سنایا کرتے تھے اس شعر کا ورد کچھ زیادہ ہی کرتے تھے۔

طلبم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے

یہ شعر بھی بہت سناتے تھے۔

زشرر ستارہ جوئم زستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

۱۹۸۱ء میں گورونانک یونیورسٹی میں جب ان سے ملا اور پوچھا کہ اقبال کا کیا حال ہے؟ تو کہنے لگے اب میں غالب پر آگیا ہوں۔ وہ غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں غالب پر ایک مستند کتاب بھی لکھی ہے۔ انگریزی کے ایک اور استاد پروفیسر عبداللطیف صاحب تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ آنرز میں انگریزی پروفیسر سراج الدین پڑھایا کرتے تھے جو بعد میں پرنسپل بھی بنے۔ ریاضی ڈاکٹر ایس ایم چاولہ پڑھاتے تھے وہ اب شاید Kansas University سے وابستہ ہیں۔ مرحوم پروفیسر عبدالحمید بھی ریاضی کے استاد تھے اور کئی دوسرے بھی۔

گورنمنٹ کالج کے قیام کے دوران مجھے کئی طرح سے خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً مجھے ۱۹۴۵ء میں کالج یونین کا صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نیو ہاسٹل کمیٹی کا بھی صدر تھا۔ ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میں "راوی" کے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اس طرح کالج میں قیام کے دوران بہت بھرپور زندگی گزاری۔ ایک بات کا ضرور افسوس ہوتا ہے کہ میں پروفیسر صوفی تبسم کی کلاس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ وہ فارسی پڑھاتے تھے اور اس زمانے میں Extra Lectures کو Attend کرنے کی روایت نہ

تھی اور میں نے فارسی کو بطور مضمون نہیں رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج کو (کیمبرج کی طرح) یہ روایت قائم کرنی چاہئے کہ چاہے کوئی ایک مضمون نہ بھی لئے ہو اور اس امتحان میں نہ بیٹھ رہا ہو تب بھی اسے اپنے پسندیدہ پروفیسر کے لیکچر میں بیٹھنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں طالبعلمی کے بعد ۱۹۵۱ء میں دوبارہ وابستگی ایک استاد کی حیثیت سے بھی رہی اور ۱۹۵۴ء تک میں ریاضی پڑھاتا رہا۔ مگر یہ وابستگی زیادہ دیرپا نہ تھی۔ مجھے پاکستان اور کالج دونوں ہی چھوڑنا پڑے۔ فزکس میں اعلیٰ تحقیق کی نہ تو کالج میں کوئی فضا تھی اور نہ ملک میں۔ راستے دو ہی تھے اور ان میں سے مجھے ایک کو چھوڑنا تھا۔ ایک یہ تھا کہ لاہور میں پڑھاتا رہوں اور اعلیٰ سائنسی تحقیق کو خیر باد کہہ دوں یا پھر کیمبرج واپس چلا جاؤں اور تحقیق کے کام کو جاری رکھوں۔ اس صورت میں کالج، لاہور اور پاکستان کو چھوڑنا لازمی تھا۔ بادل نخواستہ دوسرا راستہ اختیار کر لیا اور یوں کالج سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ خیر اب میں پھر واپس اپنے تعلیمی زمانہ کی طرف آتا ہوں۔

میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج کے کلاس روم میں طالبعلم اس انداز سے بیٹھتے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہیں۔ لیکچرار کے آنے سے پیشتر ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں انگریز طالب علم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم اور صحیح لکیریں ڈالنے کیلئے رولر استعمال کر رہا ہوگا۔ اس کی نوٹس لینے والی کاپیاں ایسی احتیاط سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویس لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالبعلم براہ راست سکولوں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے سب کم تھے لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور امنگوں کا وہ عالم تھا جسے تحصیل کرنے کیلئے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے جس میں ان کے سکولوں کا ہر استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا تھا کہ عزیز تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا۔ سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن بن سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لئے نیا تھا۔ کیمرج میں بی۔ اے کا امتحان آپ زندگی میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں۔ آپ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہاسٹل کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک آپ بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں۔ دس سے بارہ بجے تک ایک پینی جرمانہ، لیکن اگر آپ بارہ بجے کے بعد آئے تو سات دن کی Gating ہوگی اور اگر سال کے دوران تین بار ایسا ہوا تو آپ کو کیمبرج سے نکال دیا جائے گا۔ کیمرج میں ہر طالب علم Adult تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار گنا جاتا ہے۔ اس سے بے جا تعرض نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ تھیں، جنہیں وہ طالبعلم مردانہ وار قبول کرتے تھے۔ کیمبرج میں یہ سختیاں ۱۹۶۸ء کے بعد سے ہٹ گئیں۔ کیمبرج کا طالبعلم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے دن جب میں St. Johns College پہنچا، میرا تین سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو Taxi پر چلا آیا لیکن جب کالج پہنچ کر میں نے پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا بکس ہے تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ Wheel Borrow ہے آپ اسے اٹھائیے اور باقیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لے جائیے۔ میں ان پرانے قصوں کی بازخوانی محض ذاتی حظ لینے کیلئے نہیں کر رہا میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں یہ داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

ہماری تعلیمی اور اقتصادی ترقی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اس وقت جس بحران سے گذر رہا ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے۔ کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے وہ زندگی بھر شاید ہی بدل سکتی ہے لیکن اس تحریر میں میں شخصی کردار کے بارے میں عرض نہیں کروں گا۔ میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے۔ پاکستان کی ۴۰ سالہ تاریخ میں سب سے اہم مسئلہ قومیت کا مسئلہ رہا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک معجزہ تھا۔ دو سو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں ایک خطہ عطا فرمایا جسے ہم جیسے چاہتے بنا سکتے تھے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اپنے اندر احساس یگانگت، احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔ چنانچہ اس پاک ذات نے ہمیں

نااہل سمجھ کر اپنی وہ نعمت اور امانت اپنی پہلی صورت میں ہم سے واپس لے لی۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصور مختلف زمانوں میں بدلتا چلا آیا ہے۔ آج کے تصور کے لحاظ سے دنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی ہیں۔ جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجئے۔ امریکہ کے یونائیٹڈ سٹیٹس میں انگریز، آئرش، جرمن، اٹالین، سویڈش، فرانسیسی سب قبیلوں کے لوگ بستے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی علیحدہ قومیت کیلئے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں۔ ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں۔ مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جیسے ایک Crucible میں پگھلا کر ان قبیلوں کو ایک واحد قومیت میں منسلک کر دیا ہے۔ سکولوں میں ہر بچے کو امریکی دستور حفظ کرایا جاتا ہے۔ امریکی ہیرو اس کے زبان زد ہوتے ہیں۔ دن رات وہ امریکی ترانے سنتا ہے۔ ادیب، شاعر، افسانہ نویس اس طرز سے لکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطہ سے محبت اس کے شہری کے خمیر میں رچ جائے۔ امریکہ کے شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے محبت کا درس دیا جاتا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور افتادہ یورپ کی گلیوں، جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے۔ اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے مناسب ہوتی ہے جس سے اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا روزگار اور اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے۔ وہ اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کیلئے کوشاں رہتا ہے اور یہ سب کچھ سکولوں، کالجوں، اخبارات، رسائل اور ٹیلیویژن کے ذریعہ ہوتا ہے۔

اس وقت پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ (جن کے باشندوں کی اکثریت) مسلمان ہے، رسول اللہ ﷺ پر جانیں دینے والے، زبان کے لحاظ سے، تاریخ کے لحاظ سے، خوراک اور لباس کے لحاظ سے، کلچر کے لحاظ سے مغربی پاکستان دنیا کے Homogeneous ترین خطوں میں سے ہے۔ یقین مانئے سکاٹ لینڈ، ویلز اور انگلینڈ میں زیادہ دوریاں ہیں۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد نسبتاً ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ امریکہ کی طرح ہمارا نظام تعلیم، ہمارا تعلیمی نصاب اس خطہ زمین سے ہماری محبتوں کو اجاگر کر سکتا ہے۔ میں ایک ذاتی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ پاکستان میں ایک نئی اردو پیدا ہو، جو پرانی اردو، سندھی، بلوچی، پشتو، انگریزی، پنجابی اور جھنگ کی منفرد بولی کا امتزاج ہو۔ جو یگانگت اور قومیت کا احساس بڑھائے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کے احساس کو Consciously اجاگر کرے۔ مجھے کئی برس پہلے بہت خوشی ہوئی تھی جب کراچی کے شہر میں جناب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں ضیاء محی الدین صاحب نے ہیر رانجھا کو سٹیج کیا اور حضرت انشاء کے لفظوں میں۔

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

میری دوسری گزارش Technical اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ پاکستان اقتصادی طور پر پسماندہ ہے۔ ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی اوسط آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ، ایران کی آٹھ گنا زیادہ، ترکی کی آٹھ گنا زیادہ، عراق، الجیریا، شام، مصر کی فی کس آمدنی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں؟ مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی، پنجاب اور سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور ایک خالی خطہ زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے۔ اگر انگریز فن جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہیں تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھایا۔ اگر کلایو کی Flint Locks رائفلوں، بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فتیلہ سوز (Matchlocks) ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا۔ یہ فن اس قوم نے خود ایجاد نہیں کیا تھا۔ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے بعد تعلیم کے ذریعے سے انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا۔

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانہ کی مرہون منت تھی۔ رومی ترک تو اس فن میں ۱۵۲۶ء کے بعد بھی مزید

تحقیق کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کیلئے باقاعدہ تجربہ گاہ بنا لیتے۔ آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں۔ رومی ترک کا مسجد کا تصور اپنے زمانے میں یہ تھا کہ ہر شاہی جامعہ کے ایک طرف ہسپتال بنے گا دوسری طرف مدرسہ' یہ مدرسہ صرف دینی درسگاہ ہی نہیں ہوگا۔ اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہوں گے۔ بدقسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی۔ وہ اپنی یادگاریں' مزار اور مقبرے مثلاً تاج محل وغیرہ چھوڑ گئے مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکیوں پر رزق کھولا اور انہیں ایک نئے Continent سے نوازا تو کیا یہ ان کے عزم کا بدلہ نہ تھا جس نے انہیں بے کنار سمندروں میں نئے Contnients کی دریافت میں طوفانوں سے لڑوا دیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی Industry کی دھاک ساری دنیا میں بٹھادی ہے تو اس میں جاپانی نظام کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو Technology کی تعلیم دینے کیلئے نازل نہیں ہوئے۔ ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ شمار کیا جاتا تھا اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے۔ British Layland نے Mini Morris کار تیار کی۔ جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں۔ 1000CC کے بجائے جاپان 600CC کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاور Develop کرتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ ہونڈا والے سو انجینئر جمع کرتے ہیں۔ اسی قسم کے انجینئر جو مغلپورہ سے ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں۔ انہیں ایک سال کا وقفہ ملتا ہے اس دوران میں فرمائش ہے کہ وہ یہ نیا انجن Develop کریں گے۔ اپنی صلاحیتیں استعمال کریں گے ان کی زندگی اور موت یہی ہے۔ چالیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسر Townes نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انہیں اس ایجاد پر نوبل پرائز ملا۔ ان کا Patent توڑنے کیلئے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوششیں شروع ہوئیں اور اس قدر کامیاب ہوئیں کہ اس وقت سے الیکٹرونکس میں جاپانی بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انہوں نے وہ ایجاد دوبارہ دریافت کی بلکہ انہوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں بھی شائع کر دیا تاکہ جو چاہے پاکستانی ہو' عرب ہو' ایرانی ہو ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو Develop کر سکے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے ناآشنا تھے۔ ایڈمرل Perry امریکن ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے اور جاپانیوں نے انہیں روکنا چاہا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے چوری ہوئی' وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہو گیا اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بند سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی Metallurgy اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خود کشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات' فزکس' کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ ہڑتالیں نہیں ہوتیں' امتحان کے سنٹروں کے دروازے اور شیشے نہیں توڑے جاتے۔ ساری قوم' سب استاد' والدین' طالبعلم Examination Fever کا شکار ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔ بہت سال پہلے مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل سکول میں طالبعلم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل سکولوں کو میرے طالبعلمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھ لیجئے۔ ان پانچ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو بارہ مضامین پڑھنا پڑتے ہیں۔ جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا وہ بارہ مضمون درج ذیل ہیں۔

۱۔ وطنیات' ۲۔ چینی زبان' ۳۔۴ دو غیر ملکی زبانیں انگریزی' روسی یا جاپانی' ۵۔ ریاضی' ۶۔ فزکس' ۷۔ کیمسٹری' ۸۔ بیالوجی اور زراعت' ۹۔ تاریخ' ۱۰۔ جغرافیہ' ۱۱۔ آرٹس' ڈرامہ' میوزک' ۱۲۔ Work Shop Practice

ہر طالب علم پورے بارہ کے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ (اب شاید نقشہ بدل گیا ہے)

میرے طالبعلمی کے زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ مسلمان حساب نہیں پڑھتا۔ آج کل سننے میں آیا ہے کہ آدھے پاکستانی دماغ حساب یا فزکس یا کیمسٹری کے اہل ہیں۔ باقی پچاس فیصدی دماغوں کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ مضامین ان میں سما نہیں سکتے۔ چینیوں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ سو فیصدی طالبعلم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار ۱۶/۱۷ برس کے طالبعلم کے لئے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کیلئے میں نے فزکس اور ریاضی دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس Attend کئے۔ ریاضی میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم Orders of Infinity پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ B.A میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر صنعتی تکنیک کو چین میں رائج کریں گے ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان چالیس سالوں میں انہوں نے قومی سطح پر Electronics کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولاد سازی انگلستان کے برابر تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب Sophisticated Machine Tools بناتے ہیں۔ MIG 21 ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالبعلم اپنے سکول اور اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن ورک شاپ میں صرف کرتا ہے۔ میں جس سکول کا معائنہ کرنے گیا تھا اس میں یہ کیفیت تھی کہ چودہ سے سولہ سالہ طلباء کا ایک گروپ Transister Components بنا رہا تھا۔ دوسرا گروپ Potasiam Corbonate معدنی صورت سے لے کر Titration کرنے کے بعد بوتلوں میں بند کر کے مارکیٹ کیلئے تیار کر رہا تھا۔ بارہ سالہ چار طالبعلموں کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے بال کاٹنے میں مصروف تھا۔ ایک کمرے میں چار بارہ سالہ بچے تین Cent لے کر باقی طلباء کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں ان پر پردے ڈلے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب پہلے جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے شرماتے تھے۔ کھڑکیوں پر پردہ ڈالے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمیں اب اس محنت سے شرم نہیں آتی۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے طالبعلمی کے زمانے میں Productive ہوں Parasite نہ ہوں۔ میں نے مدرسوں میں، کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں بار بار پوچھا کہ یہ مان بھی لیا کہ سب فیکٹریاں گورنمنٹ کی ملکیت ہیں لیکن آپ لوگ محکمہ تعلیم میں کام کرتے ہیں۔ فیکٹریاں محکمہ صنعت کے پاس ہوں گی۔ آپ کو متعلقہ سیکرٹری صاحب سے اجازت کس طرح مل جاتی ہے۔ آپ کو یہ سب کام کرنے کے لئے Grants کی ضرورت ہوگی۔ اس کا انتظام کیسے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر صاحب اگر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے ملنا چاہیں تو عمال انہیں روک دیتے ہیں۔ آپ کے ہاں اس قسم کے مسئلے کس طرح حل ہوتے ہیں۔ یقین مانئے جب کبھی میں نے سوال کئے میں انہیں سوال سمجھا ہی نہ سکا۔ ان کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا کہ ہماری سوسائٹی بنی ہی اسی اصول پر ہے کہ ہر فرد جہاں بھی ہو ایک اچھے Idea کی امداد کرے گا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی افسر، کوئی حکومت کا عامل کسی طرح بھی روک بنے۔

چین کے بیان میں میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اگر انگریز نے Industrial Technique ایجاد کئے اور انہیں تعلیم کے ذریعے اپنی قوم میں پھیلایا، اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے (بغیر معدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے) اپنی ساری قوم میں Skills پھیلا سکتا ہے اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی مہارت سیکھے گا، اسے بڑھائے گا اور اگر سب قومیں اپنی غربت کا علاج اسی طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لئے سبق نہیں ہیں۔ آپ فرمائیں گے کہ غریبی خود اتنی لعنت ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو، ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ ۱۹۴۷ء میں میں کیمبرج میں طالبعلم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت

دیکھنے کیلئے دعوت دی۔ ۵۰۰ کے قریب طالبعلم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت نہیں تھی جو صحیح وسالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے لئے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے شہر میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ Research Scholar ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید ۲۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس مشاہرہ سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ' جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا۔ جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی کی تحصیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ ہیر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک لاہور سے چھپی ہوئی اور خستہ حالت میں پھٹی ہوئی ولا بھٹی کی کاپی تھی۔ یہ سن کر کہ شہر میں ایک پنجابی وارد ہوا ہے وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ ولا بھٹی میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقام میرے لئے بھی مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنہ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمائیں۔ مجھے معلوم نہیں وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم' ٹیکنالوجی کا علم' زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے۔ سٹرائیکس نہیں کریں گے۔ فلمیں نہیں دیکھیں گے۔ اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے۔ علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے شاید اس میں ہمارے لئے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

قومی تعمیر کے بارے میں میں چین کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان چیئرمین ماؤ نے بیان کی ہے اور اسے آپ ہر چینی کی زبانی سے سنیں گے۔ پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا اس کا نام "پیر کم عقل" تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی۔ لیکن اس کے دروازے کے سامنے "نے ہانگ" اور "وانگ وو" کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دو کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جس کا نام "پیر دانش ور" تھا اس بے عقل بوڑھے سے کہا "میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے۔" بے عقل بوڑھا بولا تمہارا کہنا درست ہے لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہیں' ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے' ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے' یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے۔ ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہو گی۔ بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو ہی جائے گی۔ "پیر کم عقل" کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا دو فرشتے آئے اور انہوں نے ان دونوں پہاڑوں کی لعنت کو دور کر دیا۔

میری عرض یہی ہے کہ سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انہیں اپنے حلقہ اثر میں Patience کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں ہو جائیے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ یہ فکر نہ کیجئے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہو گی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔ خداوند تعالیٰ کی پاک ذات ان میں بہت برکتیں ڈالے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ اقبال کے خودی کے فلسفہ کے غلط معنی بھی نکال گئے اور Individualistic زیادہ ہو گئے اور قوم اور ملت کیلئے کام کرنے سے گریز کرنے لگے۔

"خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

سے یہ مطلب نہ تھا کہ ہم اپنے اپنے مفاد کو مقدم کریں اور قوم اور ملت کو ثانوی حیثیت دے دیں۔ البتہ ہو یہی کچھ رہا ہے۔ مجھے دو کتابوں سے شغف ہے ہر..... کی طرح ایک قرآن پاک سے اور خصوصیت سے اس کے سننے سے دوسرے شمائل ترمذی سے۔ حضرت ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جن میں رسول پاک ﷺ کی ذاتی زندگی' حضور ﷺ کی رہائش' حضور ﷺ کی ذاتی شفقتیں' حضورؐ کا فقر اور حضورؐ کی ذات پاکیزہ کا

بقیہ صفحہ 37 پر

"سائنس کی خوش نصیبی تھی کہ عبدالسلام نے یہ مضمون پڑھنے کا فیصلہ کیا"

ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن میں

(مضمون نگار مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب۔ لاہور)

کیمبرج یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام نے نظری طبیعات میں ریسرچ کا کام بھی جاری رکھا۔ انہوں نے متعدد سائنٹیفک مقالے لکھے جن کی وجہ سے انہیں سائنس کی دنیا میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں سائنس کے میدان میں شاندار کارکردگی دکھانے کی وجہ سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ وہاں پڑھاتے ہوئے انہیں تین سال بھی نہیں گزرے تھے کہ امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن نے انہیں اپنے ہاں پروفیسر کے عہدہ کے لئے پیش کش کی جو ان کے لئے اور پاکستان کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ امپیریل کالج لندن میں ان کی تقرری کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

امپیریل کالج لندن کے شعبہ فزکس کے چیئرمین پروفیسر بلیکٹ Blacket جنہیں ۱۹۴۸ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا ایک مرتبہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات پروفیسر بیتھی Bethe جو امریکن جرمن نژاد تھے سے ہوئی۔ پروفیسر بیتھی کو ۱۹۶۷ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں پروفیسر بلیکٹ اور پروفیسر بیتھی کیمبرج یونیورسٹی میں بطور ریسرچ سکالر کام کرتے رہے تھے۔ اس لئے وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ پروفیسر بلیکٹ کو امپیریل کالج لندن کیلئے نظری طبیعات (Theoratical Physics) پڑھانے کیلئے ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنے دوست پروفیسر بیتھی سے پوچھا کہ اگر انکی نظر میں کوئی موزوں شخص ہو تو وہ انہیں بتائیں۔ اس پر پروفیسر بیتھی نے انہیں مشورہ دیا کہ اس منصب کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام نہایت موزوں رہیں گے۔ اتنا سنتے ہی پروفیسر بلیکٹ ڈاکٹر سلام کے کمرے کی طرف گئے۔ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی اندر داخل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ڈاکٹر سلام کو بیٹھے پایا۔ ڈاکٹر سلام اور پروفیسر بلیکٹ کے درمیان جو بات ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔

Professor Blacket: "Do you want a Chair"

Salam astonished said: "Yes Sir.

Blacket: "Thankyou

اس کے بعد ضابطہ کی کاروائی پوری کرنے کی غرض سے پروفیسر ٹمپل نے ڈاکٹر سلام کا انٹرویو لیا۔ پروفیسر ٹمپل علم فلکیات کے ماہر Eddington کے بے حد مداح تھے انہوں نے ڈاکٹر سلام سے پہلا اور آخری سوال پوچھا کہ

"علم فلکیات پر Eddington کی کتاب کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔"

بدقسمتی سے ڈاکٹر سلام کی اس کتاب کے بارے میں رائے اچھی نہیں تھی لیکن یہ جانتے ہوئے کہ پروفیسر ٹمپل Eddinton کے مداحوں میں سے ہیں انہیں یہ جواب دیا۔

I have not read the book with the detachment of a neutral mind.

یعنی میں نے آزادی فکر سے علیحدہ ہو کر اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر سلام کا یہ جواب سن کر پروفیسر ٹمپل مسکرائے اور کہا۔

Young man you should go to diplomatic service

یکم جنوری ۱۹۵۷ء سے ڈاکٹر سلام کو امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن میں Professor of Theoratical Physics تعینات کیا گیا۔

بقیہ صفحہ 68 پر

ڈاکٹر عبدالسلام کی امپیریل کالج لندن میں پروفیسر کے عہدہ پر تقرری کے بارے میں انگلینڈ کے اخبارات میں جب خبر شائع ہوئی تو وہاں پاکستانی طلباء نے بے حد خوشی منائی۔ کیونکہ بھارت کے ایک سابقہ صدر ڈاکٹر رادھاکرشن کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب دوسرے ایشیائی تھے جنہیں انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی نے پروفیسر مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر رادھاکرشن آکسفورڈ یونیورسٹی میں فلاسفی کے پروفیسر تھے جب کہ ڈاکٹر سلام سائنس کے شعبہ سے منسلک تھے یہ ایک انتہائی عزت کا مقام تھا جو پاکستانی طلباء کیلئے زیادہ خوشی کا باعث بنا۔

حسن اتفاق سے ان دنوں پاکستان کے ایک منجھے ہوئے سیاست دان میاں افتخار الدین صاحب جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا لندن میں قیام پذیر تھے۔ میاں صاحب نے ڈاکٹر عبدالسلام کی بطور پروفیسر تقرری کی خبر سنی تو انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خبر کی تصدیق کیلئے انہوں نے ڈاکٹر سلام کو تلاش کیا اور ڈاکٹر سلام سے بار بار پوچھتے تھے کہ "سلام کیا یہ خبر صحیح ہے" اس کے بعد انہوں نے اپنے اخبار پاکستان ٹائمز لاہور میں ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں ایک پورے صفحہ کا فیچر لکھا جس سے ڈاکٹر عبدالسلام اپنے وطن عزیز میں بھرپور طریق سے متعارف ہوئے۔ اس فیچر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر سلام نے کہا

He was rediscovered by Pakistan.

امپیریل کالج لندن میں ایک روایت چلی آتی ہے کہ ہر نئے پروفیسر کو عہدہ پر فائز ہونے کے بعد باضابطہ طور پر افتتاحی تقریر (Inaugral Lecture) کرنا ہوتی ہے۔ اس تقریب میں کالج کے تمام استاد' اس شعبہ کے طلباء اور دیگر معززین جنہیں وہ پروفیسر مدعو کرنا چاہیں شرکت کرتے ہیں۔ میں ان دنوں لندن میں تھا چنانچہ اپنے بھائی جان کی دعوت پر مجھے بھی اس تقریب میں شامل ہونے کا اعزاز ملا۔

یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ اپنی افتتاحی تقریر کے موقع کی مناسبت سے ڈاکٹر سلام نے نیا سوٹ سلوانے کا ارادہ کیا وہ لندن کے مشہور علاقہ پکاڈلی (Picadilly) کے قریب ایک جگہ (Savillrow) (بازار کا نام) کے مشہور درزی (Hawks) سے نیا سوٹ بنوانا چاہتے تھے۔ اس بازار کے درزی اس لئے مشہور ہیں کہ وہ سوٹ کی سلائی مشین کی بجائے ہاتھ سے کرتے ہیں (Hand stitched) اس لئے ان کے دام بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور وہ ہر کس وناکس کا کام بھی نہیں کرتے وہ صرف اس شخص کو سوٹ تیار کر کے دیتے ہیں جس کے پاس ان کے کسی گاہک کا Letter of Recommendation ہو۔ میں بھائی جان کے ہمراہ وہاں گیا تو انہوں نے پہلی بات یہی دریافت کی کہ

Have you got a letter of recommendation

جب بھائی جان نے بتایا کہ ان کی تو کسی لارڈ یا کسی اور بڑی شخصیت سے واقفیت نہیں لہذا ان کے پاس کسی کی Recommendation نہیں ہے۔ اس پر ان لوگوں نے سوٹ تیار کرنے سے معذرت کرلی۔ ان کے اس جواب سے مایوس ہو کر جب ہم دونوں دوکان سے باہر آرہے تھے تو ان کے ایک معمر سیلز مین نے ہمیں آواز دیکر اپنے پاس بلایا اور اس نے بھائی جان سے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں جس پر انہوں نے بڑی انکساری سے کہا میں امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں پروفیسر ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ اس سیلز مین نے کہا کہ سر آپ اندر تشریف لائیں ہم آپ کے لئے سوٹ تیار کر دیں گے۔ یہ تو ہمارے لئے ایک بہت بڑی عزت کا مقام ہوگا کہ ہم ایک پروفیسر کو سوٹ بنا کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ناپ لیکر پندرہ دنوں کے اندر سوٹ تیار کر دیا۔ جب کہ عام حالات میں ایک سوٹ تیار کرنے کیلئے کئی ماہ لیتے تھے۔ اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگلینڈ میں ایک پروفیسر کو کتنی عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

افتتاحی تقریر امپیریل کالج کے ایک ہال میں منعقد ہوئی جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اس تقریب کی صدارت پروفیسر بلیکٹ نے کی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر سلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۶ء میں جب سلام کیمبرج میں داخلہ لینے کے لئے پہنچا تو اس کے سامنے اس بات کا فیصلہ کرنے کا مشکل ترین کام یہ تھا کہ وہ آیا ریاضی پڑھے یا انگلش لٹریچر کیوں کہ اس نے بی اے میں انگلش لٹریچر میں آنرز کیا ہوا تھا اس کے بعد پروفیسر بلیکٹ نے کہا

"Lucky for us and lucky for science that salam had decided to study science"

اب بھی پھرتی ہے نگاہوں میں وہ صورت تیری

ہمارے بھائی جان

(مکرم ڈاکٹر صاحب کے بھائی چوہدری عبدالرشید صاحب۔ لندن)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہمارے سب سے بڑے بھائی تھے۔ ان کو ہم سب بھائی جان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو آپ اس دنیائے فانی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنے حقیقی آقا و مولا سے جاملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۰ سال اور دس ماہ تھی۔ آپ انگلستان / اٹلی میں رہ رہے تھے۔ گاہے بگاہے پاکستان اور دنیا کے باقی ممالک کا دورہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی بھرپور زندگی اتنی مصروف رہتی تھی کہ سمجھ نہیں آرہی کہ کہاں سے ان کے ذکر خیر کو شروع کیا جائے۔ آپ نے آسٹریلیا کے علاوہ سارے براعظموں کا کئی بار دورہ کیا تھا۔ سفر کرنے سے ہرگز نہیں گھبراتے تھے۔ ہوائی جہاز میں چند گھنٹے نیند پوری کر کے تازہ دم ہو جاتے تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ۳۶/۳۵ سال سے کچھ زائد عرصہ انگلستان میں ان کے ساتھ گزارنے کا موقعہ ملا۔ آپ پہلے مسلمان سائنسدان تھے کہ جن کو فزکس میں ان کے اپنے ریسرچ کے کام پر ۱۹۷۹ء میں نوبل پرائز دیا گیا۔ آپ دنیا کے چند چوٹی کے سائنسدانوں میں سے ایک تھے کہ ساری دنیا آپ کا لوہا مانتی ہے اور انشاء اللہ مانتی رہے گی۔ آپ غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے۔ یہ اللہ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا زرخیز دماغ عطا فرمایا تھا۔ آپ اگر ایک بار کسی چیز کی طرف توجہ کرتے تو وہ چیز ان کو بھولتی نہ تھی۔ کام کرنے کی بڑی لگن تھی۔ اپنے ہر امتحان میں اول رہنے کی تمنا تھی اور اول ہی رہتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے تھے۔ تقریباً پندرہ سولہ گھنٹے روزانہ مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ محنت اور مشقت بہت کرتے تھے۔

الحمدللہ مجھے مکرمی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ۳۵، ۳۶ سال کا عرصہ گزارنے کا موقع انگلستان میں ملا۔ ان کے ساتھ کئی بار بیٹھا۔ مختلف موضوعوں پر بات چیت ہوئی۔ ان کے ساتھ سفر بھی کیا۔ ان کو کار میں کالج، ایئرپورٹ، بیت وغیرہ بھی لے جاتا رہا۔ ان کو ایک دوست، ایک باپ، ایک استاد کی مانند پایا۔ آپ کا کلام بڑا وسیع تھا۔ بات کر کے بھولتے نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے روشن دماغ دیا تھا جو کہ سب کچھ جلدی جذب کر لیتا تھا۔ لوگ اکثر ہم بھائیوں سے پوچھتے تھے کہ میاں تم اتنے ہوشیار کیوں نہیں ہو تو ہمارا جواب ہوتا تھا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ آپ کا وجود اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت عظمیٰ تھا۔ خداداد ذہانت پائی تھی۔

آپکو سادہ کھانا کھانے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر ایک سالن ہی پسند کرتے تھے۔ آلو گوشت، سیخی کباب، شامی کباب، پشاوری کباب، مچھلی کے کباب، قیمہ مٹر، دالیں، دال چنا گوشت میں، بھنڈی گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ آم کا اچار، آم کی چٹنی بھی پسند کرتے تھے۔ دیسی مٹھائیوں میں برفی بڑی پسند تھی۔ پتیسہ بھی بڑا پسند تھا۔

(بیت) میں انصاراللہ اور خدام الاحمدیہ کے اجلاس میں انہوں نے کئی بار تعلیم کی اہمیت پر لیکچرز دیئے تھے۔ آخر عمر میں بائیوکیمسٹری پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بائیوکیمسٹری میں ایک بار پھر نوبل پرائز مل سکتا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ لیا تھا۔ حضور کو ان کی بات پسند آئی تھی۔ ایک بار حضور سے ملاقات پر میں ساتھ تھا تو ملاقات ۴۵ منٹ جاری رہی۔ سارے پروگرام لیٹ ہو گئے۔ بڑے مزے سے پاکستان، تعلیم، نوبل پرائز پر باتیں ہوتی رہیں۔

جب انگلستان میں ہوتے تو شام کو گھر تشریف لا کر بچوں کے ساتھ

گھل مل جاتے۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔ بچوں سے سارے دن کی کاروائی کے بارے میں پوچھتے۔ ذہین اور غریب بچوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی کوشش ہوتی کہ سارے جہاں کے غریب ممالک میں اور خاص طور پر پاکستان میں خواندگی کی شرح بڑھے۔ پاکستان میں غریب طلباء کو خطوط لکھتے۔ ان کو وظائف دیتے اور ان کے بارے میں دوسرے پروفیسروں کو خط لکھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش اور کوشش تھی کہ کسی طرح پاکستان میں سائنس کی تعلیم میں فروغ ہو لیکن افسوس کہ پاکستان نے ان کی اس بارہ میں کوئی خاص مدد نہ کی اور جس کا آپ کو بہت دکھ تھا۔

آپ ۱۹۹۲ء کے جلسہ سالانہ انگلستان میں میرے ساتھ جلسہ گاہ ٹلفورڈ اسلام آباد میں حضور کی تقریر سن رہے تھے۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام سننے پر آنسو نکل رہے تھے۔ اس موقعہ پر میں نے کہا "بھائی جان ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے احمدیت کو قبول کرلیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم احمدی.... ہیں"۔ اس بات کو سنتے ہی فرمانے لگے "ہاں میاں تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر والدین نے احمدیت قبول نہ کی ہوتی تو ہمارا آج کیا حال ہوتا"۔ پھر فرمایا کہ "میں تو والدین کو اپنی ہر نماز میں یاد رکھتا ہوں اور ان کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ احمدیت نے ہی ہماری زندگی تبدیل کردی ہے ورنہ ہم باقی لوگوں کی طرح جگہ جگہ بھٹک رہے ہوتے' نہ ہمارا کوئی امام ہوتا نہ لیڈر نہ کوئی دعا کرنے والا ہوتا۔ دیکھو حضور کی تقریر میں کتنی معرفت کی باتیں ہیں۔ پھر فرمانے لگے کہ "کیا تم قرآن مجید کو ترجمہ کے ساتھ پڑھتے ہو" میں نے ہاں میں جواب دیا تو آپ بڑے خوش ہوئے۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں ہمارے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی وفات پر ہم سب بھائی حضور پر نور حضرت خلیفتہ المسیح الثالث کو ملنے گئے حضور نے دلی طور پر افسوس کا اظہار کیا۔ مکرمی بھائی جان نے فرمایا کہ "حضور ہمارے والد صاحب بڑے دعاگو انسان تھے ان کے چلے جانے پر اب دعا کا منبع ختم ہوگیا ہے" حضور نے از راہ شفقت مکرمی بھائی جان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ آپ کا خلیفہ وقت آپ کے والد ماجد کی جگہ آپ کے لئے دعا کرے گا اور انشاء اللہ آپ کے والد ماجد کی دعائیں پوری ہوں گی۔ میں بھی دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نوبل پرائز سے نوازے۔ چنانچہ پورے دس سال بعد ۱۹۷۹ میں اللہ تعالیٰ نے اس انعام سے بھی نوازا۔ انعام کی خبر سنتے ہی آپ بیت فضل میں شکرانے کے نفل پڑھنے چلے گئے۔ سبحان اللہ۔

حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب اور صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب کے ساتھ بھی ان کی کافی بے تکلفی تھی ان سے اکثر مشورہ لیا کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے بڑے لڑکے عزیزم احمد سلام کو کہا کہ تم سائنس کے مضمون پڑھا کرو لیکن اس نے سائنس میں کوئی خاص دلچسپی نہ دکھائی اور اکنامکس کے مضمون کو پڑھنے میں شوق کا اظہار کیا۔ دوسرے دن حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب جو کہ اکثر ناشتہ مکرمی بھائی جان کے ساتھ ان کے مکان پر کرتے تھے سے شکایت کی یہ دیکھیں چوہدری صاحب میں عزیزم احمد سلام کو کہتا ہوں کہ فزکس اور حساب کے مضامین پڑھا کرے اور یہ اکنامکس میں دلچسپی رکھتا ہے۔ حضرت چوہدری صاحب نے مکرمی ڈاکٹر صاحب کے تشویش کے اظہار کو سمجھ لیا اور فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب اگر دنیا کے سارے طالب علم سائنس دان بن جائیں تو دنیا تو ختم ہو جائے گی آپ عزیزم احمد سلام کو اکنامکس پڑھنے دیں۔ انشاء اللہ اسی میں چمکے گا آپ اسکے لئے بھی دعائیں کرتے رہیں والدین کی دعائیں تیر کی طرح سیدھی نشانہ پر لگتی ہیں" الحمد للہ عزیزم احمد سلام نے ایم اے اکنامکس میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔

1957ء میں آپ جھنگ شہر والدین کے پاس تشریف لائے تو ایک رئیس زمیندار نے حضرت والد صاحب سے ذکر کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ملانا چاہتا ہے بعد دوپہر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر ہمارے جھنگ والے مکان میں حاضر ہوا تو آتے ہی اس نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کہا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ ولایت میں پڑھے ہوئے ہیں میرے لڑکے کی آنکھیں خراب رہتی ہیں اس کے لئے کوئی دوائی تجویز کریں" مکرم بھائی جان کچھ پریشان ہو گئے انہوں نے کہا۔

"اباجی آپ ان کو جواب دیں"۔

والد صاحب نے زمیندار صاحب سے کہا

"ڈاکٹر عبدالسلام میڈیکل ڈاکٹر نہیں یہ تو فزکس کے پی ایچ ڈی

ہیں یہ آنکھوں کا علاج نہیں کر سکتے۔"

زمیندار نے کہا۔ "تاڈے ولایت پڑھن داسانوں کی فیدا ہویا"

والد صاحب حضرت خلیفتہ المسیح الاول کی ایک سرمہ کی شیشی اندر سے لے آئے اور فرمایا۔

"اس کو استعمال کریں اللہ شفادے گا۔"

چنانچہ ایک ماہ کے اندر شفا ہو گئی۔ الحمدللہ

مکرم بھائی جان کو "رب زدنی علما" اور "رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر" کی دعائیں پڑھنی پسند تھیں۔ والدین کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں کا ثمر ساری عمر کھایا۔ مکرمی بھائی جان کو چار مرتبہ خواب میں دیکھ چکا ہوں آپ بڑے خوش تھے۔ الحمدللہ

خلافت سلسلہ کے ساتھ آپ کی وابستگی فدائیت اور اطاعت مثالی رنگ رکھتی تھی جو حضور فرماتے اسی پر عمل کرتے اور اپنا سوال بھی حضور سے پھر نہ پوچھتے۔ حضور کو بھی ان کا بڑا خیال رہتا تھا۔ حضور ان کو ہومیو پیتھی دوائی دیا کرتے تھے۔

وہ ایک ہیرا تھا۔ ایک مرد مجاہد تھا۔ باقی طلباء کیلئے روشنی کا منور چراغ تھا۔

مکرم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام اس لئے روشن رہے گا کہ وہ واحد مسلمان سائنس دان تھا جس نے فزکس میں نوبل انعام حاصل کیا اور ثابت کر دیا کہ قابلیت صرف مغربی ممالک کی میراث نہیں۔ ان کا نام اس لئے زندہ رہے گا کہ وہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس شخص نے انعام ملنے پر شاندار مکان نہیں خریدا۔ اپنی ذات پر رقم خرچ نہیں کی بلکہ اس نے تیسری دنیا کے غریب طلباء کیلئے صدقہ جاریہ کے طور پر ٹرسٹ قائم کیا اور ان بچوں کو سکالر شپ عنایت کیں۔ خدا تعالیٰ کی واحدانیت پر اس کو ایمان تھا اور اس کو سائنس سے ثابت کیا اور اللہ کی حی قیوم واحد ہونے پر اس کا ہمیشہ یقین تھا وہ نماز روزہ زکوۃ اور دینی شعار کا پابند رہا۔ ۱۹۴۷ء میں (بیت) فضل لندن میں اعتکاف بھی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بے شمار اعزازی ڈگریاں تھیں لیکن کبھی اس شخص نے اپنے نام کے ساتھ ان کو استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی ڈگریاں لے کر وہ مغرور ہوا۔ وہ منکسر المزاج تھا اور ایسا ہی رہا۔ ہمیشہ دھیما بولتا تھا۔ وطن سے محبت کا عالم یہ تھا کہ اس شخص نے اپنی پاکستانی شہریت کو کبھی نہیں چھوڑا حالانکہ اس کو برطانیہ، ہندوستان اور دیگر کئی ممالک اپنا شہری بنانا فخر سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ اس فرزند پاکستان اور فرزند احمدیت کو اپنی رحمت کی چادروں میں لپیٹ لے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ مکرمی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ

"مجھے دو کتابوں سے عشق ہے ہر مسلمان کی طرح قرآن مجید سے خصوصیت سے اس کے سننے اور اس پر عمل کرنے سے اور دوسرے شمائل ترمذی سے حضرت امام ترمذیؒ نے اس کتاب میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جن میں آنحضرت ﷺ کی ذاتی زندگی، طرز کلام، رہائش، حضور کی ذاتی شفقتیں حضور کا فقر اور حضور کی پاکیزہ ذات کا حال جمع ہے۔"

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ

"میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کو ہسپتال ملنے گیا جب کہ آپ کچھ بیمار تھے اور میں شمائل ترمذی ساتھ لے گیا اور ان کو دکھا کر عرض کی کہ اللہ مجھے توفیق دے تو میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔

پھر آپ اٹلی Trieste اپنے کام پر چلے گئے اور کتاب چوہدری صاحب کو پڑھنے کیلئے دی۔ حضرت چوہدری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے چھپوا لیا اور ڈاکٹر صاحب کو تحفہ دیا ڈاکٹر صاحب نے کہا حضرت چوہدری صاحب اس کا ترجمہ تو میں نے خود کرنا تھا تو چوہدری صاحب فرمانے لگے۔

"میں نے سوچا کہ شاید تمہیں وقت نہ ملے میرے پاس ہسپتال میں وقت تھا تو میں نے ہی ترجمہ کر دیا۔"

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے سب طلباء کو قرآن مجید اور شمائل ترمذی بار بار پڑھنی چاہئیں۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام حاصل کرتے وقت ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بادشاہ کے محل میں ایک مختصر مگر جامع تقریر کی جس میں پاکستان کا نام سربلند کیا اور قرآن مجید کی سورۃ الملک میں سے 4/5 کی تلاوت ترجمہ کے ساتھ فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں قرآنی آیات فریموں میں آویزاں تھیں۔ لیکچرز میں قرآن پاک کو Quote کیا کرتے تھے۔ اٹلی کے سنٹر میں نماز جمعہ کی امامت خود کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی اردو کی تحریر 1943

بھکارن کا گیت

دکھیا من ہے دکھیا کایا
چھوٹ گیا ہے اپنا پرایا
دنیا کیا ہے ۔ مایا مایا!
مایا کے سب میت ہیں لیکن مایا کس کی میت
بابا سن لو میرا گیت

دنیا والے لوبھی بندے
تن کے اجلے من کے گندے
جھوٹی دنیا جھوٹے دھندے
کوئی نہیں ہے سنگی ساتھی سب کی جھوٹی پریت
بابا سن لو میرا گیت

جھوٹی ساری دنیا داری
مطلب کے ہیں سب نر ناری
من کی دنیا سب سے نیاری
من کے ہارے ہار ہے بابا من کے جیتے جیت
بابا سن لو میرا گیت ۔

منیر الال احمد

دل رہین غم جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفل ہستی
اے غم دوست تو کہاں ہے آج

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا

ہجوم یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفور درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا

فیض

تصور کی آغوش میں سو رہے ہیں
مگر کبھی آ مرے معصوم قاتل

کہا تم نے ستم اور میری دعائیں
تمہیں پیار کرتی ہیں پیاری دعائیں

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہگار نظر کو حجاب آتا ہے

ابھی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

[illegible] تیز تر ہی کام بشنگ
وقت ہے [illegible]

تری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلہ نہیں باقی

مری قسمت سے کھیلنے والے
تیز ہے آج درد دل ساقی

[illegible] قسمت سے بے خبر کر دے
تلخی مے کو تیز تر کر دے

ع یہ نہ سوچا تھا کہ یہ چاند بھی گہنائے گا

میرے پیارے بھیّا!

(مکرمہ حمیدہ بشیر صاحبہ کراچی۔ ہمشیرہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب)

کسی نے کتنی سچی بات شعر کے رنگ میں ڈھالی ہے۔

موت اس کی ہے زمانہ کرے جس پہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں جانے کیلئے

اس عظیم انسان کیلئے جس نے دنیا میں یاد آنے کیلئے اپنا نام اور اپنے کئے تمام کام بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ میں تو کبھی بھی ان کے مرتبے کے مطابق نہ لکھ پاؤں گی۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے لیکن اظہار نہیں ہو سکتا۔

ان کا بچپن اپنے والدین کے زیر سایہ ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ گزرا۔ الحمدللہ بہت ہی اچھا گزرا۔ جس کی یاد اکثر دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دور پھر لوٹ آئے۔ اس وقت تو ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ میرے بھائی جان اتنے عظیم المرتبت انسان بن کر دنیا کے سامنے مثالی انسان بن کر اپنا نام روشن کریں گے۔ اور ہمارے اباجی مرحوم کا کشف اس طرح پورا ہو گا۔ عبادت کے دوران اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندہ کو کشف میں دکھایا تھا کہ ایک فرشتہ ان کو بچہ پکڑا رہا ہے۔ جس کا نام بھی عبدالسلام بتایا گیا۔

بہترین والدین

اولاد کی تربیت میں والدین کا اپنا نمونہ ایک حرف آخر ہوتا ہے۔ ہمارے والدین (اللہ تعالیٰ انہیں اپنے قرب میں اعلیٰ مقام دے۔) بہترین والدین اور بہترین استاد تھے۔ وہ ہم سب کیلئے ایک مقدس اور نیک نمونہ تھے۔ انہوں نے ہی ہمیں اللہ تعالیٰ، حضور نبی کریم ﷺ، آپ کے روحانی فرزند حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے کرام سے متعارف کرایا۔ انہوں نے ہمیں قرآن کریم پڑھایا اور ہر قدم پر ہمیں اچھی باتوں کی تلقین کی۔ اباجی اکثر کہا کرتے تھے اگر والدین اپنی پہلی اولاد کی پرورش ٹھیک طور پر کریں تو وہ چھوٹے بچوں کیلئے نمونہ ہوتی ہے۔

مشعل راہ بھائی

بھائی جان سلام ہمارے لئے مشعل راہ تھے۔ سب پیار و محبت سے رہتے۔ اپنے اپنے کام سے مقصد' وقت پر سونا' وقت پر جاگنا۔ وقت پر نماز کی ادائیگی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملتی۔ یہ خاص وصف اباجی نے ہی ذہن میں ڈالا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر اپنی جگہ پر رکھی ہوئی چیز اندھیرے میں بھی تلاش کرو تو مل جائے گی۔ اس پر عمل بھائی جان کا مجھے یوں یاد ہے۔ لاہور ہوسٹل میں تھے وہاں سے لکھا کرتے تھے کہ میری الماری میں فلاں جگہ پر میری کتاب موجود ہو گی وہ مجھے بھجوا دیں۔ اس طرح کوئی بھی وقت نہیں ہوتی تھی۔

پھلوں کا تحفہ اور بہن بھائیوں کی محبت

اباجی دفتر سے واپسی پر ہر موسم کا پھل ضرور خرید کر لایا کرتے تھے اور وہ ہم سب میں برابر کا بانٹ دیتے تھے۔ ہم سب خاموشی سے ایک دوسرے سے اتفاق کر کے اپنے حصہ سے کچھ نکال کر بھائی جان کی پلیٹ میں رکھ آتے۔ وہ بولتے تو نہیں تھے۔ لیکن ہمارے اس ایثار کو دیکھ کر مسکراتے اور کبھی کہہ بھی دیتے کہ تم اپنا اپنا حصہ کھاؤ۔

لیکن ہماری خوشی کی انتہا یہی تھی کہ انہیں زیادہ حصہ ملے۔ دل میں شاید یہ بات ہوتی تھی کہ یہ پڑھتے زیادہ ہیں۔ بہن ہونے کے ناطہ میری محبت اس رنگ میں ہوتی۔ میں فارغ وقت میں خربوزہ کے بیج کی گریاں نکال کر ان کی مٹھی میں دے آتی۔ وہ ایک بار ہی منہ میں ڈال لیتے اور میں خوش ہو جاتی۔

تازہ مچھلی

میں اب سوچتی ہوں ان کیلئے یا شاید سب ہی ایسا کرتے ہوں گے۔ دل میں ایک تمنا اور خواہش ہوتی تھی کہ ہم اپنے اپنے رنگ میں ان سے اظہار محبت کریں۔ ملتان میں ہمارے گھر کے قریب ایک چھوٹی نہر بہا کرتی تھی اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتیں۔ میرے چھوٹے بھائی ایک چادر لے جاتے اور پانی چھان کر مچھلیاں ایک برتن میں جمع کرتے جاتے۔ جب کافی ساری ہو جاتیں تو غالباً وزن میں آدھ سیر سے بھی کم ہوتی ہونگی گھر لے آتے۔ انہیں صاف کر کے فرائی کر کے ہم اپنے بھائی جان کو تازہ مچھلی پیش کرتے۔ حالانکہ مچھلی تو بازار سے بھی آسکتی تھی۔ لیکن بھائیوں کی اپنی ہی محبت تھی۔ جو خاموش رنگ میں ہوتی تھی۔

پہلا انعام

جب وہ چھوٹے بچے تھے تو ان کو اچھی صحت والے پیارے بچہ کے طور پر چاندی کا خوبصورت چھوٹا سا گلاس ملا تھا۔ اس کے بعد ہر کامیابی پر اللہ تعالیٰ نے گویا کہ ان کیلئے انعامات لکھ ہی رکھے تھے۔ جس کے لئے والدین اور ہم سب اپنے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔

پڑھنے لکھنے کا طریقہ اور معلومات

بھائی جان کی زندگی کا محور تعلیم سے شغف ہوتا تھا۔ اس لئے بے کار باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اور تعلیم کی طرف ہی بھرپور توجہ ہوتی تھی۔ ہمارے اباجی کا معمول تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اکثر بھائی جان کے سکول ضرور جاتے۔ بھائی جان اور باقی بچوں کی تعلیمی رپورٹ دریافت کرتے کہ کسی کی تعلیم میں کوئی کمی تو نہیں آ رہی۔ لیکن وہاں تو ان کے اساتذہ کرام کی طرف سے رپورٹ یہ ہوتی کہ جو سبق ہم نے پڑھانا ہوتا ہے وہ تو سلام کو ازبر ہوتا ہے۔ بلکہ بلیک بورڈ پر کلاس کو سوال بھی وہی سمجھاتے ہیں۔

گھر میں ان کا ٹائم ٹیبل کچھ یوں ہوتا تھا۔ صبح اٹھے، نماز، قرآن کریم کی تلاوت کے بعد ناشتہ کرنا۔ گھر کے دھلے استری سے بے نیاز کپڑے پہنے بستہ بغل میں دبانا اور سب کو خدا حافظ السلام علیکم کہہ کر (جب تک سائیکل نہیں خریدا تھا) پیدل سکول چلے جاتے۔ رستہ میں کوئی ہم کلاس مل گیا تو پہاڑے یاد کرتے ہوئے سکول جا پہنچتے۔ سادگی، عاجزی اور اطاعت کا دخل ان کی زندگی میں بہت تھا۔ لکھنے اور پڑھنے میں ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ ایک طرف میز پر کتابیں ایک طرف کاپیاں، پنسل، سلیٹ سلیٹی، ہمارے بچپن میں سکول میں ہولڈر اور نب، قلم، دوات اور تختی ہوا کرتی تھیں۔ جس سے سب بچے لکھا کرتے تھے۔ قلم سے ہی تختی پر خوشخطی کی مشق کرائی جاتی تھی۔

رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی جاگنا

ذہن میں یہ عادت ڈال دی گئی تھی کہ رات کو جلدی سو جانا ہے اور صبح اذان کے ساتھ ہی اٹھنا ہے۔ لیکن بھائی جان تو سب سے پہلے جاگ کر اپنے کمرہ میں پڑھ رہے ہوتے تھے۔ یہ ان کا معمول ہی دیکھا۔ چھٹی کے دن بھی نہیں سویا کرتے تھے۔

چھوٹوں کی مدد

چھوٹے بہن بھائیوں نے اپنا کوئی کام سکول کا کرنا ہوتا جو نہیں آتا تھا ان کے پاس لے جاتے تو وہ کہا کرتے خود کر کے لاؤ۔ جو غلط ہو گا میں کرا دوں گا۔ اس طرح سے اپنے دماغ سے کام کرنے کی عادت ہو جاتی تھی۔

بچپن کے پسندیدہ کھیل

مٹی کے چھوٹے چھوٹے سپاہی بنانے اور ان کے ہاتھ میں تنکا پکڑا دینا۔ مٹی گوندھنا اور ایک انگلی کے برابر سپاہی بنانا یہ میرے ذمہ ہوتا تھا۔ ایک طرف ان کی فوج اور دوسری طرح میری فوج وہ اپنے سپاہی میری طرف کے سپاہی سے لڑا کر خود جیت جاتے۔ اور خوش ہوتے کہ وہ جیت گئے ہیں۔ لیکن اس کھیل میں زیادہ وقت نہیں صرف ہوتا تھا۔ اس طرح دماغ کو آرام دینا مقصد ہوتا ہوگا۔

ایک بار تریموں ہیڈ کا مٹی کا بہت خوبصورت ڈیزائن بنایا۔ چند دن پہلے تریموں کا پل دیکھ آئے تھے۔ اباجی انہیں اکثر سیر کیلئے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ رستہ میں پل گاڑی اور مختلف چیزیں دکھاتے جاتے تھے تاکہ ان کے علم میں اضافہ ہو۔ یہ پیاری پیاری اور چھوٹی چھوٹی کھیلیں تھیں۔ جو کبھی کبھار ہم سب مل کر کھیل لیتے تھے اس میں خوشی اور محبت کا رنگ تھا۔ اس طرح ہمارا بچپن ختم ہوا۔

شخصیت کا کھلنا

میٹرک کا رزلٹ آیا۔ وہ اس وقت گھر سے باہر تھے۔ جیسے ہی لوگوں نے انہیں دیکھا۔ تو انہیں کندھوں پر اٹھالیا۔ یہ چھوٹے سے شہر میں مسلمان بچہ اتنے زیادہ نمبر حاصل کر کے پرانا ریکارڈ توڑ گیا ہے۔ (ہندو لالے) باوجود متعصب ہونے کے بھائی جان کو بار بار پیار کر کے اپنے تحفے اور خوشی منا رہے تھے۔ جھنگ شہر میں یہ خبر اتنی جلدی پھیلی کہ فوٹو گرافر خود ہی ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ایک خوشی اور مسرت کا سا سماں تھا۔ والدین شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔ بھائی جان اس وقت دبلے پتلے نوجوان تھے۔ فوٹو گرافر نے فوٹو لیں۔ کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر کلاہ والی پگڑی تھی۔ فوٹو اس وقت کے مختلف اخباروں میں چھپ گئیں۔ بلکہ پنجاب کتاب گھر لاہور پبلشر نے تو ایک صفحہ پر بھائی جان کی فوٹو اور دوسرے صفحہ پر چار دوسرے پوزیشن لینے والے لڑکوں کی جن میں ہندو بھی تھے چھاپیں اور لفافے بنا کر کتابیں ڈال کر طالبعلموں کو دیتے۔ ہر ایک کا خوشی کا انداز اپنا اپنا تھا۔

عزیزوں سے ملاقات کا اعزاز

ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ڈاکٹر محمد عبدالقادر ملتان میں رہائش رکھتے تھے۔ صرف ہمیں ملنے کیلئے (وہ جب بھی پاکستان آئے ہوتے تھے) تو ملتان کا پروگرام ضرور رکھتے۔ چند گھنٹہ میں وہ ہم سب سے ملتے۔ (ہم اپنی بڑی بہن کے گھر جمع ہوتے تھے) احباب جماعت اور ابا جی کے ملنے والے دوستوں سے ملاقات کرتے۔ دعائیں لیتے اور اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ان کا زیادہ وقت سفر میں گزرتا۔ ان کی محبت اور دریا دلی کی ایک زندہ مثال تھی کہ ہمیں ملے بغیر وہ کبھی بھی پاکستان سے واپس نہ جاتے۔ ہم ان کی اس محبت سے اتنے خوش ہوتے کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔

انکساری اور کام سے لگن

ایک دفعہ ملتان آئے تو میرے میاں ملک بشیر احمد صاحب کو بتایا کہ میرے پیٹ میں ہلکا سا درد محسوس ہوتا رہتا ہے۔ میں ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب سے چیک اپ کرانا چاہتا ہوں۔ ملک بشیر احمد صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کیا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں خود آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ آپ ڈاکٹر سلام صاحب کو لے کر نہ آئیں۔ لیکن آپ اس وقت خود نشتر ہسپتال ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ اپنڈکس کا خدشہ ہے۔ کہنے لگے کہ اب تو میرے پاس وقت نہیں۔ لندن جا کر دیکھوں گا کام سے لگن اور انکساری کا عجب امتزاج تھا۔

اپنی ذات کی کوئی فکر نہ تھی

آپ درویش صفت پاک و صاف انسان تھے۔ کراچی آئے ہوئے تھے تو ان کی روانگی سے پہلے ایک بہت ہی قریبی عزیز نے کہا حالات ٹھیک نہیں لوگ مخالفت میں کئی کام کر جاتے ہیں جو تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ آپ کے بکس کو تالا نہیں لگا ہوتا۔ کنڈے تو کھل

بھی سکتے ہیں۔ اس وقت تو اس عزیز کی بات کو خاموشی سے سن لیا۔ ایئرپورٹ پہنچ کر سامان لے جانے والے ذمہ دار افسر کو کہا کہ بھائی میرا بکس بند نہیں ہوتا دیکھ لیا کرو کہ کوئی غلط رنگ میں کام نہ ہو جائے۔ اور میں بدنام ہو جاؤں۔

عفو و درگزر

اپنی بیماری سے پہلے دورہ پر سنگاپور گئے۔ سامان میں ایک بکس تو ہوتا تھا۔ وہ بھی اٹامک انرجی کی گاڑی میں ہی رکھا ہوتا کہ جلدی ائرپورٹ جانا ہوتا تھا چند گھنٹہ کا قیام۔ گھر آئے' کھانا کھایا اور کوئی ملنے آگئے۔ تو مختصر سی ملاقات' سب کا حال دریافت کرنا' پھر روانگی' یہ سفر اسلام آباد' لاہور کراچی اور پھر سنگاپور کا تھا۔ سنگاپور خود تو بخیریت پہنچ گئے لیکن بکس لاہور سے کراچی کیلئے نہ رکھا گیا۔ اس کی بجائے کسی اور کا بکس آگیا۔ جو سنگاپور بھی پہنچ گیا۔ سنگاپور ریسٹ ہاؤس سے فون آیا کہ میرا بکس میرے ساتھ نہیں آیا۔ میرے کپڑے اور ضروری کاغذات جنکی مجھے یہاں ضرورت ہے وہ اس میں ہیں اور وہ لاہور ہی رہ گیا ہے۔ لاہور رابطہ کریں کہ وہ اگلے جہاز پر میرا سامان سنگاپور بھجوا دیں۔

جہاز والوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کپڑے نئے خرید لیں بل ہم ادا کریں گے۔ ہم جلدی آپ کا سامان سنگاپور بھجوا دیں گے۔ ان کی طرف سے کیا ہی پیارا اور صاف ستھرا جواب انہیں ملا کہ کپڑوں کی مجھے ضرورت نہیں اور نہ ہی میں یہاں سے خریدونگا۔ میرے کاغذات ضروری ہیں وہ مجھے جلدی مطلوب ہیں خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ جلدی لاہور سے وہ بکس کراچی آیا اور کراچی سے سنگاپور روانہ کرا دیا گیا۔ لندن پہنچ کر مجھے خط لکھا کہ تمہاری طرف سے مجھے فون پر جواب ملتا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا سامان خدا کے فضل سے ضائع نہیں ہوگا تو مجھے تسلی ہو جاتی۔ اتنی پریشانی کے بعد بھی کسی سے بازپرس نہیں کی۔ کہ کس کی غلطی سے سامان جہاز میں نہیں رکھا گیا۔

وقت بچانے کا سادہ طریقہ

سردی ہو یا گرمی ایک بڑا سا کوٹ زیب تن ہوتا تھا۔ اس کی اندر کی جیب میں چھوٹے سائز کا ترجمہ قرآن کریم۔ دعاؤں کی کتاب' پاسپورٹ' کاغذات اوپر سامنے کی جیب میں لاتعداد پن موجود ہوتے۔ غالباً ان کے وزن کے برابر کا کوٹ تھا۔ ایک بار جانے لگے تو وہ کوٹ میں نے ہی ان کو پہنایا اور بے تکلفی سے پوچھا کہ آپ اتنا وزن کیوں اٹھاتے ہیں۔ فالتو چیزیں بکس میں رکھ لیں۔ فرمایا یہ ضرورت کا سامان ہوتا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہوتا کہ بار بار بکس سے نکالوں۔

امام جماعت اور مرکز سے محبت

جب بھی پاکستان آئے تو ربوہ کا پروگرام لازمی ہوتا تھا۔ مقصد صرف حضرت امام جماعت سے ملاقات اور بزرگوں سے ملاقات' بزرگوں کے مرقد پر دعاؤں کیلئے جانا' تھوڑے وقت میں سب عزیزوں سے ملاقات' کسی کو کبھی گلہ نہیں ہوتا تھا کہ مجھے نہیں ملے۔

کتابوں سے لگاؤ اور خریداری

پاکستان میں آمد پر ایک ضروری امر یہ ہوتا تھا کہ وہ تقریباً جہاں بھی جاتے مختلف کتابیں ضرور خریدتے اگر خود نہ لے جاسکتے تھے تو بعد میں پارسل کے ذریعہ پہنچ جاتیں کسی پر بار نہیں ہوتا تھا کہ کوئی آئے تو لیتا آئے۔ کسی پر بوجھ ڈالنا تو عادت نہ تھی۔ بک سیلرز خود ہی پارسل کرتے تھے۔ اکثر کتابیں اٹلی لے جاتے تھے۔ لندن میں آپ کا گھر حقیقتاً کتابوں سے ہی سجا ہوا ہے۔ کمرہ میں کئی شیلف نہایت سلیقہ سے کتابوں سے ترتیب سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن میں ایک بہت بڑا حصہ مختلف ممالک سے لائے ہوئے قرآن کریم سے بھی مزین کیا ہوا ہے۔

دیسی عطر کا شوق

دیسی عطر خریدنے کا بہت شوق تھا۔ جو کراچی سے ضرور خرید کر

ساتھ لے جاتے تھے۔ وہاں لوگوں کو تحفہ دیا کرتے تھے۔

نوبل انعام پانے کے بعد پاکستان آنا اور واپسی پر مصروفیات

نوبل انعام پانے کے بعد محترمہ بھابی جان کے ساتھ پاکستان آئے۔ ہم سب کو اپنا انعامی تمغہ دکھایا۔ ربوہ اور دیگر شہروں میں گئے۔ تقریبات میں شامل ہوئے۔ تقریریں کیں۔ شدید تھکاوٹ بھی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ کے احسانوں پر شکر بھی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے گلے میں میں نے گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالنا چاہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ پہلے اپنی بھابی جان کے گلے میں ڈالو۔ انہیں یہ احساس رہا کہ بھابی جان کی خوشی مقدم ہے۔ واپس لندن جاکر خط لکھا کہ اس یادگار دورہ کی دلکش یادیں دل میں لے کر گیا ہوں۔ الحمدللہ۔ اس کے بعد دنیا بھر میں دورے کئے۔ اور اپنی مساعی میں اضافہ کر دیا۔ انعام ملنے سے جو توقیر ہوئی تھی۔ آپ کی خوشی اور کوشش یہ تھی کہ اس کے ذریعہ تیسری دنیا بالخصوص اسلامی ممالک میں سائنسی ترقی کیلئے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں وقت کا فرق اور ہوائی جہاز کا سفر آپ کے جسم پر بہت بار ڈالتا تھا۔ لیکن آپ نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ غالباً سفر ہی ایک ایسا وقت ہوتا تھا جس میں آپ اپنی کھوئی ہوئی نیند کا کچھ حصہ حاصل کر لیتے۔ اس غریب صفت درویش کی بس یہ تمنا تھی کہ غریب انسانیت بھی سائنس کے پھل کھائے اور اپنی حالت بہتر بنائے۔ اس مقصد کیلئے آپ ملک ملک جاتے۔ غریبوں کو سائنس کی اہمیت کا احساس دلاتے اور شہنشاہ مزاج فرمانرواؤں کو آمادہ کرتے کہ اس میدان میں بھی کچھ اپنے خزانے کھولیں۔ لیکن غرباء کیلئے سائنسی جہاد کی راہ میں قدم قدم پر آپ کو تعصبات اور جہالت کے عفریتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ جس کا آپ کو بہت ملال تھا۔

ایک جذباتی واقعہ

جس کی یاد کا احساس مجھے کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ شدید بیماری میں وہیل چیئر پر ہی کویت آئے ہوئے تھے۔ وہاں کا دورہ لازمی ہوگا۔ ایک صحافی یہاں سے کویت گئے۔ انہوں نے فون پر مجھ سے دریافت کیا کہ میں آپ کے بھائی جان کے پاس جا رہا ہوں کوئی پیغام۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا محبت بھرا سلام ہی انہیں پہنچا دیں۔ کویت سے واپسی پر صحافی صاحب کا فون آیا اور وہ بتانے لگے کہ تقریریں ختم ہونے کے بعد میں سٹیج پر انہیں ملا اور آپ کا سلام انہیں پہنچایا تو سنتے ہی بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ میرا بھی اس کو سلام کہہ دینا۔ ان صحافی کا بیان ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کے دل میں کیا کیا جذبات آئے ہوں گے۔ میں بھی بھائی ہوں لیکن ایسا منظر تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

❀

محو ہوگی نہ کبھی دل سے محبت تیری

ڈاکٹر عبدالسلام ــــ میرا بھائی

(مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب - لاہور)

ہوش سنبھالنے سے لیکر ان کی وفات سے چند سال قبل تک مجھے ان کے ساتھ رہنے اور انہیں بہت قریب سے دیکھنے کے کئی مواقع ملے۔ آخر وہ ایک فعال اور بھرپور زندگی گزار کر اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جو نصرت الٰہی کے جلوؤں اور ذرہ نوازیوں سے بھری پڑی ہے۔ ان کے واقعات' کارہائے نمایاں اور اقوال کو ایک مختصر سے مضمون میں بیان کرنا ایک مشکل کام ہے تاہم میں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ وہ بشارت الٰہی کے تحت پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد ایک راجپوت خاندان کے شہزادہ تھے جنہوں نے حضرت بہاؤ الحق زکریا کے ہاتھوں دین الٰہی قبول کیا اور پھر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے نانا جان حضرت حافظ نبی بخش صاحب ان معدودے چند احباب میں سے تھے جنہیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دعویٰ سے قریباً دس برس قبل آپ کی پاک صحبت نصیب ہوئی۔ ان کے ماموں حضرت حکیم فضل الرحمٰن صاحب کو مغربی افریقہ میں قریباً ربع صدی تک بطور مربی انچارج خدمت کی توفیق ملی۔ ان کے تایا جان حضرت چوہدری غلام حسین صاحب جو ان کے خسر بھی تھے کو متعدد جماعتوں کے بطور امیر خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے والد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے حضرت خلیفة المسیح الاول کی وفات سے ۱۴ روز پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی بعد میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ جماعت احمدیہ ضلع ملتان کے کئی سال امیر رہے۔ ان کی والدہ ماجدہ ایک خدا ترس اور دعا گو خاتون تھیں۔ ایک دفعہ بچپن میں بھائی جان نے غلطی سے چوہے مارنے والی زہریلی گولیاں کھالیں جو تھوڑی دیر بعد قے کے ذریعے خارج ہو گئیں والدین نے جب انہیں قے کرتے دیکھا تو ان سے پوچھا کہ "سلام تم نے کیا کھایا تھا" انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ "ابا میں نے آپ کے سائیکل کے تھیلہ سے پھلیاں نکال کر کھائی تھیں" یہ سنتے ہی والد صاحب انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے ان کے معدہ کو صاف کیا اس طرح اللہ نے انہیں نئی زندگی دی۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

جھنگ شہر میں ایک ہمارا آبائی مکان ہے جسے بھائی جان نے نوبل انعام ملنے کے بعد ۱۹۷۹ء میں حکومت پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کو "ان ہاؤس" میوزیم بنانے کیلئے دے دیا تھا۔ دوسرا مکان ہمارے والد صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔ جس میں تین کمرے' ایک بیٹھک' ایک سٹور اور ایک برآمدہ ہے کمروں کے سامنے ایک کشادہ صحن ہے۔ ایک کمرہ میں ٹرنک اور دوسرا گھریلو سامان رکھا ہوتا تھا۔ بھائی جان اسی کمرہ میں پڑھائی کرتے اور سوتے بھی تھے۔ ان کی چارپائی کے ساتھ ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر وہ اپنی کتابیں وغیرہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان دنوں جھنگ میں بجلی نہیں تھی اس لئے وہ مٹی کے تیل کے لیمپ میں پڑھتے تھے۔ لیمپ کی چمنی ہماری بڑی ہمشیرگان محترمہ باجی مسعود بیگم صاحبہ مرحومہ اور باجی حمیدہ بیگم صاحبہ روزانہ صاف کرتیں تھیں جب کہ مجھ سے بڑے بھائی محترم چوہدری محمد عبدالسمیع صاحب اور میں لیمپ میں تیل ڈالا کرتے تھے۔ بھائی جان رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔ وہ زیادہ تر پڑھائی صبح کیا کرتے کیونکہ اس وقت ہر طرف خاموشی ہوتی جس سے انہیں یک سوئی میسر آتی۔ باجی مسعودہ صاحبہ انہیں صبح ۴ بجے جگا دیا کرتی تھیں بلکہ اکثر وہ سب سے پہلے جاگے ہوئے ہوتے تھے۔ گرمی کے موسم میں وہ پڑھائی بیٹھک میں کیا کرتے تھے کیونکہ اس کے دو طرف گلیاں ہونے کی وجہ سے ہوادار تھی وہ اپنا

کورس امتحان سے کم از کم دو ماہ قبل مکمل کر لیتے تھے اور امتحان سے پہلے اسے دو مرتبہ دوہرا لیا کرتے۔

جس روز میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا بھائی جان اس دن حضرت والد صاحب کے پاس ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت والد صاحب کو معلوم ہو گیا تھا اس دن نتیجہ آنے والا ہے لہٰذا انہوں نے اپنے دفتر کے ایک آدمی کو گھیانہ ریلوے اسٹیشن نتیجہ کا گزٹ لینے کیلئے بھجوایا۔ جب وہ گزٹ لے کر آیا تو اس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا کہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ کے طالبعلم عبد السلام رولنمبر 14888 نے صوبہ بھر میں اول پوزیشن لی ہے۔ ان کے نمبر 765/850 تھے۔ ان سے پچھلے سال اول آنے والے لڑکے نے 737 نمبر لئے تھے اس طرح بھائی جان نے پچھلے سال کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں بھائی جان نے بتایا کہ

"نتیجہ سے ایک روز پہلے میں ایک حجام کی دکان پر اپنے بال کٹوانے گیا تو اس نے مجھے اپنے ایک شاگرد کے حوالے کر دیا جس نے میرے بال کاٹتے کاٹتے اتنے چھوٹے کر دیئے کہ "میری ٹنڈ" نکل آئی۔ جسے چھپانے کیلئے میں نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ نتیجہ سنتے ہی میں اپنے سائیکل پر سوار ہو کر جھنگ شہر کی طرف چل پڑا جو گھیانہ سے دو اڑھائی میل دور تھا اسی اثنا میں ان کے فرسٹ آنے کی خبر پورے جھنگ شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مزید بتایا کہ "جب میں جھنگ پہنچا تو مجھے ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک جانا تھا جھنگ میں کل چار دروازے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تمام دکاندار جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے میرے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ حالانکہ وہ دوپہر کا وقت تھا جب اکثر لوگ دوکانیں بند کر کے ستاتے ہیں" انہوں نے مزید بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی میں میرا فرسٹ آنا ہندوؤں اور سکھوں کیلئے ایک عجوبہ تھا کیونکہ ہمیشہ سے ہندو یا سکھ لڑکے پنجاب یونیورسٹی میں اول آتے تھے۔ اس لئے لاہور کے ڈی اے۔ وی سکول جو خالصتاً ایک ہندو سکول تھا کے استادوں نے مجھے دیکھنے کیلئے چند آدمی جھنگ شہر بھجوائے تھے۔"

ایف۔ اے کا امتحان بھی انہوں نے ۱۹۴۲ء میں انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ سے پاس کیا اس امتحان میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ "میرا کالج جھنگ اور گھیانہ کے درمیان تھا اس لئے اس جگہ کو "آدھی وال" کہتے ہیں یہ جگہ جھنگ شہر سے قریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ گرمیوں کے موسم میں سخت گرمی سے بچنے کیلئے میں کالج میں ہی بیٹھ کر اپنا "ہوم ورک" ختم کر لیا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جھنگ شہر کے میرے ہم جماعت بھی میرے پاس بیٹھ جاتے اور میرے کام کو نقل کر لیا کرتے تھے۔ جب سائے ڈھل جاتے تو ہم پیدل اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔

انہیں کالج کے میگزین "چناب" کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا بتاتے تھے کہ میگزین کی ایڈیٹنگ کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کالج میگزین میں ایک تحقیقی مضمون بعنوان "اسد اللہ غالب نے اسد سے غالب کب تخلص اختیار کیا" شائع کیا تھا جسے بعد میں رسالہ "ادبی دنیا" نے بھی شائع کیا تھا۔

۱۹۴۲ء میں آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ آپ کے مضامین ریاضی اے، اینڈ بی کورس۔ انگلش آنرز انگریزی اور غیر اختیاری اردو تھے۔ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور کی سٹوڈنٹس یونین کا دو سال کے لئے صدر منتخب کیا گیا اور ساتھ ہی انہیں کالج کے میگزین "راوی" کا چیف ایڈیٹر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ میٹرک اور ایف۔ اے میں صوبہ بھر میں اول آنے کی وجہ سے ہندوؤں کو بڑی فکر ہوئی۔ چنانچہ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کے چند استادوں نے اپنے کالج کے ایک لائق طالبعلم کو بھائی جان کے مقابل پر بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کروانا شروع کر دی تاکہ عبد السلام یونیورسٹی میں اول نہ آئے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھائی جان بی۔ اے میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے۔ دوم اور سوم آنے والے لڑکے بھی مسلمان تھے جب کہ وہ ہندو لڑکا ساتویں یا آٹھویں پوزیشن پر آیا تھا۔ بی۔ اے کے امتحان میں بھائی جان نے 451/500 نمبر لیکر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جو آج تک ہے۔

۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے ایم۔ اے ریاضی 573/600 نمبر لیکر پاس کیا اور ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی میں اول آئے۔

جب آپ کیمبرج میں پڑھتے تھے تو کیمبرج کے امتحان کی ایک

BY AIR MAIL

AIR LETTER

IF ANYTHING IS ENCLOSED, THIS LETTER WILL BE SENT BY ORDINARY MAIL.

CAMBRIDGE 3.45PM 6 APR 1950

THE INTERNATIONAL STAMP

6d POSTAGE

Ch. Abdul Hamid Khan (1st year class)
c/o Ch. Muhammad Hassan Sahib,
Inspector of Schools office,
Multan City
Punjab. Pakistan

First fold here

Sender's name and address:-
Abdus Salam
St John's College
Cambridge

To open cut here

St John's College

۶ اپریل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزم حمید خان ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابا جان کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کا امتحان ۱۸ اپریل کو شروع ہو رہا ہے ۔ میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو شاباش کہوں اور آپ کی ہمت کچھ بڑھاؤں کہ آپ کوشش کریں کہ اس بار کم از کم آپ کا نمبر سب سے آگے ہو ۔ شاید یہ خط آپ کو ۱۲/۱۳ کے قریب ملے گا ۔ جب امتحان کو چار دن رہ گئے ہوں گے اور آپ کی تیاری پوری ہو چکی ہو گی ۔ اگر تیاری اچھی خواہ نہ بھی ہوئی ہو تو بھی آپ گھبرائیں نہیں ۔ امتحان صرف تیاری پر منحصر ہوتے ہیں اس کے علاوہ keeping your wits about you پر بھی انحصار رکھتے ہیں ۔ جو چیزیں آپ کو بہت اچھی طرح آتی ہوں ۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانا امتحان میں ضروری ہوتا ہے ۔ میں اور سب لوگ آپ کے لئے دعا کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے ۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک خط جو کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب کو لکھا ۔

آپ کو شاید اس وقت تو یہ مضمون حساب، فزکس

کیمسٹری chemistry وغیرہ بے کار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن

یہ یاد رکھیں کہ ان میں top پر رہنے میں

دو point ہوتے ہیں۔

① اگر آپ ان مضمونوں میں بہتر سے بہتر نتیجہ دکھائیں

تو اگرچہ آپ کی ان میں دلچسپی نہ بھی ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

آپ محنت کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے کہ آپ ذہین ہیں۔

زندگی میں کامیابی محنت اور ذہانت سے ہے۔ ایک

معمولی کلرک بن جانا۔ یا معمولی دکاندار بن جانا یا معمولی

mechanic بن جانا شاید یا آپ کو خوش نہیں کر سکتا۔

زندگی ambition کا نام ہے۔ اور وہ ambition

[illegible] سب سے چھوٹی عمر میں ہو۔ جس شخص کی زندگی

میں ambition نہیں وہ مردہ ہے۔ ماں باپ

فلاں قسم کے کام میں آ سکتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنی زندگی خود

بنانی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر میں انسان کو احساس نہیں

ہوتا کہ وقت کس طرح خرچ کرنا چاہئے۔ زندگی

بھر میں کون سی چیزیں کام آئیں گی۔ لیکن محنت کی

عادت ایسی چیز ہے کہ اگر ایک بار پڑ جائے

تو کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔ محنت کرنا

کوئی آسان چیز نہیں۔ بہت کڑوی چیز ہے۔

[illegible] یہ نصیحت ہے۔ اگر [illegible] کر ہے

ڈاکٹر صاحب کے خط کا متن ہدیہ قارئین ہے۔

عزیزم حمید خان السلام علیکم ورحمہ اللہ

ابا جان کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کا امتحان ۱۸ اپریل کو شروع ہے میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو شاباش کہوں اور آپ کی ہمت بڑھاؤں کہ آپ کوشش کریں کہ اس بار کم از کم آپ کا نمبر سب سے آگے ہو۔ شاید یہ خط آپ کو 12/13 کے قریب ملے گا۔ جب امتحان 5 چار دن رہ گیا ہو گا اور آپ کی تیاری ہو چکی ہو گی۔ اگر تیاری خواہ نہ بھی ہوئی ہو تو بھی آپ گھبرائیں نہیں امتحان جہاں تیاری پر منحصر ہوتے ہیں اس کے علاوہ Keeping your wits about you پر بھی انحصار رکھتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کو بہت اچھی طرح آتی ہوں ان سے پورا فائدہ اٹھانا امتحان میں ضروری ہوتا ہے۔ میں اور سب لوگ آپ کے لئے دعائیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی بخشے۔

آپ کو شاید اس وقت تو یہ مضمون حساب فزکس Chemistry وغیرہ بے کار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ ان میں TOP پر رہنے میں دو Point ہوتے ہیں۔

1۔ اگر آپ ان مضمونوں میں بہتر سے بہتر نتیجہ دکھائیں تو اگرچہ آپ کی ان میں دلچسپی نہ بھی ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ محنت کر سکتے ہیں اور دوسرے آپ ذہین ہیں۔ زندگی میں کامیابی محنت اور ذہانت سے ہے۔ ایک معمولی کلرک بن جانا یا معمولی دکاندار بن جانا یا معمولی Mechanic بن جانا ہمیں یا آپ کو خوش نہیں کر سکتا۔ زندگی Ambiton کا نام ہے اور وہ Ambition کیا ہے۔ سب سے چوٹی پر رہنا۔ جس شخص کی رندگی میں Ambiton نہیں وہ مردہ ہے۔ ماں باپ بھائی کسی کے کام نہیں آسکتے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی خود بنانی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر میں انسان کو احساس نہیں ہوتا کہ وقت کس طرح خرچ کرنا چاہئے۔ زندگی بھر میں کونسی چیزیں کام آئیں گی۔ لیکن محنت کی عادت ایسی چیز ہے کہ ایک بار پڑ جائے تو کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔ محنت کرنا کوئی آسان چیز نہیں۔ بہت کڑوی چیز ہے۔

(جی کہتا ہے) کہ یہ مصیبت ہے۔ لوگ مزے کر رہے ہیں۔ یاد رکھیں جو لوگ اس عمر میں مزے کرتے ہیں وہ ساری عمر روتے رہتے ہیں۔ مزے کرنے کا بھی وقت ہو اور کام کرنے کا بھی وقت ہو تو زندگی حسین ہوتی ہے۔ آپ کا مطمع نظر یہ ہونا چاہئے کہ آپ رات کو جب سوئیں تو سونے سے پہلے یہ سوچیں کہ کیا آپ کا دن اچھا گذرا ہے۔ پڑھنے کے وقت آپ پڑھے ہیں۔ کھیلنے کے وقت کھیلے ہیں۔ یاد رکھیں ہم بہت غریب ہیں۔ ہمارے پاس سوائے محنت اور ذہانت کے کچھ نہیں کہ ہم اونچے چڑھ سکیں۔ گھر میں ننھوں سے لڑنا یا ناراض ہونا زندگی کا نام نہیں۔ آپ کے سامنے ہزاروں میدان ہیں آپ محنت کریں تو کل Prime Minstar ہو سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑے (سیٹھ بن سکتے ہیں) بڑے سے بڑے Mechanic ہو سکتے ہیں۔ ایک بار عزم کریں اور پھر محنت۔ اس وقت آپ کے سامنے Studies کا میدان ہے۔ آپ یقیناً اس قابل ہیں کہ آپ سب کو پیچھے چھوڑ سکیں۔ اگر پہلے وقت ضائع ہو گیا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ عزم کے ساتھ کیا ہوا دو دن کا کام لوگوں کے مہینوں کے کام سے بہتر ہوتا ہے۔

2۔ آپ کی تعلیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ریاضی، فزکس وغیرہ آج کی دنیا کی کلید ہیں۔ بجلی، موٹریں، انجینیئرنگ سب کچھ ریاضی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ لوہا کیسے بنتا ہے۔ یہ کاریں کیسے چلتی ہیں۔ آپ کی عمر کے بچے یہاں خود Radio Set اور کار بنا لیتے ہیں۔ آپ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ صرف چھوٹی چیزوں کا خیال چھوڑ دیں۔ بہت بڑی چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ کا رجحان کسی خاص طرف ہو تو مجھے لکھیں میں آپ کو کتابوں (کتابیں۔ ناقل) بھیجوں گا۔ لیکن اس وقت اللہ کا نام لے کر امتحان دیں اور اس میں اعلیٰ منزل پر پہنچیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ کوشش کریں کہ آپ کے والدین آپ سے خوش ہوں۔ آپ کی طبیعت میں کوئی چھوٹی چیز نہ ہو۔ والسلام۔ آپ کا بھائی (عبدالسلام)

بات مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ امتحان کے بعد انہوں نے حضرت والد صاحب کی خدمت میں کیمبرج سے خط لکھا تھا کہ ان کا تجرباتی فزکس کا پرچہ ٹھیک نہیں ہوا دعا کریں اللہ معجزانہ رنگ میں پاس کر دے ورنہ مجھے کوئی امید نہیں کہ میں یہ امتحان پاس کر سکوں لیکن جب نتیجہ نکلا تو وہ امتحان بھی انہوں نے فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ ایک مرتبہ میں نے بھائی جان سے یہ بات پوچھی کہ فزکس کا امتحان دینے کے بعد انہوں نے حضرت والد صاحب کی خدمت میں ایسا خط لکھا تھا اس کی کیا وجہ تھی جس پر انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا پریکٹیکل پورے دن کا تھا۔ سارا دن پریکٹیکل کرنے کے بعد جب انہوں نے نتائج جمع کرنے شروع کئے تو انہیں پتہ چلا کہ اپنے تجربہ کیلئے انہوں نے جو طریقہ کار اپنایا تھا وہ غلط تھا جس کی وجہ سے پریشان ہو کر وہ خط لکھا تھا۔ پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ باوجود اس بات کے کہ ان کا پریکٹیکل غلط ہو گیا تھا ان کی فرسٹ کلاس کیسے آگئی۔ فرمانے لگے کہ یہی تو دعاؤں کا معجزہ تھا۔ پھر بتایا کہ پریکٹیکل کے ساتھ تھیوری بھی پڑھنا پڑتی ہے میرے تھیوری کے پرچے خدا کے فضل سے اتنے اچھے ہوئے تھے کہ میرے پروفیسروں نے میرے پریکٹیکل کی غلطی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے پورے نمبر دے دیئے تھے۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دعا دیکھو تو

وہ ایک شفیق بھائی تھے۔ غالباً ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے کہ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کیلئے لاہور سے ملتان آئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں میری دائیں ران پر ایک پھوڑا نکل آیا جس سے مجھے بے حد تکلیف تھی۔ چنانچہ بھائی جان مجھے سائیکل پر بٹھا کر سول ہسپتال جو ہمارے گھر سے تقریباً دو میل دور تھا لے گئے۔ میرے پھوڑے کا اپریشن کروایا اور جب تک میرا زخم مندمل نہیں ہو گیا مجھے روزانہ مرہم پٹی کے لئے ہسپتال لے جاتے تھے۔

۱۹۵۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب وہ وطن واپس آئے تو انہوں نے کچھ عرصہ ملتان میں والدین کے پاس گزارا۔ کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناطے اور کچھ ان کی قابلیت کی وجہ سے میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک شدید احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ انہیں میری اس کیفیت کا احساس ہو گیا۔ ایک دن انہوں نے مجھے میز پر اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا کہ "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو" لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ انہوں نے دوبارہ کہا کہ "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو" لیکن میں پھر بھی ایسا نہ کر سکا۔ پھر انہوں نے گرج دار آواز میں کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ اس پر میں نے ہمت کر کے بمشکل دو یا تین سیکنڈ کے لئے ان کی طرف دیکھا جس کے بعد میرا وہ احساس کمتری جاتا رہا اور اس کے بعد حد ادب میں رہتے ہوئے میں ان سے کھل کر باتیں کر لیتا تھا۔ وہ اپنے استادوں کا بے حد ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر حضرت والد صاحب کو اپنے استادوں میں تقسیم کرنے کیلئے پیسے بھجوایا کرتے تھے۔ وہ جب بھی جھنگ تشریف لاتے تو اور استادوں کے علاوہ حضرت شیر افضل جعفری صاحب مرحوم کے دولت خانہ پر ضرور حاضری دیتے اور دیر تک ان سے نشست رہتی۔

بھائی جان کو اپنے والدین سے عشق تھا ان کی کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت والد صاحب کی آخری بیماری کی خبر سن کر نیویارک سے اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر کراچی پہنچے اور ان کی وفات تک ان کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بھائی جان ذہانت و فطانت وقار و تمکنت دانائی اور زبان آوری اور سخن فہمی میں خاص مقام رکھتے تھے اور استدلال ایسا کہ ان کے سامنے کوئی اپنی دلیل بازی کی جرات نہیں کرتا تھا۔ وہ حقیقت اور خوش فہمی کے فرق کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے اور مکمل طور پر حقیقت بین تھے۔ ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر رابرٹ والگیٹ نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ

"سلام ایک ایسا شخص ہے جس کی زندگی ولولہ جذبہ اور جوش سے بھری پڑی ہے اس کے سامنے کئی عقدے ہیں لیکن اس کے پاس وقت نہیں ہے دنیا کے لئے یہ انتہائی نقصان وہ بات ہے کہ اسے دوہری زندگی نہیں مل سکتی۔"

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سائنس دانوں کو ناز تھا اس پر

ہو گئے ڈاکٹر سلام بھی فوت
موت عالم ہے اک جہاں کی موت

جب بلایا رفیق اعلیٰ نے
پھر نہ کی دیر مرد دانا نے

ماہر علم طبیعات تھا وہ
کاشف رازِ کائنات تھا وہ

جب مرض نے اسے کیا مجبور
چلنے پھرنے سے ہو گیا معذور

کام کرتا رہا دماغ اس کا
جنگ میں روشن رہا چراغ اس کا

سائنس دانوں کو ناز تھا اس پر
اس پر عاشق تھے اسود و احمر

طاقتیں چار تھیں مدار حیات
اور انہیں پر تھا انحصار حیات

اس نے ثابت کیا کہ تین ہیں وہ
اثر انداز ہیں زمیں پہ جو

تین کو دو وہ کرنے والا تھا
فہم اس کا بہت ہی اعلیٰ تھا

دو کو پھر ایک ہی بنا دیتا
یہ کرامت بھی وہ دکھا دیتا

دو کو جب ایک کر دکھاتا وہ
راہ وحدانیت پہ لاتا وہ

پھر وہ کہتا کہ ایک ہی طاقت
حکمراں ہے یہاں بلا شرکت

نام ہے اس کا خالق اکبر
ہے وہی کائنات کا محور

ایک ہی طاقت عظیم ہے وہ
حی و قیوم ہے قدیم ہے وہ

اس نے ایسا عظیم کام کیا
جگ میں اونچا وطن کا نام کیا

بالیقیں یہ وہ کارنامہ ہے
معترف جس کا اک زمانہ ہے

کام اس کا جو ناتمام رہا
اس کو خالق کرے گا خود پورا

ایسا انساں بھی کوئی آئے گا
تین کو ایک کر دکھائے گا

(مکرم سلیم شاہجہانپوری صاحب)

آغاز کس طرح کروں اس داستان کا

آپ کے اہلِ خانہ ۔ بیگمات اور بچوں کے انٹرویوز

مکرمہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ اہلیہ صاحبہ ڈاکٹر صاحب (انٹرویو محترمہ ڈاکٹر امتہ الرشید صاحبہ ۔ تحریر و ترتیب محترمہ سعدیہ ایاز صاحبہ)

سوال:۔ سب سے پہلے آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی شادی ڈاکٹر صاحب سے کب ہوئی؟

جواب:۔ ہماری شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی۔ تو اس طرح تقریباً ۴۷ سال کا عرصہ مجھے ان کی رفاقت میں نصیب رہا۔

سوال:۔ آپ یہ بتائیں کہ جب ڈاکٹر صاحب گھر میں ہوتے تھے ویسے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مصروف زندگی گزارتے ہوں گے لیکن پھر بھی جتنا وقت وہ گھر میں گزارتے تھے آپ کا اور ان کا آپ کے ساتھ کیسا وقت گزرتا تھا۔

جواب:۔ آپ نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ ان کی زندگی اتنی مصروف تھی کہ اپنے کام کے سوا بہت کم کوئی چیز تھی جو ان کی توجہ اپنی طرف لیتی ہے۔ گھر میں وہ صبح بہت Early اٹھنے کے عادی تھے اور ہمیشہ ان کا اصول یہی رہا۔

شام کو جلدی سونے کا پروگرام ہوتا تھا اور صبح جلدی اٹھ کر تقریباً چار پانچ بجے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے اور اسی طرح کافی جلدی چھ سات بجے تک ان کی یہ روٹین تھی کہ تیار ہوئے ناشتہ کیا کالج کیلئے آٹھ بجے تک کالج جانے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ سارا دن ان کا کالج میں گزرتا تھا۔ شام کو آتے تھے کھانا کھایا اور اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کے لئے لیٹ جاتے تھے اور تھوڑا سا سونے کے بعد پھر اٹھ کے اپنے کام میں کبھی گیارہ بجے اٹھ کے اپنے کام میں مصروف ہیں کبھی دو بجے اٹھ کے مصروف ہیں یعنی پورا وقت ان کا، توجہ جو تھی اپنے کام کی طرف ہوا کرتی تھی۔ کھانے کے دوران بھی کھانے کا ٹائم جو ہوتا تھا اس میں بھی ان کا یہی دستور تھا کہ ہاتھ میں کاغذ قلم ساتھ ہی ہے۔ کاغذ نہیں تو قلم تو ضرور ہوتی تھی ان کی جیب میں اور اخبار ہے تو اخبار پر ہی لکھ رہے ہیں یا کوئی اور نیپکن ہے، پیپر نپکن اس پر لکھ رہے ہیں ہر وقت سوچ اور کام کئے جا رہے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا دستور رہا ہے ہمیشہ سے اور اپنے کام میں منہمک ہمیشہ رہے ہیں۔

سوال:۔ آپ نے ان کے ساتھ ایک بہت طویل عرصہ گزارا اس عرصہ کی کوئی خوشگوار یادیں بھی یقینی طور پر ہوں گی کچھ اگر اس وقت آپ کے ذہن میں ہوں تو بتائیں۔

جواب:۔ اس وقت اس بارہ میں کچھ کہنا ہے تو بہت مشکل ہے زندگی کا بہت سا وقت ہے وہ لوگوں کی بہت کم ہوتی ہے کیونکہ انہیں صرف اپنے کام کی دھن ہوتی ہے اس لئے کم موقعہ ہمیں ملتا تھا کہ ہم یعنی کسی قسم فیملی لائف یا سوشل لائف جس کو کہتے ہیں وہ چیز بہت کم ہوتی تھی۔ باہر آنا جانا سفر کی مصروفیات رہتی تھیں ان کی کہ فیملی لائف میں بہت کم ہی ٹائم ملا ہے کچھ کرنے کا۔ میں بھی اس چیز کو سمجھتی تھی کہ ایسے مصروف انسان کے لئے جتنا بھی میں کر سکوں ان کے لئے کہ ان کا وقت ضائع نہ ہو کسی لحاظ سے بھی میں نے کوشش کی۔

سوال:۔ اپنی اتنی سخت مصروفیت میں سے کیا وہ کچھ وقت نکال پاتے تھے کہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں وہ آپ کی کوئی معاونت کر سکیں۔

جواب:۔ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں انہوں نے (بہت) نگرانی کی ہے ہر لحاظ سے اور پڑھائی کی بچوں کے لئے انہیں بہت فکر ہوتی تھی بچوں سے ہمیشہ پوچھا کرتے تھے سکول سے ان کے آنے کے بعد کیا کچھ ہوا ہے۔ کیا کام تم نے کیا ہے کوئی دقت تو نہیں۔ کوئی کسی قسم کی

پریشانی تو نہیں۔ ان کا اس لحاظ سے بہت خیال رکھتے تھے بچوں کی تربیت میں ان کو توجہ اس بات میں تھا کہ بچوں کو یہ نصیحت کہ جھوٹ سے نفرت۔ جھوٹ سے ہمیشہ اس طرح توجہ دلائی کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ کبھی بھی، کسی لحاظ سے بھی۔ یہ بہت بری چیز ہے۔ جھوٹ سے ہی سب برائیاں پیدا ہوتی ہیں تو اس کا خیال ہمیشہ رکھیں۔ محنت کی طرف ہمیں ہمیشہ توجہ دلائی ہے کہ اپنا جو کام کرو ایماندار ہو کے اور پوری محنت سے جہاں تک تمہاری کوشش ہے تم اسے کرو باقی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر چھوڑ دو۔ یہ سبق انہوں نے بچوں کو بھی دیئے اور اس لحاظ سے اللہ کا فضل ہے کہ بچے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ تعلق رکھنے والے اور اپنے والد کی اس نصیحت پر عمل کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ آئندہ بھی انکو توفیق دے کہ یہ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے والے ہوں۔

سوال:۔ ہمارے معاشرے میں ایک یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ عزیز و اقارب کے ساتھ بہت زیادہ نبھانا پڑتا ہے ان کے فنکشنز اٹینڈ کرنے پڑتے ہیں ان کی ہر خواہش ہر غمی میں ضرور شرکت کرنی ہوتی ہے تو اس قسم کے جو معاملات ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کس طرح اپنی مصروفیات میں سے نبھا پاتے تھے۔

جواب:۔ اس لحاظ سے تو ڈاکٹر صاحب ایک مثالی نمونہ تھے۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری ان پر آتی تھی اور انہوں نے ہر لحاظ سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری اٹھائی۔ بہنوں کی شادیوں کے لئے پوری ذمہ داری انہوں نے اٹھائی۔ اور ہمیشہ اپنے دل میں یہ درد محسوس کرتے کہ جہاں تک ہو سکے میں اپنے بہن بھائیوں کی خدمت کروں اور جتنی بھی میں مدد کر سکتا ہوں کروں اس لحاظ سے یہ ہوتا تھا کہ اپنے خرچ ضروریات بالکل سادہ تھے انتہائی سادگی سے زندگی گزاری ڈاکٹر صاحب نے، اور گھر میں بھی ہمارے بے حد ہی سادگی رہی ہے ہمیشہ سے ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جو بھی ہو سکے میں اپنے بہن بھائیوں کے لئے اپنے وطن کے لئے جو بھی میں کر سکتا ہوں کروں۔ پوری کوشش اور کامیابی کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک ان کا ہر طرح کا خیال رکھنے کی پوری پوری ذمہ داری ادا کی ہے ہر لحاظ سے۔

سوال:۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گی کہ جب وہ گھر میں آپ کے ساتھ اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے تو کس طرح کا ان کا رویہ یا برتاؤ ہوتا تھا۔

جواب:۔ رویہ تو بہت محبت والا پیار والا وجود تھا اس میں کوئی شک نہیں مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس ٹائم بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ باہر کے سفر اتنے تھے کہ اس کی مثال مجھے یاد آ رہی ہے میں آپ کو وہ بتا دوں اکثر چونکہ سفر میں رہتے تھے آتے جاتے تھے آج یہاں جا رہے ہیں کل وہاں جا رہے ہیں تو ہمارے ہمسائے میں ایک Polish فیملی رہتی ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب آئے ہوتے تھے تو ان کا لڑکا آیا شام کے وقت اس نے بیل دی تو ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگا کہ Can I See the Land Lady اس نے سمجھا کہ یہ Land Lady مسز سلام ہیں۔ یہ آدمی کوئی مسافر ہی ہے یا کوئی آتا جاتا رہتا ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب اندر آئے میں نے پوچھا ہنس کے کہنے لگے وہ کہتا ہے۔ Can I See the Land Lady تو میں نے کہا ناں بس یہ حال تھا ان کے آنے کا۔ آج یہاں ہیں۔ ہفتہ میں مجھے یاد ہے کہ بعض دفعہ تین تین دفعہ انہیں ایئرپورٹ پر چھوڑنا ہوتا تھا یا چار چار دفعہ لینے جا رہی ہوں لا رہی ہوں۔ آج جینوا گئے۔ کل لندن جانا ہے فرانس جا رہے ہیں اٹلی جا رہے ہیں یہ سفر اتنے رہے ہیں ان کی زندگی میں کہ میں سوچتی تھی کہ جب یہ ریٹائر ہو جائیں گے تو بغیر سفر کے ان کا وقت کیسے گزرے گا بہت ہی زندگی سفر میں کٹی ہے۔ مصروف زندگی اتنی رہی ہے کہ اس کے لئے ایک یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہر کام میں اپنے کام میں انتہائی مصروف مگر اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا نمازوں کی ادائیگی۔ قرآن پاک کی تلاوت ہر وقت۔ سفر میں بیٹھتے تھے میں نے دیکھا ہے کہ کار میں بیٹھتے ہی ایک چھوٹی سی حمائل جیب میں ہوتی تھی وہ نکال لیا کرتے تھے اور بعض اوقات پورا کار کا سفر اٹلی سے وینس تک ہم By Road جایا کرتے تھے۔ دو گھنٹے کا سفر ہے اور ڈاکٹر صاحب قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہوتے تھے۔ جہاز میں بیٹھے ہیں تو بس قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر لحاظ سے دین میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت اپنے فضل سے حصہ بخشا اور دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر لحاظ سے انعامات دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بھی بخیر کیا

اللہ تعالیٰ بچوں کو بھی اب ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سوال:۔ ایک سوال آپ سے اور پوچھنا چاہوں گی کہ ڈاکٹر صاحب اتنے مصروف ہوتے تھے تو کبھی آپ کو ان سے کوئی اس قسم کی شکایات تو نہیں ہوئی یا آپ نے اس چیز کو کبھی بوجھ تو نہیں محسوس کیا کہ ساری ذمہ داریاں بچوں سے متعلق اور مختلف قسم کی آپ کے سر پر یقینی طور پر زیادہ ہوں گی آپ نے ان کو خوشی خوشی نبھایا یا کسی سٹیج پر آپ کو یہ مشکل محسوس ہوئی کہ ایک سائنسدان کی بیوی ہونے کی وجہ سے آپ کو زیادہ ذمہ داریاں نبھانی پڑ رہی ہیں۔

جواب:۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل اور احسان مجھ پہ رہا ہے کہ خدا نے مجھے توفیق دی کہ میں نے ہر رنگ میں نے اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر صاحب اس چیز کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۲۸ سال بطور لجنہ اماء اللہ لندن انگلستان کی صدر مجھے خدمت کا موقع ملا ہے میں نے اپنے اوقات کو اس طرح تقسیم کیا ہوا تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب کا یہ روٹین ہوتا تھا کہ دو ہفتے اٹلی میں ہوتے تھے دو ہفتے لندن میں تو جن دنوں ڈاکٹر صاحب لندن ہوتے تھے اس وقت میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے میں لجنہ کا جتنا کام کر سکتی ہوں وہ ختم کر دوں تاکہ مجھے گھر میں زیادہ فون نہ آئیں یا کوئی اور زیادہ میری توجہ اس طرف نہ ہو تاکہ میری پوری توجہ ڈاکٹر صاحب کی طرف ہو ان کی خدمت میں کر سکوں تو اللہ تعالیٰ کا احسان ہے مجھے اس رنگ میں کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان بچوں پر بھی ہے کہ بچوں نے اس چیز کو سمجھا کہ ہمارے باپ کی زندگی

and he is very excepational person

اور بچوں نے بھی پوری اس چیز کی قدر کی ہے اور جو بھی جتنا بھی وقت والد کی طرف سے ملا۔ انہوں نے اس کو دلی خوشی اور احترام کے ساتھ ملکر قبول کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ عزیزہ صاحبہ سے انٹرویو

سوال:۔ عزیزہ صاحبہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ بطور باپ کے آپ نے انہیں کیسا پایا اور کس طرح کا آپ کے ساتھ ان کا سلوک تھا۔

جواب:۔ ان کا سلوک ہم سب بچوں کے ساتھ جیسے امی بتا رہی ہیں اتنی محبت والا تھا جیسے امی بتا رہی ہیں مصروف وہ بہت ہوتے تھے بچپن کی یادیں کچھ میرے ذہن میں ہیں جب ہم کیمبرج میں رہا کرتے تھے جب میں چھوٹی تھی بہت چھوٹی تھی اس وقت اتنی مصروفیت نہیں تھی جب تک Trieaste کا کام شروع نہیں ہوا اور مجھے اس وقت کے زمانے میں یاد ہے کہ میں اور شاید میری چھوٹی بہن جو بالکل ہی چھوٹی تھی ساتھ ہی گھر کے جو دریا ہے کیمبرج میں' تو باقاعدہ ہم جاتے تھے Boat ہوتی ابو نے وہ چلانی ہم دونوں نے بیٹھنا اس میں' پھر' جب لندن آئے تو اس وقت بھی ہوتا تھا کہ ہفتہ کے روز ہمیں لیکے جاتے تھے شاپنگ کیلئے اور پھر انگلینڈ کا مشہور کھانا Fish and Chips ابو نے ضرور Fish and Chips لینی اور سب کو اکٹھے کرتے ہم نے بیٹھ کر کھانی گھر لے آتے جب Treast کا کام شروع ہو گیا پھر بہت ہی مصروفیت ان کی بڑھ گئی۔ جب بھی آتے تو بچوں کو سب کو پوچھنا' ملنا' کیا کیسی پڑھائی جا رہی ہے۔ پڑھائی کی طرف تو ان کی بہت ہی زیادہ توجہ ہوتی تھی اور سب سے بڑی نصیحت یہ ہوتی تھی کہ ٹائم بہت قیمتی ہے ٹائم نہ ضائع کرو۔ جو سمجھتے تھے کہ یہ چیز فضول وقت ضائع کرنے والی چیز ہے اس سے منع کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں ٹیلی ویژن نہیں ہوتا تھا ان کو یہ تھا کہ TV وقت ضائع کرتا ہے تو ہم لوگ واقعی میرا خیال ہے کہ زیادہ تر کتابوں کے پڑھنے پہ لگاتے تھے۔ ہم بچے تھے ہوتا تھا ہمیں کہ ہمارے گھر کیوں نہیں سب کے گھر میں TV ہے مگر وہ اس پہ بہت قائم رہتے تھے کہ نہیں T.V نہیں آنا۔ بلکہ ایک دفعہ یوں ہوا کہ جب انڈیا پاکستان کی جنگ ہوئی ہے تو خبریں سننے کیلئے کرایے پہ TV لیا اور پھر ایک دو ماہ کے بعد واپس بھی کر دیا۔ تو ہمیں افسوس تو تھا کہ TV بھی نہیں۔ مگر اب بڑے ہو کر انسان کو سمجھ آتی ہے کہ کتنی قیمتی باتیں تھیں اور ہمارے لئے بہتری کی باتیں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ

آصفہ صاحبہ سے انٹرویو

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری صاحبزادی ہیں آصفہ صاحبہ۔ آصفہ آپ یہ بتائیں کہ ڈاکٹر صاحب کا آپ کی تربیت میں کس حد تک دخل تھا۔

جواب:۔ دخل تو بہت ہی تھا جیسے امی بتا رہی ہیں کہ یہ جو خاص طور پر جیسے جھوٹ بولنا' ایسی چیزوں سے تو بہت سخت منع کرتے تھے۔ تو تربیت میں تو امی نے تھوڑا بہت بتا دیا ہے ایک دو باتیں ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ کبھی کام کی وجہ سے ان کو زیادہ ٹینشن ہوتی تھی تو غصہ بھی آجاتا تھا کسی بات پر تو اکثر یہ ہوتا تھا سفر بھی جیسے امی کہہ رہی ہیں ہفتہ میں تین چار دفعہ ان کو کبھی ادھر کبھی ادھر تو وہ نکلنے سے پہلے کبھی ان کو کسی بات پہ غصہ آجاتا تھا تو مجھے بھی ایک دو دفعہ ڈانٹ پڑی تھی وہ پھر یہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب چلے جاتے تھے تو ائرپورٹ سے ہی فون آجاتا تھا۔ بہت احساس ان کو ہوتا تھا کہ میں نے تمہیں ڈانٹا ہے مجھے پریشانی تھی اتنا سخت احساس پھر ان کو ہوتا تھا کہ جہاں بھی جاتے تھے خط لکھ دیتے تھے۔ واپس آتے تھے تو یقیناً لازمی ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی تحفہ سب کیلئے بچوں کے لئے بھی۔ میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ تھوڑا بہت ان میں ہوتا تھا یہ سختی کبھی کبھی ان میں آجاتی تھی جو باپ کا حق ہوتا ہے۔ لیکن پیار بھی اتنا زیادہ ان کو پھر بہت احساس ہوتا تھا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ باقی تربیت تو اپنی جگہ پر انہوں نے بہت کی جیسے امی نے آپ کو بتا دیا ہے۔ بس یہی باتیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیٹی محترمہ بشریٰ صاحبہ

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب کی تیسری بیٹی ہیں بشریٰ صاحبہ۔ بشریٰ آپ بھی ہمیں کچھ بتائیں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں۔

جواب:۔ یہ جو سب بتا چکی ہیں امی جان اور میری بہنیں اور صفیہ بھی۔ اس کے علاوہ مجھے یاد آتا ہے کہ ان کا دھیان چاہے وہ کام کی ہی طرف ہوتا تھا پھر بھی وہ کبھی اپنی ذمہ داری نہیں بھولتے تھے۔ اور جیسے کہ آصفہ نے ذکر کیا کہ جہاں بھی جاتے تھے خاص طور سے اس ملک کی چیز لیکے آتے تھے ہمارے لئے۔ ہر ایک کے لئے جس طرح ایک خاص چیز تھی مثلاً گڑیا' اس ملک کے کپڑے نیشنل کاسٹیوم وغیرہ ہمارا ایک بہت بڑا Collection بن گیا تھا وہ خاص پوچھتے تھے کس کی گڑیا یہ ہے اور کس طرح رکھی ہے آپ لوگوں نے پھر پوسٹ کارڈ کا بہت شوق تھا جہاں بھی جاتے تھے پوسٹ کارڈ ہمیں بھیجتے تھے۔ اس جگہ اور پھر اس کا Collection کسی کے ذمہ ہوتا تھا وہ کرنا۔ جو وہ ہمارے ساتھ چھوٹے چھوٹے Trips کرتے تھے ہمیشہ ان کا دھیان رکھا کہ ہمارے اخلاق کی کوئی بہتری ہو تو میوزیم کیلئے ہمیں لے جاتے تھے یا اس طرح کے نمائش وغیرہ ان کی طرف جیسے کہ باجی عزیزہ نے ذکر کیا ہے کہ وقت کے ضائع کرنے کی عادت ان کو اتنی ناپسند تھی کہ بالکل ناراض ہوتے تھے کہ کبھی ہم دیر سے اٹھیں صبح یا کام میں نہیں لگیں ہوں اس طرح جب جاتے تھے کہیں تو ہمیں دے دیتے تھے کہ اتنا کام کرنا ہے میرے واپس آنے تک اور ہم پوری کوشش کرتے تھے اس کام کو مکمل کرنے کی وہ جہاں بھی جاتے تھے یہ بات فون پر بات کرتے اور خط لکھتے تھے بس میں اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

بقیہ از صفحہ 46

یہ ایک نوبل انعام یافتہ کا مستقبل میں نوبل انعام حاصل کرنے والے کے لئے زبردست خراج تحسین تھا۔ اس تعارف کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی جو ایک گھنٹہ جاری رہی جس کے اختتام پر ہال میں موجود تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر پورے پانچ منٹ تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔

Professor Abdus Salam

Abdus Salam was one of the foremost theoretical physicists of his generation and the first Muslim to win a Nobel Prize, in 1979. He was a warm and colourful personality, but often a controversial one in his native Pakistan.

Salam was born in 1926, in Jhang, a small town in the Punjab, the son of a minor educational official. His talents were clear from an early age. At 14, he became something of a local hero when he won a scholarship to Government College, Lahore, with the highest marks ever recorded. His first paper was published when he was 17 and a fourth-year student at the college. It was an ingenious improvement on the solution of an algebraic problem discussed earlier by the Indian mathematical genius Srinivasa Ramanujan.

In 1946, he won a scholarship to Cambridge, where he obtained a Double First in Physics and Mathematics. He briefly embarked on experimental research, but rapidly discovered that his talents lay in other directions and switched to theory. He started at just the right moment. Physicists had just learned how to get finite (and spectacularly confirmed) predictions out of quantum electrodynamics, the theory that describes interactions between charged particles and electromagnetic radiation, using the techniques of renormalisation theory devised by Julian Schwinger, Sin-itiro Tomonaga, Richard Feynman and Freeman Dyson. Salam and his research supervisor, Paul Matthews, later his lifelong friend and collaborator, showed how to extend these methods to other theories. Salam's very first paper on the subject attracted widespread interest and won him a place among the leaders of the field.

A secure place among the great men of science: Salam, Professor of Theoretical Physics at Imperial College for 36 years, won a Nobel Prize in 1979 Photograph: Hulton Getty

In 1951, Salam returned, as he had always planned, to Pakistan. He spent three increasingly frustrating years as Professor of Mathematics at both Punjab University and his Alma Mater, Government College, where his duties apparently included coaching the college football team. He had hoped to continue his research, but found little time or stimulus and no official support. Finally, he took leave of absence and returned to Cambridge as a lecturer in mathematics and Fellow of St John's College in 1954. Three years later, at the instigation of Patrick Blackett, then Head of Imperial College's rapidly expanding Physics Department, Salam was offered the chair of Theoretical Physics. He persuaded Matthews to join him as a Reader, and together they set up what soon became one of the world's leading centres for fundamental theoretical physics.

In 1959, at the age of 33, Salam became the youngest Fellow of the Royal Society. His research ranged widely, but the dominant theme was unification – the search for a unified description of the different fundamental forces. It culminated in the discovery in 1967 of the electroweak theory, showing how the weak force manifested in radioactive decay can be seen as parts of a unified symmetric structure. For this achievement, Salam shared the 1979 Nobel Prize in Physics with Sheldon Glashow and Steven Weinberg, both of Harvard University.

It was with great reluctance that Salam had decided to move to Britain. He always hoped to be able to use his talents to promote the development of Pakistan. He was convinced that what the developing countries needed above all was rapid development of science and technology. In 1959, he eagerly accepted an appointment as a scientific adviser to President Ayub Khan. He began working on ambitious plans for all kinds of developments, and recommended that the government devoted at least 1 per cent of national income to this programme. For example, he brought in experts to study the severe problem of waterlogging and salinity of irrigated land. They recommended a drastic programme of drainage, but the government was unwilling to devote the required resources and the project failed. Indeed, many of Salam's plans foundered on a similar lack of commitment. Only in the high-profile areas of nuclear energy and space research was the government willing to commit enough resources to make things happen.

Ironically, Salam was often criticised in the development community for directing all scientific manpower into these arcane areas that did little for the mass of people, though it was certainly not what he had wanted. At the time of impending hostilities with India over Kashmir, Salam and the great Indian physicist Homi Bhabha, founder of the Tata Institute in Bombay, tried to mediate between Ayub Khan and the Indian leader Jawaharlal Nehru, but unfortunately without success.

One very positive thing did come out of Salam's appointment as a scientific adviser. He had felt frustrated at being unable to carry on his chosen career in his own country, and determined to help others with the same problem. He concluded that what was needed was a first-class international research centre to which scientific associates from Third World countries would come for regular visits, so that they could keep up with international research, but still go home to work in their own countries. He conceived the idea of an International Centre for Theoretical Physics, and determined to use his position as Pakistani delegate to the International Atomic Energy Agency to win support for the idea.

Salam was a remarkable persuader, charismatic, with unbounded energy and enthusiasm, and a slightly irreverent, unorthodox approach that was much more effective than staid diplomacy would have been. Within three years, he had persuaded the IAEA to back the idea, though with very modest funding, and got the Italian government to foot most of the bill, provided the centre was sited in Trieste. In 1964, the ICTP opened its doors in temporary quarters, moving to a handsome new building in the suburbs of the city in 1968. It has been an astonishing success, and has indeed enabled large numbers of theoretical physicists to continue working effectively in Third World countries. Towards the end of his life, Salam was campaigning vigorously for the establishment of three similar centre in other scientific disciplines.

Salam played an important role in various UN bodies, for example as member and chairman of the Advisory Committee on Science and Technology. In Pakistan, his efforts were less successful. After the fall of Ayub Khan, his relations with the government became increasingly strained. Salam belonged to the Ahmadiyya sect of Islam, regarded by many orthodox Muslims as heretical: they believe that their 19th-century founder, Mirza Ghulam Ahmad, was the Mahdi, the true successor of Muhammad. In 1974, under Zulfikar Ali Bhutto, the Ahmadiyya were declared non-Muslim and effectively deprived of civil rights. There were anti-Ahmadiyya riots, with widespread loss of life and property. Salam, who saw himself as a devout Muslim, was outraged, and broke off all contact with the Pakistani government. The situation has perhaps eased slightly in recent years: in 1995, for example, there was a special summer school session in honour of Salam, addressed by the President of Pakistan. But Ahmadiyyas are still an oppressed minority.

The award of the Nobel Prize in 1979 made Salam famous throughout the Third World, especially in Islamic countries. He received a constant stream of prizes and honours, and spent much of his time travelling. This gave him the opportunity to promote the idea of the Third World Academy of Sciences. It was set up in 1983, and Salam became its first President. He used his influence to argue tirelessly for the need to invest in science – not for its own sake but as the only viable way of eliminating the curse of endemic poverty and the terrible divide between the rich countries and the poor.

Salam has a secure place among the great men of science. He was most stimulating colleague, a man of humanity and passion, with many friends and admirers, and some detractors, not least in his own country. In the mid-Eighties, he developed a degenerative neurological disorder, progressive supranuclear palsy (PSP), that made his life increasingly difficult. He bore the affliction with remarkable stoicism, continuing to work so long as he was physically able, on new ideas both in theoretical physics and for Third World development.

Tom Kibble

Abdus Salam, physicist: born Jhang, Pakistan 29 January 1926; Professor of Mathematics, Government College, Lahore 1951-54; Professor of Mathematics, Cambridge University 1954-56; Fellow, St John's College, Cambridge 1951-56, Honorary Fellow 1972-96; Professor of Theoretical Physics, Imperial College, London 1957-93 (Emeritus), Fellow 1994-96; FRS 1959; Scientific Adviser to the President of Pakistan 1961-74; Director, International Centre for Theoretical Physics, Trieste 1964-94, President 1994-96; Nobel Prize for Physics 1979; Hon KBE 1989; twice married (two sons, four daughters); died Oxford 21 November 1996.

The other moments of emotions was Prof. Schrieffer said "we wanted to honour Prof. Salam by giving him a poem and luckily a physicist has written a poem". That poet was the famous theoretical physicist Fred Reines. The poem was recited before the scientists jam packed in the lecture theature of ICTP. I have received a copy of the poem sent by Prof. Salam's office in ICTP (Trieste). The poem is as under.

GRAND UNIFICATION

A Tribute to Abdus Salam

I

From out the East there came a man
who thought to divine the cosmic plan
To unify the hearts of man
And make whole, concepts deep and grand.

II

From out of the West came Nobelity
To grace the deep insight, the unity
Arising from diversity.

III

From out of the East there came such a man
Whose heart and mind did most nobly span
Man's highest hopes and dreams and plans
Transcendent with love and humility.

IV

From out of the depths of the human soul
Came this man so well crafted for his role
Came this man who would make
That which is fragmented whole.

Fred Reines

(Fred Reines)

3 November 1989

SCIENTIFIC RAVI (1995)

Digitized By Khilafat Library Rabwah

ایک بہت پیارا وجود

پھر کسی پیارے کی یادوں نے کیا ہے بے قرار
دل ہے بر آیا اور آنکھیں بھی مری ہیں اشکبار

اہلیہ ثانی ڈاکٹر صاحب محترمہ لوئس جانسن سلام صاحبہ سے ایک انٹرویو

(انٹرویو محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ فضل عمر ہسپتال ربوہ بنت حضرت مولانا عبدالمالک خان صاحب مرحوم)

زندگی کیا ہے' فقط ایک سہارا دل کا
موت کا جام ہر اک شخص پیئے جاتا ہے
تیری فرقت ہے کہ آنکھوں سے لہو بہتا ہے
ذکر تیرا ہے کہ دل چاک کئے جاتا ہے

مکرم پروفیسر عبدالسلام صاحب ایک جانی پہچانی عظیم شخصیت جنہوں نے ایک طرف دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ اعزازات حاصل کئے تو دوسری طرف خلافت سے وابستگی کی سعادت پائی اور خلیفہ وقت کی دعاؤں کے وارث بنے۔

بیگم پروفیسر عبدالسلام صاحب جو ان کے جنازے کے ساتھ ربوہ تشریف لائی تھیں اپنا قیمتی وقت نکال کر اس وقت سٹوڈیو میں موجود ہیں۔ تو آیئے ان سے پروفیسر صاحب کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرتے ہیں۔

سوال:۔ ہم مشہور لوگوں کو عام طور پر ان کے اعزازات اور کامیابیوں کے سبب پہچانتے ہیں۔ آپ ان کی ذاتی شخصیت کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی۔

جواب:۔ بے شک وہ ایک عظیم آدمی تھے اور ان کی عظمت جانی جاتی ہے۔ لیکن بہت سے عظیم لوگوں کی طرح ان کے ساتھ رہنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ انہیں اپنے کام میں مگن رہنے کی دھن غالب رہتی تھی۔ شاید اسی طرح وہ بہتر کام کر سکتے تھے۔ رات جلدی سو جاتے اور جلدی اٹھتے تھے اور صبح کے تین بجے بہترین کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سماجی زندگی میں شرکت کیلئے ان کے پاس وقت کم ہوتا تھا۔ بہرحال ان کی ان عادات کے اپنے فوائد تھے۔ اس طرح وہ فزکس کی دنیا میں کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے۔ ترقی پذیر ملکوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کاوش کر سکتے تھے اور دنیا میں قیام امن کیلئے جدوجہد کر سکتے تھے۔ ان میں ایک بہت بڑا وصف دوسروں کو متاثر کر کے ان میں کام کا جذبہ ابھارنا اور پوشیدہ صلاحیتیں اجاگر کرنا تھا۔ اگرچہ آج وہ خود تو ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اس Inspiration کی رمق آج بھی باقی ہے۔

جب وہ صحتمند تھے تو انعامات کو ایک تمکنت اور وقار کے ساتھ قبول کیا۔ دکھاوے کو کبھی پسند نہیں کیا۔ جب وہ بیمار ہوئے اور ان کو علم ہوا کہ وہ ایک (بظاہر) لاعلاج بیماری میں مبتلاء ہیں تب بھی اس صورتحال کو سکون اور وقار سے قبول کیا۔ اور کوئی شکوہ زبان پر نہ لائے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں گھر

میں عزیزوں کے درمیان بہت ہی صبر اور سکون کے ساتھ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ پھر ہم ان کو ربوہ لائے آپ سب کے درمیان ۔ یہ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ان کی تدفین ربوہ میں ہو۔ یہ بات ان کے لئے بہت اہمیت کی حامل تھی اور ہمارے ذہنوں میں بھی ہمیشہ سے یہ بات اتنی پختہ تھی کہ ہم نے ان کو یہاں لانا ہے۔

گزشتہ رات جب ہم ربوہ پہنچے تو جوق در جوق لوگ قطاروں میں ہاتھ تھامے استقبال کیلئے نظر آئے۔ راستوں کے دونوں طرف کھڑے خوش آمدید کہنے والے بڑے اور بچے سبھی موجود تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر ان کو ملنے کیلئے اُمڈ آیا ہے۔ اور یہ عجیب سماں تھا۔ جس نے ہمارے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس موقع پر یہ خیال آیا کہ وہ جن کو لوگوں کے جذبات کی گہرائی نے ہمیشہ متاثر کیا اور جنہوں نے جواباً ہمیشہ نہایت اخلاص سے اس کا اظہار کیا آج اگر وہ ان لوگوں کے درمیان زندہ موجود ہوتے تو پھر شاید ہم ربوہ پہنچ ہی نہ پاتے۔ اس لئے کہ وہ گاڑی سے اتر کر لوگوں سے ملنے لگتے اور ان سے مصافحہ کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ کاش کہ لوگ تصور کر سکتے کہ وہ کیا حسین منظر ہوتا۔ یہ سب کچھ درست ہے ان کو یہاں لانا بہت صحیح فیصلہ تھا کیونکہ وہ پاکستان کے وجود کا ایک حصہ تھے اور جماعت کے لوگوں کا حصہ تھے۔ میرے بیٹے نے ان کی وفات پر کہا تھا کہ یہ اب ہمارے نہیں رہے۔ مجھے امید ہے کہ جو Inspiration انہوں نے ہمیں اپنی زندگی میں دی تھی وہ ہمیشہ قائم رہے گی اور جو آج کی نسل وہاں موجود تھی وہ کل یاد کرے گی جب یہ ایک عظیم انسان ربوہ آیا تھا۔

سوال:۔ میرے علم کے مطابق پروفیسر صاحب کو Parkinsonism کی بیماری تھی۔ لیکن آپ سے معلوم ہوا کہ انہیں ایک مختلف قسم کی اعصابی تکلیف تھی جس کے اب تک چھ ہزار کیس انگلستان میں رپورٹ ہو چکے ہیں۔ کیا آپ اس کے متعلق ہمیں مزید کچھ بتانا چاہیں گی؟

جواب:۔ ان کو ایک قسم کی اعصابی بیماری Neuro Degenerative Disease تھی۔ جس کی علامات ابتدائی مراحل میں Parkinsonism سے مشابہت رکھتی ہیں۔ جس میں پٹھوں کی حرکت متاثر ہوتی ہے۔ تقریباً چار سال قبل ہمیں اندازہ ہوا کہ بعض علامات Parkinsonism کی نہیں ہیں۔ نیز Parkinsonism کی ادویات بھی اپنا اثر نہیں دکھا رہیں۔ آخر کار ایک Specialist نے تشخیص کیا کہ ان کو Progressive Supranuclear Palsy (PSP) ہے۔ یہ بیماری بعض اوقات اپنے تین دریافت کرنے والوں کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔

یہ بیماری پہلی دفعہ ۱۹۶۳ء میں تشخیص ہوئی لیکن تقریباً اس سے پہلے بھی موجود ہوگی لیکن اس کی تشخیص نہیں ہو سکی ہوگی۔ انگلستان میں تقریباً ۶ ہزار مریض اس مرض میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ واضح گمان یہ ہے کہ اس سے زائد ہوں گے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیماری کو کوئی نام دے دیں اس کی نہ تو وجہ معلوم ہے اور نہ علاج۔ بعض ادویات سے کچھ افاقہ ہوتا ہے جس سے پٹھوں کی حرکت میں کچھ آسانی پیدا ہوتی ہے مگر صرف ابتدائی مراحل میں۔

اس بیماری سے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ شاید کسی اور ایسے بیمار کی مدد ہو سکے۔ اور تیمار دار کے علم میں اضافہ ہونے سے مریض کی نگہداشت صحیح طریقے سے ہو سکے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہم کچھ ایسا کر سکیں۔

سوال:۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت سے ہمیں بھی کچھ وقت دیا اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ آئندہ بھی ضرور ربوہ تشریف لائیں گی۔

جواب:۔ اگرچہ ہمارے لئے بڑے دکھ کی بات ہے اور ان کے لئے بھی جو ان کی جدائی کو محسوس کرتے ہیں لیکن پروفیسر صاحب کیلئے تو یہ ایک خوشی کا موقع تھا کہ وہ زندگی کے جھمیلوں سے فراغت پا کر واپس ربوہ پہنچ گئے۔

آپ کے صاحبزادے عمر سلام صاحب

میزبان:۔ عمر آپ کا بہت شکریہ کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ یہاں تشریف لائے ایک بیٹا ہونے کی حیثیت سے آپ کے اپنے عظیم والد کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔

جواب:۔ مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا مگر اپنے باپ کی دو خوبیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں سے پہلی خوبی ان کا عجز اور انکسار ہے۔ کیونکہ جب میں ایک بچہ تھا تو مجھے اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا کہ میرے والد کتنے عظیم آدمی ہیں اور انہوں نے کیا کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انہوں نے کبھی اس بات پر فخر محسوس نہیں کیا کہ مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔ مجھے بڑے ہو کر خود ہی ان ساری باتوں کا اندازہ ہوا۔

۱۹۷۹ء میں جب ان کو نوبل پرائز ملا تو میری عمر صرف ۵ سال تھی۔ انہوں نے اسکول میں چاکلیٹ کا ایک ڈبہ مجھے بھجوایا تو میں اپنے دوستوں کے سامنے کچھ خفیف سا ہوا اور مجھے تعجب بھی ہوا کہ میرے والد کا عام حالت میں یہ رویہ نہیں ہے۔ شائد اس موقع کی اہمیت نے ان کو اس اظہار پر مجبور کر دیا تھا۔

دوسری خوبی جو بیماری کے حالات نے مجھ پر ظاہر کی اور اس کا ذکر میری والدہ نے بھی کیا ہے وہ بیماری کے ایام میں ان کا صبر تھا۔ آخری تین چار سال تو شدید بیماری کے تھے مگر شاید اس سے بھی چند سال پہلے بیماری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے بیماری کی حالت میں بھی اپنی شخصیت کو نہیں بدلا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنا کام صبح تین بجے شروع کرنا چاہتے تھے۔ ہر ہفتے وہ کسی نئی جگہ پر جا رہے ہوتے اور نئے لوگوں سے ملتے۔ انہوں نے اپنا کام جاری رکھا حتیٰ کہ وہ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں رہے۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی کبھی شکوہ نہیں کیا۔ کبھی غصہ نہیں دکھایا اور کبھی بے قراری کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے اس چیز کا اندازہ ہے کہ وہ کس کرب میں مبتلا تھے لیکن ہم سے انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ بس اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

(یہ لوگ بہت کچھ اور کہنا چاہتے ہوں گے لیکن دکھ اور کرب کی کیفیت جو اشک رواں کی صورت میں آنکھوں سے عیاں تھی اور ان کی رندھی ہوئی آواز سے ظاہر تھی جس کی وجہ سے باتوں کا سلسلہ بار بار ٹوٹتا تھا۔ اور مجبوراً گفتگو کو ختم کرنا پڑا۔

ادارہ محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ کا ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس انٹرویو کو Transcribe کیا۔ فجزاھا اللہ احسن الجزاء

نوبل انعام کا بانی ــــ الفریڈ نوبل

(تحریر مکرم ڈاکٹر سلطان احمد مبشر صاحب)

نوبل انعامات کا بانی الفریڈ نوبل تھا۔ نوبل سویڈن سے تعلق رکھنے والا عظیم کیمیادان، صنعتکار اور مشہور دھماکہ خیز "ڈائنامیٹ" کا موجد تھا۔ یہ سٹاک ہوم سویڈن میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوا۔ اس کا والد عمانویل نوبل ایک ٹیکنیشن تھا۔ نوبل کا خاندان ۱۸۴۲ء میں سینٹ پیٹرز برگ (روس) میں نقل مکانی کر گیا۔ جہاں اس کا والد روسی حکومت کیلئے آبدوز سرنگیں اور تارپیڈو تیار کرتا تھا۔

۱۸۵۹ء میں سویڈن واپسی پر الفریڈ نوبل نے سٹاک ہوم کے نزدیک Heleneborg میں آتش گیر مادوں کی ایک تحقیقاتی لیبارٹری میں کام شروع کیا وہاں اس نے نائٹرو گلیسرین پر تجربے کئے۔ ۳ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ایک دھماکے سے اس کی فیکٹری تباہ ہو گئی۔ اس حادثے نے اس کے چھوٹے بھائی کی جان بھی لے لی۔ اس کے بعد اس نے ایسی دھماکہ خیز چیز کی تلاش میں تجربات شروع کئے جو کم خطرناک ہو اور جس کی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے Blasting Cap on Detonator کی انقلابی ایجاد کی۔

۱۸۶۴ء میں اس نے نائٹروجن گلیسرین کارپوریشن کی بنیاد رکھی جو اپنی نوعیت کی دنیا میں پہلی کارپوریشن تھی۔ ۱۸۶۵ء میں اس نے Krummel جرمنی میں آتش گیر مادوں کی فیکٹری بنائی اور ۱۸۶۶ء میں اس نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔ اس عظیم کامیابی کے بعد اس نے اپنی فیکٹری اور کاروبار کا جال دنیا کے بیشتر مہذب ملکوں میں پھیلا دیا۔

نوبل صرف ڈائنامیٹ کا ہی موجد نہ تھا بلکہ وہ مصنوعی چمڑے اور مصنوعی ربڑ اور مصنوعی ریشم سے بھی متعلق رہا۔ مختلف ممالک میں اس کے جو Patent رجسٹرڈ تھے، ان کی تعداد ۳۵۵ تھی۔ اس کی ایجادات میں ڈائنامیٹ کی علاوہ Blasting Gelatin اور Smoke Less Powder بھی شامل ہیں جسے بعد میں Ballistite کا نام دیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں اس نے سویڈن میں Bafors-Gullspong کمپنی قائم کی۔ یہ کمپنی اس وقت دنیا کی مشہور اسلحہ ساز کمپنی ہے۔

اپنے کاروبار کے علاوہ اس نے باکو (روس) میں کام کرنے والے اپنے بھائیوں رابرٹ اور لڈوگ کے پٹرولیم نکالنے کے منصوبوں میں بھی سرمایہ کاری کی۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۲ء کے درمیان اس نے ہیمبرگ جرمنی میں ۱۸۷۳ء سے ۱۸۹۰ء کے درمیان پیرس (فرانس) میں اور ۱۸۹۱ء میں سان ریمو (San Remo) اٹلی میں اپنی لیبارٹری کا قیام کیا اسی شہر میں اس کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوا۔ اس کے اثاثے ایک فنڈ کے قیام میں صرف ہوئے جس کے منافع سے نوبل انعامات دیئے جاتے ہیں۔

نوبل پرائز

الفریڈ نوبل نے اپنی جائیداد کے متعلق یہ وصیت کی کہ اس کی جائیداد کو رقم کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے اور اصل زر (یہ رقم اس وقت کے زر مبادلہ میں ۸۳ لاکھ ۱۱ ہزار ڈالر تھی) کو محفوظ اور نفع بخش کاروبار میں لگا دیا جائے۔ اس طرح اس جمع شدہ سرمایہ سے ایک فنڈ قائم کیا جائے اور اس فنڈ سے حاصل کردہ منافع میں سے ایسے اشخاص کو ہر سال انعامات دیئے جائیں جو گزشتہ ایک سال کے عرصہ میں نوع انسانی کی بہبود و بھلائی کے لئے نمایاں کارنامے اور خدمات انجام دیں۔ نوبل نے مزید وصیت کی کہ یہ منافع پانچ مساوی حصوں میں ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جایا کرے جو فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی یا میڈیسن،

ادب اور امن کے میدانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیں۔ امن انعام اس کو دیا جائیگا جس نے مختلف قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے اور فوجی طاقت کو ختم کر دینے یا تخفیف کر دینے اور قیام امن کی انجمنوں کی تشکیل و ترقی کے سلسلہ میں نمایاں ترین خدمات سرانجام دی ہوں۔ نوبل نے اپنی وصیت میں انعامات کے بارے میں فیصلہ کرنے کیلئے ادارے بھی نامزد کئے جو یہ ہیں۔

فزکس اور کیمسٹری: سویڈش اکیڈمی آف سائنس

فزیالوجی اور میڈیسن: کیرولین انسٹی ٹیوٹ آف سٹاک ہوم

ادب: سویڈش اکیڈمی اور امن کے انعام کا فیصلہ Norwegian Storting یا پارلیمنٹ کے منتخب کردہ پانچ افراد پر مشتمل کمیٹی کرے۔ (یاد رہے ناروے اس وقت سویڈن کے ساتھ United Kingdom میں تھا۔

نوبل نے اس امر کو بھی واضح کیا کہ ان انعامات کی ادائیگی میں کسی شخص کی قومیت زیر بحث نہ ہو سکے گی بلکہ جو سب سے زیادہ مستحق ہوگا اسے انعام دیا جائے گا خواہ وہ سکنڈے نیوین ہو یا نہ۔

نوبل کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق نوبل فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا اور یکم جنوری ۱۹۰۱ء سے فاؤنڈیشن نے فنڈز کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ فاؤنڈیشن نے انعامات کے سلسلہ میں یہ توضیحات کیں کہ "گزشتہ سال سے مراد" صرف وہی کام زیر بحث آ سکیں گے جو اس میدان میں سب سے تازہ ہوں لیکن پرانے کام صرف اسی صورت میں کہ ان کی اہمیت ابھی تک واضح نہ ہوئی ہو۔

اس انعام کی رقم مساوی طور پر دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے اس طرح یہ بھی کہ کوئی آئندہ سال پر موخر بھی کیا جا سکتا ہے یا اصل زر میں جمع بھی کیا جا سکتا ہے اگر کوئی قابل ذکر کام نہ ہوا ہو تو یہ اس صورت میں بھی لاگو ہوتا ہے جب کوئی انعام لینے سے انکار کر دے یا وقت پر اسے وصول نہ کرے۔

ہر انعام کو پانچ سال کے عرصہ میں کم سے کم ایک دفعہ ضرور تقسیم ہونا چاہئے تاہم گزشتہ دو عالمی جنگوں کے عرصہ کو چھوڑ کر ۱۹۰۱ء سے مسلسل نوبل پرائز دیئے جا رہے ہیں۔ وصیت کے مطابق قائم شدہ ادارے نے تین سے پانچ افراد پر مشتمل نوبل کمیٹی قائم کر رکھی ہے۔ Prize Awarder کی مدد کیلئے خصوصی ادارے جنہیں نوبل انسٹی ٹیوٹ کہا جاتا ہے بنائے گئے ہیں۔ ان اداروں میں لائبریریاں اور تحقیقی کام کیلئے دیگر شعبے قائم کئے گئے ہیں۔ نوبل کمیٹیاں [illegible] تجاویز کا جائزہ لیتی ہیں اور اپنی آ[illegible] کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ سفارشات خفیہ ہوتی ہیں اور ان کے فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی انعام کے لئے تجاویز تحریری طور پر داخل کرنا ہوتی ہیں جس میں مجوزہ فرد کے بارہ میں پوری تفاصیل درج کی جاتی ہیں اور اس کے مطبوعہ کام اور دوسری دستاویزات کو منسلک کرنا لازمی ہوتا ہے جن کا نوبل کمیٹیاں تفصیلی جائزہ لیتی ہیں۔ یہ تجاویز صرف وہی افراد دے سکتے ہیں جنہیں ہر سال مرکزی ادارے نامزد کریں تجاویز دینے کے اہل افراد یہ ہیں۔

Prize Awarding Body کے ممبران، گزشتہ نوبل انعام یافتہ، متعلقہ فیلڈ کے مخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسرنیز ادب کے انعام کیلئے سویڈش اکیڈمی سے منسلک اکیڈمیز، انسٹی ٹیوشن اور سوسائٹیوں کے ممبران اور امن کے انعام کیلئے حکومت کے نمائندے اور بعض مخصوص بین الاقوامی اداروں کے اراکین۔

دیگر حکومتیں، یونیورسٹیاں، اکیڈمیاں بذات خود کسی کو امیدوار نامزد نہیں کر سکتیں۔ فنڈ ہر سال وصیت کے مطابق ایک سالانہ رقم اور اس رقم کے جمع کرنے سے جو تقسیم نہ ہو بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے انعامات کی کمی بیشی ٹیکس کی وجہ سے تھی لیکن اب فاؤنڈیشن کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ہر انعام کی رقم شروع میں ۳۲۰۰۰ ڈالر تھی۔ کسی ایک شخص کی دوبارہ اسی فیلڈ میں یا کسی اور فیلڈ کیلئے نامزدگی پر کوئی قدغن نہیں ہے۔

انعامات ہر سال [نو]بل کے یوم وفات پر ۱۰ دسمبر کو امن کیلئے اوسلو میں اور دیگر [انع]امات کیلئے سٹاک ہوم میں منعقد ہونے والی تقریبات میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی انعام یافتہ نہ پہنچ سکے تو اس کا انعام قانون کے مطابق اس کے ملک کے سفارتی نمائندے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ رقم کے ساتھ ایک ڈپلوما سند اور ایک گولڈ میڈل بھی دیا جاتا ہے۔ گولڈ میڈل کے ایک طرف نوبل کی تصویر اور دوسری طرف انعام یافتہ کی فیلڈ کی علامتی شبیہ کندہ ہوتی ہے۔ نوبل انعام یافتہ تقریب میں اپنے کام کے بارے میں لیکچر دیتا ہے جنہیں نوبل لیکچرز کہا جاتا ہے۔ ان لیکچرز کو بعد میں نوبل فاؤنڈیشن کے سالانہ رسالے Lex Prix Nobel میں شائع کیا جاتا ہے۔

اے اللہ ہمارے پیارے امام ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی

عمر و صحت میں

بیحد برکت عطا فرما

ادنیٰ ترین خادم

○ قائد و ممبران مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ دارالحمد فیصل آباد

○ قائد و ممبران مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ دارالنور فیصل آباد

○ قائد و ممبران مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ دارالفضل فیصل آباد

○ قائد و ممبران مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ کریم نگر فیصل آباد

نوبل انعام کی تقریب ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا قرآنی آیات کا تلاوت کرنا

(مکرم منیر الدین احمد صاحب سابق مشنری انچارج سویڈن)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم سائنس سیکھنے اور بار بار تجربات کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحدی کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور خلق میں کسی قسم کا تفاوت اور کمی نہیں پائی جاتی۔ جوں جوں سائنسدان کائنات کی گہرائی میں جاتے ہیں وہ یہی بات پکار اٹھتے ہیں اور آخر اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہ بات پاکستان کے نامور اور ممتاز سائنسدان اور جماعت احمدیہ کے مخلص فرزند ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہالم میں کہی۔ آپ دس دسمبر ۱۹۷۹ء کی شام کو نوبل پرائز کی تقریب میں شامل ہونے والے سکالرز، سفراء، پروفیسرز، طلباء، ممبران کابینہ، ممبران پارلیمنٹ، ممتاز شہریوں، شاہ سویڈن، ملکہ اور شاہی خاندان کے دیگر افراد کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔

آغاز تقریر میں آپ نے فزکس میں انعام پانے والوں کی نمائندگی کرتے ہوئے حاضرین اور نوبل فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کیا اور اردو میں یہ بھی کہ "ہم آپ کے ممنون ہیں"۔

اس کے بعد آپ نے سورۃ الملک کی یہ آیات تلاوت کیں:۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۞ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ

"تو رحمٰن کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا۔ تو اپنی آنکھ کو ادھر ادھر پھیر کر اچھی طرح دیکھ لے کیا تجھے خدا کی مخلوق میں کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نظر کو چکر دے۔ وہ آخر تیری طرف ناکام لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی مگر اسے کوئی رخنہ نظر نہ آئے گا"۔ سورۃ الملک: آیت ۵ تا ۷)

آپ نے ان آیات کا انگریزی میں ترجمہ بیان کر کے نہایت لطیف تفسیر بیان کی جو کہ ان (حاضرین) کے لئے بڑی حیرت اور ازدیاد علم کا باعث ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس تقریب میں لوگوں نے قرآن کریم کی آیات سنیں اور ان کی پر معارف تفسیر سے مستفیض ہوئے۔

(یہ بھی کتنی خوبصورت اور صاحب بصیرت کے لئے ایمان افروز بات ہے کہ برسوں سے نوبل انعام دینے کی کاروائی ہوتی رہی ہے لیکن اس بار یہ پہلا موقع تھا کہ قرآن کی آیات کی تلاوت اس پر وقار محفل میں کی گئی اور اسی طرح کی ایک منفرد بات اقوام متحدہ کی تاریخ میں بھی رقم ہوئی تھی کہ جب ایک "کافر" نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدارت کرتے ہوئے اس اجلاس کی کاروائی کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ "کافر" بھی عجیب ہیں۔)

"یہ کافر" کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

اس تقریب کی روایات میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں شامل ہونے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاص قسم کا لباس پہنیں جسے سول ڈریس کہا جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب پاکستان کے قومی لباس پگڑی، شیروانی، شلوار اور کھسہ پہن کر اس تقریب میں شامل ہوئے اور آپ اس لباس میں تمام حاضرین میں سب سے نمایاں تھے۔ آپ نے

تقریب سے پہلے ہی منتظمین کو اطلاع دے دی تھی کہ وہ اپنا قومی لباس پہن کر تقریب میں شامل ہوں گے۔ اخبارات نے نمایاں سرخی کے ساتھ یہ بات شائع کی اور لکھا کہ یہ لباس سول ڈریس سے بہتر ہے اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ کسی انعام لینے والے نے اس تقریب میں اپنا قومی لباس پہن کر اس میں حصہ لیا۔

اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے خاکسار کو بھی دعوت نامہ ملا تھا۔ چنانچہ خاکسار اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے گوتن برگ سے سٹاک ہام پہنچ گیا۔ ڈنر کے موقعہ پر سویڈن کے بادشاہ سے ملاقات کرکے اپنا تعارف کرایا اور ان کی خدمت میں کتاب "ESSENCE OF ISLAM" پیش کی جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ اس موقعہ پر کئی دیگر نامور شخصیات کے علاوہ سویڈن کے وزیر اعظم سے بھی تعارف حاصل ہوا۔

اس تقریب سے ایک دن قبل بھی میں اس استقبالیہ میں شامل ہوا تھا جو انعام حاصل کرنے والوں کے اعزاز میں نوبل کمیٹی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس استقبالیہ میں بھی بہت سے نامور سکالرز سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ کتاب مذکورہ کا ایک ایک نسخہ چیئرمین نوبل فاؤنڈیشن، پاکستانی سفیر، فزکس میں انعام لینے والے امریکن سائنسدان اور RUANDA کے سفارت خانہ کی سیکرٹری کو تحفہ کے طور پر دیا اور اپنا تعارف بھی کرایا۔

نوبل پرائز کی تقریب حسب روایات دس دسمبر ۱۹۷۹ء کو سٹاک ہالم کے Concert Hall میں منعقد ہوئی تھی۔ پروفیسر عبدالسلام صاحب کی فیملی کے افراد کے علاوہ مکرم آفتاب احمد صاحب سابق سفیر پاکستان اور مکرم حمید احمد صاحب ابن چودھری غلام حسین صاحب مرحوم ربوہ لنڈن سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تقریب میں شامل ہونے کے لئے تشریف لائے تھے اور مبارک احمد صاحب راجپوت اوسلو سے سٹاک ہالم پہنچ کر تقریب میں شریک ہوئے۔ دیگر مہمانوں میں پاکستان کے سفیر عظمت بخش اعوان بھی شامل تھے۔

کاروائی ساڑھے چار بجے شروع ہونا تھی۔ سوا چار بجے سے پہلے سب مہمان اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سٹیج پر ایک طرف نوبل اداروں کے عہدیداران بیٹھے تھے اور دوسری طرف گذشتہ سالوں میں نوبل انعام لینے والے تشریف رکھتے تھے۔ ان کے درمیان الفریڈ نوبل کا مجسمہ سجا ہوا تھا۔ ہال کی پہلی قطار میں شاہی خاندان کے افراد جن میں بادشاہ سلامت کی دو ہمشیرگان بھی شامل تھیں اور انعام لینے والوں کی بیگمات بیٹھی تھیں۔ پچھلی قطاروں میں انعام لینے والوں کے دوست اور دیگر رشتہ دار بیٹھے تھے اور گیلریوں میں سویڈن کے وزراء، ممبرز آف پارلیمنٹ، اخباری نمائندگان اور دیگر معززین تشریف فرما تھے۔ شاہی بینڈ بھی گیلری میں موجود تھا۔ سوا چار بجے بادشاہ اپنی ملکہ، ولی عہد اور ان کی بیگم کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ بینڈ نے بادشاہ کا نغمہ گایا اور یہ نغمہ ختم ہونے بعد چاروں اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بگل بجا اور دوسرے دروازہ سے انعام لینے والے ایک جلوس کی شکل میں سٹیج پر آئے اور شاہی کرسیوں کے سامنے دوسری طرف بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بینڈ نے قومی ترانہ بجایا اور سب احتراماً کھڑے ہوگئے۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے تقریب کی کاروائی شروع ہوئی۔ نوبل فاؤنڈیشن کے انچارج نے بادشاہ، ولی عہد، سکالرز اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور نوبل اداروں کا تعارف کروایا۔ اس کے بعد انعامات تقسیم ہوئے۔ ہر کمیٹی کے انچارج نے اپنی تقریر میں بتایا کہ متعلقہ مضمون میں انعام حاصل کرنے والوں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور اس کی افادیت کیا ہے۔ آخر میں اس سکالر کا نام پکارا جاتا اور بادشاہ سے درخواست کی جاتی کہ وہ انہیں انعام عطا کریں۔ بادشاہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر سٹیج کے درمیان آکر انعام دیتے۔ سکالر اپنی سیٹ سے اٹھ کر سٹیج کے درمیان آکر انعام وصول کرتا۔ حاضرین تالیوں سے داد دیتے اور سکالر شکریہ ادا کرکے اپنی سیٹ پر واپس چلا جاتا۔

بقیہ صفحہ 98 پر

(انٹرویو: وارث میر روزنامہ نوائے وقت لاہور)

ایک عظیم توحید پرست سائنسدان

"کبھی خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کو کم علم کہا جاتا تھا اب خدا کے وجود سے انکار کرنے والے کو کم علم کہا جاسکے گا"

نوبیل انعام حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو

(مرسلہ: امۃ الحی آسیہ صاحبہ ـــــــ لاہور)

پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبیل انعام حاصل کیا ہے اور ہماری خواہش تھی کہ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ نوبل انعام کے "سیاسی پہلو" پر بھی ان سے تبادلہ خیالات کریں۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی مصروف انسان ہیں ایک طرف تو امپیریل کالج کی نظریاتی طبیعات کی "چیئر" کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وہ ٹرائسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کے ڈائریکٹر بھی ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بین الاقوامی مصروفیات ویسے بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ایک ہفتہ لندن میں اور دوسرا ہفتہ کسی دوسرے یورپی ملک میں ہوتے ہیں۔ برطانوی صحافیوں کیلئے انہیں پکڑنا مشکل ہو رہا تھا بہرحال ہمیں اس میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اور ہم نے ان کے سامنے نوبل پرائز کی سیاست پر بات کر ہی دی۔ ہماری بات ان کے لئے یقیناً غیر متوقع اور اخبار نویسی کے "مہذب" اصولوں کے منافی تھی لیکن انہوں نے بڑے تحمل اور بردباری سے جواب دیا۔

"سائنسی تحقیق میری زندگی بن چکی ہے اور میرے لئے رموز فطرت کی تلاش دراصل خدا کی حکمتوں کی تلاش ہے۔ میں اس انعام کو بھی اللہ کا کرم سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اس کی حکمتوں کی تلاش کرنے والا ذہن ہر قسم کی سیاست بازی سے آزاد ہوتا ہے۔ انعام دینے والوں کی پالیسی پر بحث کرنا میرا کام نہیں ہے لیکن دنیا کا ہر قابل ذکر سائنسدان آپ کو بتائے گا کہ میں ان دنوں پاکستان میں ہوتا یا پاکستان سے باہر۔ برقی مقناطیسیت اور کمزور نیوکلیر طاقت کے بارے میں تھیوری دنیائے سائنس سے اپنا لوہا خود منوا رہی ہے کاروبار فطرت چلانے والی چار قوتوں کا تین قوتوں میں تبدیل ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات تو ہے نہیں کہ دنیا اسے نظر انداز کر سکتی۔ آخری تجربات کے بعد یہ تھیوری سو فیصد Establish ہو جائے گی پھر سوال اٹھے گا کہ تین قوتیں دو میں تبدیل ہو جائیں اور دو بھی ایک ہو جائے اور تب یہ ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا نظام دراصل ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے۔" (ڈاکٹر عبدالسلام انتہائی منکسر المزاج اور بے تکلف شخص ہیں اور سائنسی نکات پر بھی مذہبی نقطہ نظر سے گفتگو کرتے ہیں۔ (اس گفتگو کی تفصیل پیش ہے)

سوال:۔ برطانوی پریس میں یہ بات عام کہی گئی ہے کہ سائنس کی مکمل تصدیق سے پہلے ہی آپ یہ مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس عقیدے کا ہر ایک سے ذکر کرتے ہیں کہ کائنات پر محیط تمام قوانین میں وحدت ہے اور رفتہ رفتہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ باقی تین قوتیں بھی ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے یعنی یہ ساری کائنات ایک ہی ذات کا ظہور ہے۔ تو پھر آپ نے اس پہلو پر بھی غور فرمایا ہو گا کہ فلسفہ وحدت کے نشے میں سرشار بعض صوفیائے کرام شعراء اور ایمان کی اس منزل پر نسبتاً کم دنیاوی علم کے سہارے اور کم عرصے میں کیونکر پہنچ جاتے ہیں؟ خدا سے تعلق رکھنے والوں کی سائنسدانوں پر یہ برتری کیسی؟

جواب:۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ خدا رسیدہ ہستیوں کو سائنس دانوں پر برتری حاصل ہے۔ صوفیائے کرام منتخب لوگ ہوتے ہیں اور سائنس دان ایک عام انسان کی تمام تر بے بضاعتیوں کے ساتھ کائنات

کے اسرار پر غور کرتا ہے لہٰذا دونوں کی اپروچ اور کیفیت میں فرق ہے۔ صوفی کو بھی مقام حیرت سے منزل یقین تک پہنچنے میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے لیکن سائنس دان عمر بھر مقام حیرت کے اردگرد بھٹکتا رہتا ہے اور اسی بھٹکنے میں اس کی جدوجہد کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے۔ فیض نے کہا ہے۔

کئی بار اس کی خاطر' ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں' جس کی حیرانی نہیں گئی

میں بھی سائنس کے ایک طالب علم کے طور پر اسرار کائنات پر غور کرتے ہوئے' مقام حیرت پر ہوں لیکن ساتھ ہی اس کوشش میں ہوں کہ پوری انسانیت پر اس مذہبی عقیدے کی حقانیت واضح ہو جائے۔ کہ کائنات کی تمام قوتوں میں وحدت کا اصول کار فرما ہے اور ہم سب منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ یہ کیفیت خدا رسیدہ لوگوں سے پھر بھی مختلف ہی ہوگی' مغرب کے کئی دانشور' مجھے سوال کرتے ہیں کہ سائنس کے اصولوں میں خدا کہاں سے آٹپکتا ہے تو میں انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتا ہوں۔

"خدا ہی انسانی ذہن کو ایک خاص نکتے کی طرف مائل کرتا ہے اس کی مرضی ہو تو وہ اپنا کوئی راز انسان پر منکشف کرتا ہے۔"

میں دنیا کے بیسیوں سائنس دانوں اور سینکڑوں دانشوروں سے ملا ہوں اور میرا یہ مشاہدہ ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے والا انسان' بہرصورت' خدا کو نہ ماننے والے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے برٹرینڈ رسل سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات بتائی۔

"ایوب خان برطانیہ کے دورے پر آئے۔ بھٹو صاحب بھی ان کے ساتھ تھے ان دنوں ایک بنگالی مسلمان اے ٹی ایم مصطفیٰ وزیر تعلیم تھے۔ اتفاق سے ایوب خان کے دورہ برطانیہ کے دنوں میں برٹرینڈ رسل سے میری ملاقات طے تھی۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ نے بھی برٹرینڈ رسل سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ چل دیئے۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ نے خدا کے وجود کے مسئلے پر برٹرینڈ رسل سے بڑی زور دار بحث کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تو چلے گئے اور میں برٹرینڈ رسل کے پاس رہ گیا۔ بوڑھے برٹرینڈ رسل نے کہا۔

"لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں ۹۶ سال کے برٹرینڈ رسل کو آدھ گھنٹہ کی گفتگو سے خدا کے وجود کا قائل بنایا جاسکتا ہے۔"

چنانچہ یہ بحث میرے ساتھ بھی شروع ہوگئی۔ میں نے کہا خدا کو مانے بغیر انسان کے کردار میں بہت سی بنیادی خرابیاں رہ جاتی ہیں اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ خدا کے ماننے والوں نے انسانیت کی خاطر زیادہ قربانیاں دیں اور وہ خدا کو نہ ماننے والوں کے مقابلے میں بہتر انسان ثابت ہوئے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا۔

"کوئی مثال دو"

ظاہر ہے مثال دیتے ہوئے مجھے بہت محتاط ہونے کی ضرورت تھی کسی ایسے نام کی تلاش تھی جس پر برٹرینڈ رسل اتفاق کر سکے۔ میرے ذہن میں گاندھی کا نام آیا۔ گاندھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آخری سالوں میں اس نے متعصب ہندوؤں کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا اور غالباً مسلمانوں کی طرف نرم رویہ رکھنے کی پاداش میں انہیں قتل بھی کر دیا گیا۔ میں نے برٹرینڈ رسل سے کہا۔

"گاندھی کی شخصیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔"

برٹرینڈ رسل نے بڑی حیرانی سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کس کا نام لیتے ہو گاندھی کا؟ وہ تو نہایت ظالم اور سنگدل انسان تھا۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

برٹرینڈ رسل نے کہا۔ "اس ظالم نے ۴۰ سال کی عمر میں اپنی بیوی کو تمام ازدواجی مسرتوں سے محروم کر دیا تھا اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا۔"

سوال:- برطانیہ میں ذرائع ابلاغ نے یہی تاثر دیا ہے کہ ڈاکٹر

عبدالسلام کا اعزاز برطانوی سائنس کا اعزاز ہے۔ میرے خیال میں ایسے انتظامات بھی کئے جائیں گے کہ اب آپ پاکستان کبھی نہ لوٹ سکیں۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟ مغرب ہی کو اپنی سائنسی تحقیقات کا مرکز بنائیں گے یا وطن لوٹنے کی خواہش بھی دل میں رکھتے ہیں؟

جواب:۔ یورپ ہی میں رہ جانے کے سامان تو بہت پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ٹرائسٹ کے سنٹر کو میرے نام سے توسیع دینے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے اس مقصد کیلئے ۱۰۰ ملین ڈالر کا ایک فنڈ شروع کیا گیا ہے جس کی مدد سے اس قسم کے مزید سنٹر قائم کئے جائیں گے۔ اٹلی کے صوبہ ٹرائسٹ نے مجھے ایک گولڈ میڈل دیا ہے۔ اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی جا رہی ہے اور مزید ایک نئے میڈل اور ایک نئے مکان کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ جان کو آپ کو حیرانی ہوگی کہ میں نے اپنی تحقیقی زندگی کا بیشتر حصہ انگلینڈ اور یورپ میں گزارا اور برطانوی شہریت اختیار کرنے کا خیال تک کبھی دل میں نہیں آیا۔ برطانوی اخبارات کچھ بھی کہیں میں اب بھی اپنے پاکستانی ہونے پر اصرار کرتا ہوں اور مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ برطانوی شہریت لینے سے محترز رہنے کی وجہ یہ بھی رہی کہ میں اپنے اعزاز میں پاکستان کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں ابتدائی تین سالہ قیام کے دوران میں تحقیقی کارکردگی صفر کے برابر تھی۔ وہ سارا عرصہ تو میں طالب علموں کو فٹ بال کھلاتا رہا۔

سوال:۔ فٹ بال کھلاتے رہے؟ آپ کے تعلیمی و تحقیقی کیریئر کا یہ حصہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ وضاحت ہو جانی چاہئے؟

جواب:۔ میری زندگی میں تین اہم موڑ آئے ہیں اور یہیں سے میری زندگی کی نئی راہیں ہموار ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً شروع ہی سے والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس بن جاؤں۔ ممکن ہے میں خود بھی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بن سکتا لیکن اچانک جنگ شروع ہو گئی اور اس مقابلے کے امتحانات ہی نہ ہو سکے۔ اگر امتحانات ہو جاتے اور میں ان میں شریک ہو جاتا تو اس وقت تک میرے کیریئر کی معراج چیف سیکرٹری کا عہدہ ہوتا۔ دوسرا اہم واقعہ ۱۹۴۶ء میں پیش آیا میں نے اسی سال ریاضی میں ایم اے کیا تھا۔ وظیفہ ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا قدرت نے اس کی تدبیر یوں پیدا کی کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے جنگ کے لئے جمع شدہ چندے میں سے کسانوں کے لئے بہبود فنڈ قائم کیا تھا۔ اسی چندے میں سے بیرونی ممالک میں تعلیم کیلئے چھ وظائف کا اعلان کیا گیا۔ ڈاکٹر افضل حسین مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے انٹرویو لیے بغیر مجھے وظیفہ دے دیا۔ بقیہ ۵ وظائف کیلئے کسی کا انتخاب نہ ہو سکا اور اگلے سال تک پاکستان بن جانے کے بعد یہ وظائف ہی ختم ہو گئے۔ قدرت کے انتظامات دیکھئے ۱۴ ستمبر کو کیمبرج میں داخلہ ملا، ۵ ستمبر کو وظیفہ ملا اور ۷ یا ۸ ستمبر تک میں ملک چھوڑ چکا تھا۔ تیسرا موڑ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت کے زمانے میں کاٹنا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوا۔ کالج کے پرنسپل سمجھتے تھے کہ اس کالج کے استادوں کا کام ریسرچ کرنا نہیں۔ گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق "معیاری کالجیٹ" پروان چڑھانا ہے۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا "ہاسٹل کے وارڈن بن جاؤ"، کالج اکاؤنٹس کے انچارج بن جاؤ، یا فٹ بال ٹیم کے صدر بن جاؤ۔ میں فٹ بال ٹیم کا صدر بن گیا۔ ہر شام طالب علموں کو چوبرجی کی گراؤنڈ میں فٹ بال کھلاتا اور ان کے لیے دودھ وغیرہ کا انتظام کرتا۔ دو اڑھائی سال کے بعد پرنسپل نے ہماری سالانہ خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق نہیں ہے انہیں پنجاب یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ ۱۹۵۳ء میں مجھے کیمبرج یونیورسٹی نے پیش کش کی تھی اور میں نے تین ماہ یہ سوچنے میں گزار دیئے تھے کہ پیش کش قبول کروں یا نہ کروں؟ میں اپنا وطن کسی صورت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وطن نہ چھوڑتا تو میں سائنس کا "معیاری" استاد کبھی تسلیم نہ کیا جاتا۔

سوال:۔ نوبل انعام کی روایت، علمی دنیا کو ایک نفسیاتی نقصان بھی پہنچا رہی ہے کہ انعام مل جانے کے بعد علم کے اس میدان میں اس

شخصیت کے نام کی ایسی اتھارٹی قائم ہو جاتی ہے کہ مخالف یا متضاد نقطہ نظر کا آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جواب:۔ سائنس کی دنیا میں کسی کو سند تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کوئی سچا سائنس دان کسی بڑے نام یا ذہنی تعصب کی بنا پر آگے بڑھنے سے نہیں رک سکتا۔ ایک پادری صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی (Relevance of Physics) اس کتاب میں اس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں مختلف فزسٹ غلط ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک انیس سالہ نوجوان مسٹر پاول کی مثال دی تھی کہ اس کے سپرد آئن سٹائن کے کام پر ریویو لکھنا تھا اس انیس سالہ نوجوان نے آئن سٹائن کے نظریات پر اتنا زوردار اختلاف کیا اور اس پر ایسی سخت تنقید کی کہ کسی نے شاید و باید ہی کی ہوگی۔ سائنس میں اسناد نہیں ہوتیں۔ ہر سائنس دان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ سائنس دانوں کی نامکمل تحقیقات کو آگے بڑھانا ہی نئے سائنس دانوں کا کام ہے۔ پاکستان میں بھی اختلاف اور تنقید کی روایت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ سائنس اور علم کی دنیا میں فرسودہ سوچ اور عمل کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوال:۔ آپ پاکستان کی سائنس پالیسی کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب:۔ پاکستان کی سائنس پالیسی؟ کیسی پالیسی؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام بھی سیاسی حکمت عملی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ پاکستان سائنسدان کیلئے قید خانہ ہے اس پر مزید علم اور تجربہ حاصل کرنے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان میں سائنس کا علم کہاں سے آئے گا۔ اگر سائنس کے طالب علم کا ملک سے باہر جانا ناممکن بنا دیا جائے گا۔ بھارت کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہونے کے باوجود ٹرانسٹ میں پاکستان کے ساتھ کبھی غیر مساویانہ سلوک نہیں کیا گیا لیکن اب کسی پاکستانی سائنسدان کو ملک سے باہر جانے کے لئے چھ مختلف ایجنسیوں اور دفتروں سے اجازت نامے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اہل علم ملک سے باہر جانے پر پابندیاں کمیونسٹ ممالک کے بعد پاکستان میں سب سے زیادہ ہے۔

سوال:۔ پاکستان کو تو سائنس کے میدان میں اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ سائنسدانوں کے ملک سے باہر رہ جانے پر تو مناسب پابندیاں ہونی چاہئیں۔ انہیں ملک سے باہر نہ جانے کا پابند بنانے کی پالیسی کہاں سے اور کب آئی؟

جواب:۔ میری وجہ سے اٹلی میں تھیورٹیکل فزکس کے سنٹر میں پاکستانی طالبعلموں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اب الا ماشاء اللہ پاکستانی طالب علموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوا تو بھٹو صاحب کے لئے میری یہ جرات ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ استعفیٰ واپس لینے پر اصرار کرتے رہے اور کہا:۔

"میں آپ کو کسی صورت بھی ضائع نہیں کر سکتا میری مجبوریوں کا احساس کریں۔ مجھ پر اتنا سیاسی دباؤ ہے کہ راتوں سے سو نہیں سکا میری نیند اڑ گئی ہے۔"

میں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا اور بھٹو صاحب نے ٹرانسٹ کے سنٹر میں پاکستانیوں کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ صرف مجھ سے انتقام لینے کے لئے انہوں نے طالبعلموں کو باہر بھجوانے کے سارے اختیارات منسٹری آف اکنامک افیرز کے سپرد کر دیئے۔ موجود حکومت کے ایک وزیر نے مجھے بتایا تھا کہ طالبعلموں کے باہر آنے کا معاملہ بھٹو صاحب نے فنی طور پر اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ طریق کار میں فوری تبدیلی ذرا مشکل بات ہے۔ بھٹو صاحب باقاعدہ فائل پر لکھ گئے تھے کہ طالبعلموں کے باہر جانے کے قواعد میں زیادہ سے زیادہ سختی پیدا کر دی جائے۔

ٹرانسٹ کے ادارے سے پاکستان کا تعلق ختم کرنے کیلئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ ناقابل بیان ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کیلئے میرے میمورنڈم کو لاہور

کی اسلامی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ یہی کمرہ تھا (میں ڈاکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جس میں فرنیچر کی بجائے چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں) راجہ صاحب محمود آباد کی موجودگی میں اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے خیال کو میں نے ڈرافٹ کی صورت دی۔ یہ ڈرافٹ بھٹو صاحب کو بھیجا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس فاؤنڈیشن کا مرکز جدہ ہونا چاہئے اور اسلامی ملکوں کو دو بلین ڈالر کے بجٹ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ۱۹۷۹ء کے آخر میں مسلمان سائنسدانوں کے ایک اجلاس میں میرے ڈرافٹ پر بحث کی گئی لیکن اس اجلاس میں میری شرکت کو ناممکن بنا دیا گیا۔ ۱۹۷۸ء کے آخر میں میری پیش کردہ تجویز پر تمام اسلامی ممالک متفق ہو گئے۔ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی تجویز میرے ذہن میں صرف اس لئے آئی تھی کہ میں اس فاؤنڈیشن کے ذریعے اسلامی سائنس میں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ عرب ملکوں (خاص طور پر سعودی عرب) سے ذمہ دار حضرات میرے پاس آتے رہے کہ ہم آپ کو بلانا چاہتے ہیں لیکن بھٹو صاحب کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ معلوم نہیں بھٹو صاحب کے سیاسی فیصلوں کی بنیاد موجود ہوتی تھی یا وہ بعض فیصلوں کی بنیاد خود مہیا کرتے تھے؟

سوال:۔ آپ نے سعودی عرب کے ذمہ دار حلقوں کا ذکر فرمایا لیکن جس سیاسی فیصلے کا آپ ذکر کرنا چاہتے ہیں، سنا ہے کہ اس پر سعودی عرب بھی اثر انداز ہوا تھا؟

جواب:۔ میں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سعودی حکومت اور شاہی خاندان میں رواداری اور اعتدال کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ نیویارک سے محمد بن فیصل بن سعود کا مبارک باد کا پیغام آیا ہے جس کے الفاظ ہیں۔

"آپ کا اعزاز دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے باعث مسرت ہے۔"

الجزائر اور لیبیا کے مختلف وزراء کی طرف سے بھی تار پہنچے ہیں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر کے گھر میں مختلف مسلمان زعماء اور سائنسدانوں نے میری بہت عزت افزائی کی ہے۔ اسلامک کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر بدوی نے تو بیس مسلمان ملکوں کے سفیروں کو جمع کر لیا تھا اور اپنی استقبالیہ تقریر میں انہوں نے فرمایا ہے کہ "ایک پاکستانی کو نوبل انعام ملنے کے بعد عالم اسلام پر بین الاقوامی انعامات کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ہمارا یہ احساس کمتری بھی ختم ہو گیا ہے کہ خدا کو ماننے والا کبھی بڑا سائنسدان نہیں ہو سکتا اور نئی نسل کیلئے یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اتنا بڑا انعام ایک ایسے پاکستانی کو ملا ہے جس کے عقیدے اور عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔..."

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب! نوبل پرائز کے سیاسی پہلو پر آپ کی گفتگو تشنہ ہی رہی تھی؟

جواب:۔ جہاں تک میرے انعام کا تعلق ہے اس سے مغربی دنیا میں پاکستان کا وقار بلند ہوا ہے نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انعامات کا سلسلہ ۱۹۰۱ء میں شروع ہوا۔ امریکن نوبل پرائز لینے والوں کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ کل انعام یافتگان کی تعداد (جنگ کے بعد) پانچ سو کے قریب ہے۔ ان میں سے ۳۲ انگریز ہیں اور ۱۲ جرمن ہیں۔ ایک سو امریکی انعام یافتگان میں سے ۵۴ یہودی ہیں۔ امریکہ میں تین فیصد یہودی ہیں۔ لیکن پروفیسر شپ کا دس فیصد یہودیوں کے پاس ہے۔

سوال:۔ یہودیوں میں زیادہ سائنسدان پیدا ہونے کی وجہ؟

جواب:۔ حکومتی اور خاندانی سطح پر علم اور سائنس کی قدر افزائی کی پالیسی، یہودی اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے وقت سائنسدانوں اور عالموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عالم اور سائنسدان کا معاشرتی مقام بلند ترین تصور کیا جاتا ہے۔ اور ان کی ترقی کا ایک بڑا راز اس قدری نظام میں پوشیدہ ہے اس کے برعکس پاکستان میں طالبعلم آسان مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور معاشرے میں عزت و احترام کے معیار سیاست، دولت اور سرکاری عہدوں کے حوالے سے متعین ہوتے ہیں۔ پاکستان میں سائنسی علوم کے بارے میں نہ کبھی حکومت

سنجیدہ ہوئی ہے۔ نہ تعلیمی ادارے اور نہ ہی خاندانی اور معاشرتی سطح پر ان علوم کو کوئی عزت و توقیر حاصل ہے۔ البتہ مذہب اور خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں "پاکستان والو! خدا اور مذہب کی صحیح پہچان پیدا کرنا چاہتے ہو تو سائنس پڑھو ورنہ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ میں نے تو پاکستان والوں کے لئے Space کمیٹی بھی بنائی تھی اور اٹامک انرجی کمیشن بھی قائم کیا تھا۔

سوال:۔ ہم دونوں نے گفتگو سے پہلے سچ بولنے کا عہد کیا تھا میں ایک ناخوشگوار سا سوال ضرور کروں گا اس اسرائیلی مشن کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں' جو پاکستان میں ہمیشہ زیر بحث رہا اور اس کو بنیاد بنا کر آپ کے ہم مسلک بھائیوں پر شدید تنقید بھی کی جاتی رہی ہے اور ممکن ہے آپ لوگوں کے متعلق قومی اسمبلی سے فیصلہ لیتے ہوئے بھی اس "افواہ" کو استعمال کیا گیا ہو۔ (پاکستانی سادہ لوح عوام کو مشتعل کرنے اور احمدی احباب سے متنفر کرنے کیلئے پاکستانی "علماء" اور مولوی ایک بھونڈا سا فقرہ کہا کرتے ہیں کہ جماعت احمدیہ کا اسرائیل میں تبلیغی مشن ہے جس سے ثابت ہوا کہ یہ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ انٹرویو کرنے والے صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔ مدیر)

جواب:۔ یہ پاکستانی مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اکثر گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار بنتے ہیں یہ محض بہتان ہے اور میں پوری ذمہ داری سے اس کی تردید کرتا ہوں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اسرائیل کے قیام سے پہلے کے زمانے میں بعض عرب بھائی حیفہ میں آباد ہیں اور وہ ہمارے ہم مسلک ہیں۔ اسرائیل ان کا وطن ہے اور ہم انہیں وطن بدر نہیں کر سکتے۔ باقی محض افواہیں اور بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے۔ رہا میری ذات کا تعلق تو مجھ سے سائنسدان ہونے کا اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔ چند بے خبر اور لاعلم بھائی میرے بارے میں کچھ ہی کہیں میں ایک سائنس دان تو بہرصورت رہوں گا۔ بوعلی سینا کو اس کی زندگی میں زندیق کہا گیا لیکن وہ فوت ہو گیا تو لوگوں کو صرف سائنسدان بوعلی سینا یاد رہ گیا۔ کتنے لوگوں کو بوعلی سینا کے اخلاقی عیوب کا علم ہے۔ میرے اپنے جذبات تو یہ ہیں کہ میں صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اٹلی کی طرح کے ادارے میں اور ملکوں میں بھی قائم کر سکوں اور دنیائے اسلام کو فائدہ پہنچا سکوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اٹلی کے سنٹر میں بیک وقت چودہ انعام یافتگان ۲۵ ڈالر روزانہ کے معاوضے پر کام کرنا بھی باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اب تو میری حیثیت اور پوزیشن میں پہلے سے کہیں اضافہ ہو چکا ہے۔ ان علماء کی خدمات سے بہتر طریقے سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں سائنس کا ایسا ذوق و شوق پیدا ہو جائے کہ ہر مسلمان سائنسدان ہر سال ایک پرائز حاصل کرے میری تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں سائنسی تحقیقات کا ایک اعلیٰ ترین ادارہ قائم کر جاؤں میں اسی سلسلے میں لیبیا جا رہا ہوں۔

سوال:۔ پاکستان آپ کے ذہن میں نہیں ہے؟

جواب:۔ انعام وصول کرنے کے بعد پاکستان جانے کا ارادہ بھی ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے سلسلے میں کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے میں نے ایوب خان اور بھٹو کے ساتھ کام کیا ہے پاکستان کا کوئی حکمران سائنس کی اہمیت سے آگاہ نہیں رہا۔ بھارت کے جواہر لال نہرو خود سائنس کے طالبعلم تھے۔ لینن سائنس کا طالب علم تھا۔ یہ لوگ سائنسی ذوق رکھتے تھے۔ پاکستان میں آج تک سائنس کا کوئی سنجیدہ طالب علم سیاسی طور پر برسراقتدار نہیں آیا۔ جاپان نہایت مختصر عرصے میں صنعتی دوڑ میں مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے اس کی وجہ؟ اس کی بڑی وجہ جاپان کے ابتدائی نظام تعلیم میں سائنس کے مضامین کی بے پناہ اہمیت ہے۔ جاپان میں میٹرک کے امتحانی زمانے کو "خودکشی کا موسم" کہا جاتا ہے۔ جاپان کے ۱۸۶۷ء کے انقلابی آئین میں ایک شق بہت اہم تھی۔ "علم حاصل کیا جائے گا دنیا کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی قیمت پر" ۱۹۳۵ء میں ایک جاپانی سائنسدان "یوکاوا" کو تھیوریٹیکل فزکس میں پہلا نوبل انعام ملا تھا۔ جاپان کے فارن آفس کے ایک ذمہ دار افسر نے اس وقت کے اپنی

قلبی تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ "یہ وہ دن تھا جب سے مجھے اپنے جاپانی ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جاپانی سائنسدان "یوکاوا" کے آئیڈل کو آگے بڑھانے کیلئے زندگی بھر کام کروں گا۔" اس شخص نے جاپان میں سائنس کو آگے بڑھانے کے لئے واقعی قابل قدر کام کیا۔ ضمناً عرض ہے کہ میرے نوبل انعام کی خبر ملنے پر الطاف گوہر صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ "ڈاکٹر صاحب! میرا احساس یہ ہے کہ یہ انعام آپ کو نہیں مجھے ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں سائنس کا ہر طالبعلم یہی محسوس کرے اور خود بھی انعام حاصل کرنے کیلئے شب و روز مصروف ہو جائے اور سائنس کے میدان میں مغرب کی فوقیت کا تاج اس کے سر سے اتار لے۔"

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب! ایک بہت بڑا سوال ابھی باقی ہے موجودہ تھیوری کو تو آپ نے ۱۹۷۳ء میں ثابت کرایا تھا۔ اس سے آگے کتنا بڑھے ہیں؟

جواب:۔ یعنی آپ تین قوتوں کو دو میں تبدیل کرنے کے لئے بے چین ہیں یہ سوال آپ کو ضرور کرنا چاہئے تھا۔ پاکستان کے بعض حلقوں کو غالباً میری ان کوششوں کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ میں اور جے سی پتی نیوٹرینو (Neutrino) کی تھیوری پر کافی کام کر چکے ہیں۔ اب تک سائنسی عقیدہ یہ چلا آ رہا ہے کہ قدرت نے پروٹون اور الیکٹرون جتنی تعداد میں بنائے ہیں وہ ہمیشہ اتنی ہی تعداد میں رہیں گے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اب سرن میں تجربات ہو رہے ہیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے لیکن یہ دیکھنے کیلئے کائنات کی زندگی سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہنا ہوگا یعنی پروٹون (۱۰۳۰) سال کے بعد مثبت الیکٹرون اور نیوٹرینو میں تبدیل ہو جائے گا ہم نے پہلی تھیوری ۱۹۷۳ء میں ثابت کر دی تھی اس پر اعتراضات کئے گئے۔ لیکن ۱۹۷۸ء میں سٹینفورڈ کے تجربات نے بتایا کہ اعتراضات غلط تھے اور ہم صحیح کہتے تھے پارٹیکل فزکس میں ہماری نئی تھیوری کی رہنمائی میں امریکہ اور سرن والوں کے دو گروپ بن گئے ہیں اور ان کا باہمی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک میل گہرے غار میں دس ہزار ٹن پانی رکھا جائے گا۔ کل پروٹون میں سے جب کبھی ایک پروٹون Decay کرے گا تو ایک شعاع نکلے گی جس دن یہ شعاع دیکھ لی گئی سمجھ لیجئے گا کہ دوسری تھیوری بھی صحیح ثابت ہو گئی۔ آج کل اس تجربے کیلئے غار کی تلاش جاری ہے۔ یہ غار بھارت میں تو یقیناً مل جائے گی۔ پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کھیوڑہ کی پہاڑیاں بہت چھوٹی ہیں اور غار کا کافی گہرا ہونا ضروری ہے۔ ۱۹۷۳ء میں افریقہ کی ایک غار میں تجربہ کیا گیا تھا لیکن پانی کا وزن صرف سو ٹن تھا اور سو ٹن پانی میں روشنی دیکھنے کیلئے سو سال کی ضرورت تھی۔

سوال:۔ نوبل انعام پانے والا کتنے ہی مضبوط دل و دماغ کا انسان کیوں نہ ہو، یہ انعام اس کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور ڈالتا ہے ایسے بھی ہوں گے جو اپنے کام میں پہلے سے زیادہ مگن ہو جاتے ہوں اور ایسے بھی ہوں گے جو خوشی سے پھول جاتے ہوں گے۔ آپ پر کیا اثر ہوا؟

جواب:۔ میں تو اللہ کا شکر بجا لایا۔ ویسے انعام کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے کئی پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ علم کا شعبہ کون سا ہے؟ معاشرہ کون سا ہے اور شخصیت کا مزاج کیسا ہے؟ مثلاً نظریاتی طبیعات میں اتنا زبردست مقابلہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سال کے لئے پاؤں پسار لینے والا سائنسدان زندہ نہیں رہ سکتا۔ انعام پانے کے بعد چوڑا ہو جانے والی بات پاکستان میں ممکن ہو سکتی ہے یہ بات جنگ سے پہلے جرمنی میں بھی ممکن تھی اور کسی حد تک امریکن معاشرے میں بھی اسی قسم کے خطرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ امریکنوں میں یہ انعام بھی تو بہت تقسیم ہوتا ہے لیکن میرے دائرہ کار میں ایسا کوئی عنصر یا محرک نہیں پایا جاتا جو سائنس میں میرے انہماک کو تقسیم کر دے۔

سوال:۔ ہر عہد کے سائنسی نظریات نے فلسفے کی دنیا کو بھی متاثر کیا ہے اور نظریاتی فزکس کی طرح اب تو بوا اور سائنٹفک فلسفی بننے کیلئے ریاضی دان ہونا بھی ضروری ہے آپ کی تھیوری عصر حاضر کے نمایاں

بقیہ صفحہ 89 پر

آپ کے علم و معرفت میں کمال کا ایک اعتراف ـــــ نوبل انعام

سویڈن کے بادشاہ آپ کو فزکس کا نوبل انعام دیتے ہوئے

KUNGLIGA
SVENSKA VETENSKAPSAKADEMIEN
HAR DEN 15 OKTOBER 1979
BESLUTAT ATT MED DET
NOBELPRIS
SOM DETTA ÅR TILLERKÄNNES DEN
SOM INOM FYSIKENS OMRÅDE GJORT
DEN VIKTIGASTE UPPTÄCKTEN
ELLER UPPFINNINGEN
GEMENSAMT BELÖNA
ABDUS SALAM
SHELDON L. GLASHOW OCH STEVEN WEINBERG
FÖR DERAS INSATSER INOM TEORIN
FÖR FÖRENAD SVAG OCH ELEKTROMAGNETISK
VÄXELVERKAN MELLAN ELEMENTARPARTIKLAR,
INNEFATTANDE BLAND ANNAT FÖRUTSÄGELSEN
AV DEN SVAGA NEUTRALA STRÖMMEN

STOCKHOLM DEN 10 DECEMBER 1979

نوبل انعام کے ساتھ ملنے والی سند کا عکس
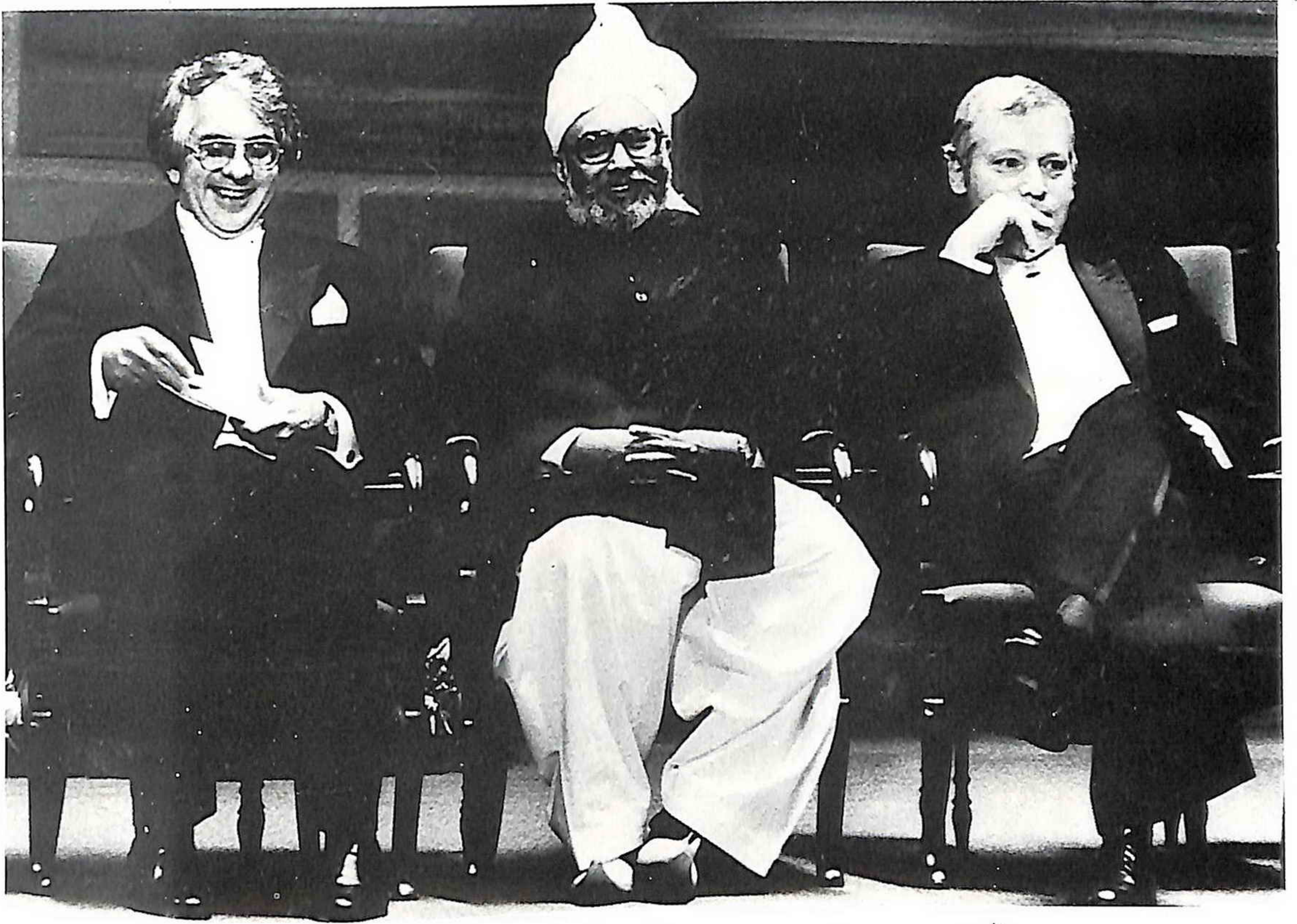
ڈاکٹر صاحب اپنے دوسرے دوساتھیوں کے ہمراہ جنہیں نوبل انعام دیا گیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے سینہ سے انسان نکلتا ہے

ڈاکٹر صاحب سلسلہ کے چند بزرگ علماء کے جلو میں

(دائیں سے بائیں) حضرت مولوی محمد حسین صاحب رفیق حضرت مسیح موعودؑ، حضرت صوفی بشارت الرحمٰن صاحب، مکرم پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب سابق پرنسپل
[illegible] رفیق حضرت مسیح موعودؑ ۔ ۱۳) کے علاوہ انتہائی دائیں مکرم محمود احمد صاحب شاہد اور پس منظر میں مکرم چوہدری شبیر احمد صاحب
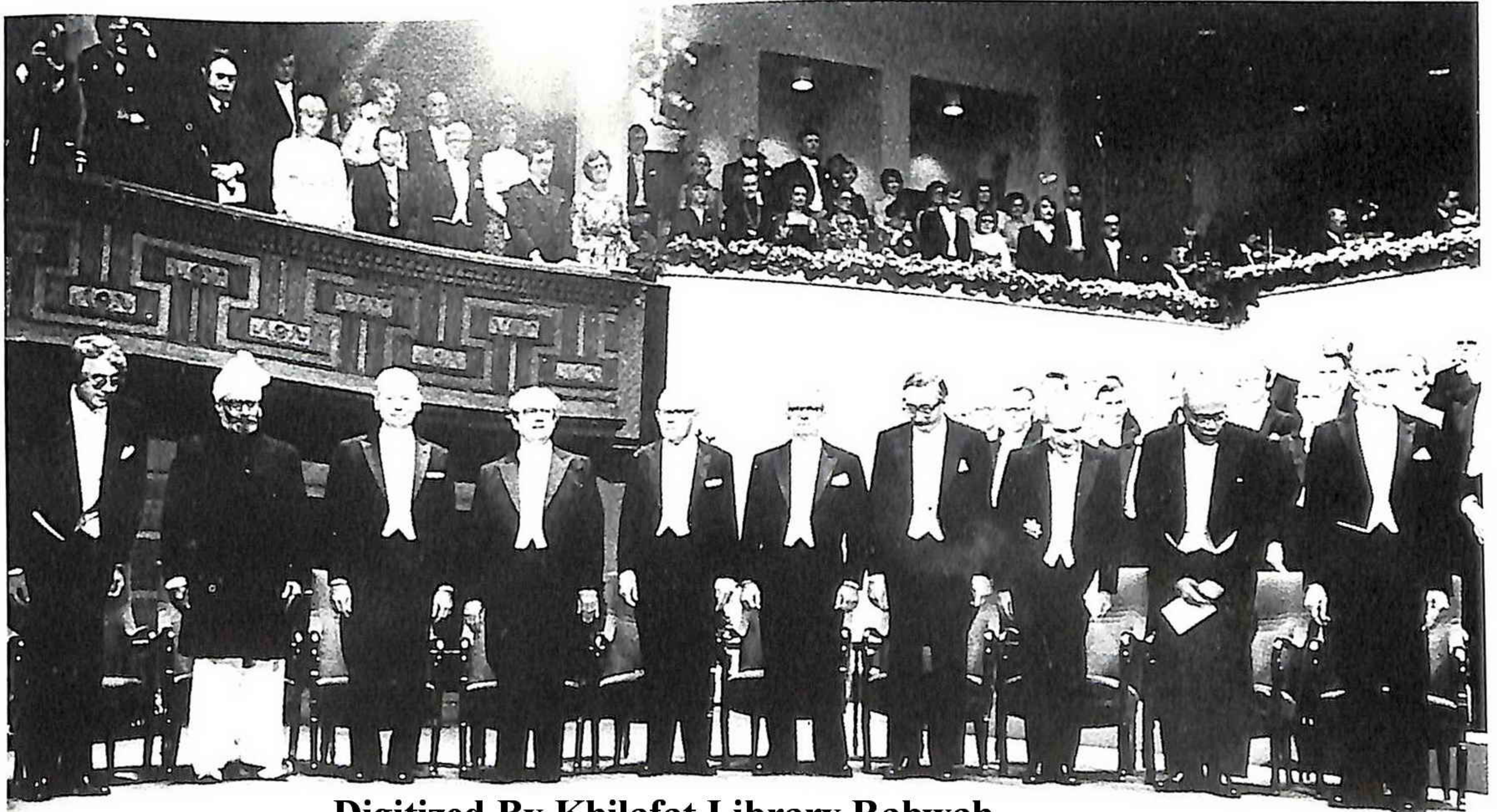
لگتا تھا دیکھنے میں جو انسان کم سخن
جب بولنے پہ آیا زمانے پہ چھا گیا
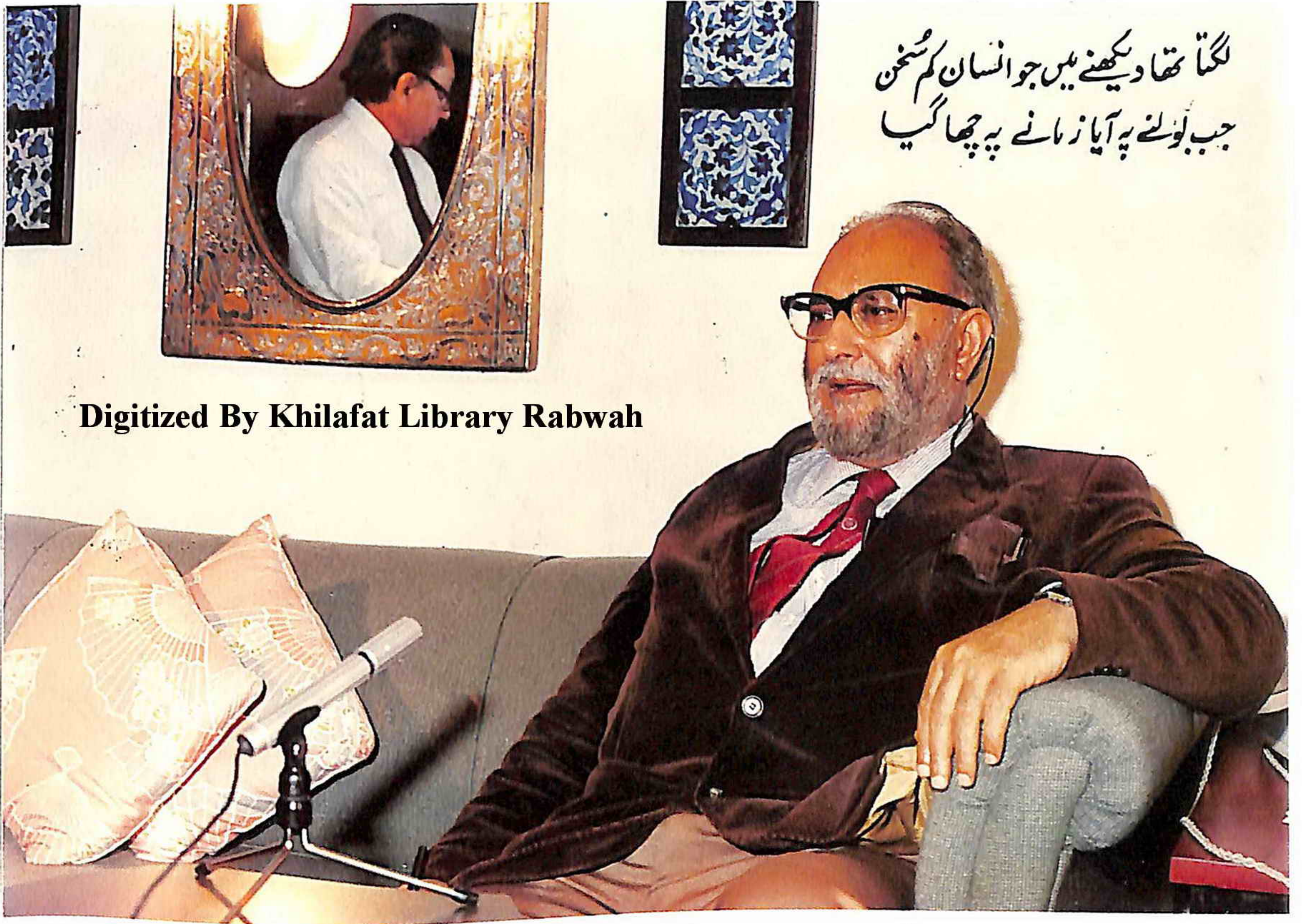
نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد ربوہ تشریف آوری پر ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں دعوت۔ آپ کے بائیں حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ اور دائیں مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل اعلیٰ تحریک جدید۔ پیچھے مکرم محمود احمد صاحب شاہد صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک مختصر خطاب

نوجوانوں کیلئے ایک پیغام

(مرسلہ :- مکرم لطیف احمد صاحب کاہلوں)

یہ ۱۹۷۱ء کے زمانہ کی بات ہے۔ ساہیوال میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے برادر نسبتی مکرم چوہدری نور الدین صاحب جہانگیر وفات پا گئے۔ تو آپ اپنے اس عزیز کی تعزیت کیلئے ساہیوال تشریف لے گئے۔ خاکسار بطور مربی ان دنوں وہاں مقیم تھا۔ جناب ڈاکٹر صاحب مغرب کی نماز کیلئے "بیت مبارک" ساہیوال میں تشریف لائے تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کی کہ آپ احباب جماعت سے کچھ خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بغیر تردد کے حامی بھرلی چنانچہ نماز کے فوراً بعد آپ نے ایک نہایت مختصر سی تقریر کی مگر آپ اپنے اس چھوٹے سے خطاب میں بہت بڑا پیغام دے گئے۔ آپ نے فرمایا۔

دنیا کی دوڑ میں اپنے آپ کو منوانے کیلئے سب سے زیادہ کارگر اور کامیاب ہتھیار علم ہے۔ اگر آپ دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں تو علم کے میدان میں اپنا لوہا منوانا ہوگا اور پھر ساتھ ہی یہودیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ مٹھی بھر یہودی اپنی علمی برتری کی وجہ سے تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور بڑی بڑی حکومتیں بھی ان کی مرہون منت ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر آپ جائزہ لیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس وقت دنیا کا بہترین ڈاکٹر یہودی ہے۔ بہترین سائنسدان یہودی ہے۔ بہترین تاجر یہودی ہے غرضیکہ علم کے بل بوتے پر یہودی دنیا کے ہر میدان میں چھائے ہوئے ہیں۔ پس اگر ہم دنیا میں کوئی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کے محاذ پر مورچہ بند ہو جانا چاہئے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے یہودی قوم کے علمی جنون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہودی ماؤں کو علم سے اس قدر عشق ہے کہ وہ طالمود جو ان کی روایات کی کتاب ہے کا وہ حصہ جو علم کی اہمیت سے متعلق ہے اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی حفظ کروا دیتی ہیں۔ آپ نے یہودی ماں کی علم سے لگن اور دیوانگی کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ علم کی محبت ان کے ذہنوں پر اس طرح حاوی ہے کہ اگر کسی یہودی ماں کا جوان بیٹا پانی میں ڈوب رہا ہو تو اس وقت بھی جب کہ اسے انتہائی مختصر الفاظ میں پکار کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہیں کہتی کہ میرے ڈوبتے ہوئے بیٹے کو بچاؤ بلکہ اس وقت بھی وہ یہی چلائے گی ہائے میرے ڈوبتے ہوئے بی۔ اے بچے کو بچاؤ۔ ہائے میرے ڈوبتے ہوئے ایم۔ اے بچے کو بچاؤ۔ گویا ایسی ہنگامی صورت حال میں بھی اس کے ذہن سے علم کی اہمیت نظرانداز نہیں ہوتی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے اس مختصر سے خطاب میں نہ صرف دنیا کا فاتح بننے کا گر بتایا گیا بلکہ علم کی ترویج کیلئے جو آپ کے ذہن میں ایک جنون تھا اور جس کے لئے وہ تمام عمر نوع انسان اور خاص طور پر پاکستانیوں کیلئے تڑپتے رہے اس کی بھی ایک جھلک تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور کاش کوئی فرد یا قوم اس پیغام پر کان دھرے۔ آمین

بقیہ از صفحہ 88

فلسفیانہ رجحانات پر کیونکر اثر انداز ہوگی؟

جواب:۔ خدا بیزار اور وجود پرست فلسفے کی "ڈاچی" کی مہار بے یقینی سے یقین کی طرف موڑ دی جائے گی۔ کبھی خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کو کم علم کہا جاتا تھا۔ اب خدا کے وجود سے انکار کرنے والے کو کم علم کہا جاسکے گا......"

(بشکریہ "نوائے وقت" ۳ دسمبر ۱۹۷۹ء)

ع صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

پروفیسر عبدالسلامؒ ۔۔ ایک عہد ساز شخصیت اور عظیم استاد

(پروفیسر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب ڈین فیکلٹی آف نیچرل سائنسز قائداعظم یونیورسٹی ۔ اسلام آباد)

پروفیسر عبدالسلام جن کے افکار سے نصف صدی تک فزکس کی دنیا منور ہوتی رہی '۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کی صبح آٹھ بجے طویل علالت کے بعد اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اس طرح نہ صرف پاکستان بلکہ ساری تیسری دنیا اس عظیم محسن کی مزید خدمات سے محروم ہو گئی۔

سلام صاحب فزکس کے میدان میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور وقت کی دیوہیکل شخصیات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلام صاحب نے تقریباً تین سو تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور پارٹیکل فزکس کے کئی ایک شعبہ جات میں ایسے قابل ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں جن سے مادے کے بنیادی ذرات اور قدرت کی بنیادی قوتوں کے متعلق انسانی علم میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔

سلام صاحب کا ایک شہرہ آفاق کام

Parity Violation in Weak Interactions

سے متعلق تھا۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو امریکی سائنسدانوں کو اس پر نوبل پرائز دیا گیا۔ ہماری نظر میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سلام صاحب اور روسی سائنسدان Landau کو بھی اس میں شامل کیا جاتا۔ کیوں کہ انہوں نے بھی الگ الگ اس پر کام کیا تھا۔ سلام صاحب کا سب سے مشہور کام

Unification of Weak and Electromagnetic Forces

تھا۔ جس پر انہوں نے دو امریکی سائنسدانوں کے ساتھ سن اناسی کا نوبل انعام Share کیا تھا۔ اس کام میں دو بنیادی قوتوں Weak اور electromagnetic کو یکجا کیا گیا ہے۔ گویا وہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میکسویل (Maxwell) نے تقریباً سو سال پہلے Electricty اور Magnetism کو یکجا کیا تھا اور اس سے ڈیڑھ سو سال پہلے نیوٹن نے فلکی اور ارضی کشش ثقل کو۔ چنانچہ سلام صاحب کا یہ کام اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

اس وحدت کے نظریئے کے بعد سلام صاحب اور دوسرے سائنسدانوں نے عظیم وحدت Grand Unification کا نظریہ پیش کیا۔ جس میں Weak فورس اور Electromagnetic فورس کے ساتھ Strong Nuclear Force کو شامل کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں پروٹون جو ایک Stable پارٹیکل سمجھا جاتا ہے unstable قرار پایا۔ مذکورہ ماڈل کے حوالہ سے پروٹون کا Lifetime 10^{31} سال سے زائد ہے۔ اس نظریہ کو پرکھنے کیلئے دنیا کی کئی ایک تجربہ گاہیں سرگرم عمل ہیں۔ سلام صاحب کیلئے Grand Unification سفر کی آخری منزل نہ تھی۔ شاید انہی کے لئے کہا گیا تھا کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

چنانچہ انہوں نے نت نئے خیالات اور نظریات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن میں

Super strings, super gravity, super symmetry اور Theory of Everything شامل ہیں۔ سلام صاحب کے فلسفہ حیات کے مطابق زندگی ایک مسلسل سائنسی عمل ہے۔ جس کو وہ مذہبی فریضہ بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے خیالات و افکار کو قرآنی آیات سے ہم آہنگ کرتے تھے۔ ان کی ایک پسندیدہ آیت کریمہ جس کو انہوں نے بار بار اپنے لیکچرز میں دہرایا ہے پیش خدمت ہے۔

...اَلَّذِی خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَاتَرٰی فِی خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ھَلۡ

تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ○

"اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے (اے دیکھنے والے) کیا تو رحمن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر۔ تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔"

سلام صاحب کو بے شمار انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے دنیا میں تیس سے زائد اکادمیوں اور سوسائیٹیوں نے انہیں اپنا فیلو یا ممبر بنایا ہے اور چالیس سے زیادہ یونیورسٹیوں نے اعزازی D.Sc ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگریاں دی ہیں۔

سلام صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ان کا شمار نہ صرف اس صدی کے اعلیٰ ترین سائنسدانوں میں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک زبردست ایڈمنسٹریٹر بھی ثابت ہوئے۔ اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹر کا قیام اور اس کے ذریعہ علوم طبیعات کی تحقیق اور فروغ ان کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ان کی ذات تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ سلام صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ تیسری دنیا میں تحقیق کی کوئی روایات نہیں ٹیکنالوجی بہت پسماندہ ہے اور نظام تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ۔ چنانچہ انہوں نے سنٹر کے ذریعے بہت سے ایسے پروگرام دیئے جن سے تیسری دنیا کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں سرعت کے ساتھ پیش رفت ہو سکے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے انہوں بحیثیت سائنسی مشیر صدر پاکستان نظام تعلیم کی منصوبہ بندی کی اور ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کے متعدد پروگرام دیئے۔ سلام صاحب کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک کو "سائنس برائے اقتصادی ترقی" کی زیادہ ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سنٹر میں Applied Physics کے پروگرام شروع کروائے۔ مثلاً لیزرز، سولر انرجی، پلازما فزکس اور کنٹرولڈ فیوژن، بائیو فزکس، جیالوجی Climatalogy, Soil Physics وغیرہ۔ ساتھ ساتھ لیبارٹری ٹریننگ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اب تک سنٹر میں چار ایسی لیبارٹریاں قائم کی جا چکی ہیں۔

Microprocessor Laboratory, Superconductivity Laboratory, Lasers and Optical Fibers Laboratory and Climatolgy Laboratory.

پروفیسر سلام نے ذاتی طور پر بھی تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے ممالک کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے Applied Physics کے مختلف مضامین کی طرف توجہ دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ خاص طور پر انہوں نے پاکستانیوں کو اس کام پر آمادہ کیا۔ چنانچہ چند دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی اپنے سابقہ مضمون کو خیرباد کہا اور Plasma Physics and Controlled Fusion کو اپنایا۔ آج میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے پندرہ بیس سال کی کوشش کے نتیجے میں آج یہ مضمون پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔ درجنوں سائنسدان مختلف اداروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں اس مضمون میں تدریس کا کام کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ اطمینان بخش بات ہے کہ میں نے اپنے عظیم اور محترم استاد پروفیسر عبدالسلام کی خواہش کے مطابق اور ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اور اس طرح پاکستان کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

سلام صاحب سنٹر کو کس طرح چلاتے تھے اس کی نظیر شاید ہی دنیا میں کہیں ملتی ہو۔ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ سلام صاحب 1964ء میں ٹریسٹ سنٹر کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ چار سال تک یہ سنٹر ٹریسٹ شہر کے بیچ Plazza Oberdan میں واقع ایک بلڈنگ میں عارضی طور پر چلتا رہا اور بالآخر ۱۹۶۸ء میں اس کی اپنی نئی عمارت مکمل ہو گئی جو ٹریسٹ کے مضافات میں خوبصورت مقام Miramore میں واقع ہے۔ اس موقعہ کی یاد میں سلام صاحب نے ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کروائی جس کا موضوع تھا Contemporary Physics "ہمعصر طبیعات" یہ کانفرنس فزکس مضمون کے پورے سپیکٹرم پر محیط تھی۔ اس مہینہ بھر کی کانفرنس میں تین سو سے زائد لوگوں نے شرکت کی جن میں بہت سے تیسری دنیا سے تھے۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں تھا۔ غور کریں کہ تیسری دنیا کا ایک سائنسدان جو عام طور پر کنوئیں کے مینڈک کی طرح دنیا سے الگ تھلگ (Isolated) رہتا ہے۔ مہینہ بھر ایک ایسے ماحول میں گزارتا ہے جہاں اس صدی کے نامور

سائنسدان موجود ہیں۔ ایسی ہستیاں جن کا ذکر کتابوں اور رسالوں میں پڑھا ہوتا ہے آپ ان کے ساتھ کئی دن گزارتے ہیں۔ ان کو سنتے ہیں ان سے باتیں ہوتی ہیں۔ اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ دن کے معمول والے اجلاسات (Sessions) کے علاوہ شام کو سپیشل لیکچرز کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لئے موجودہ صدی کے چوٹی کے چھ سائنسدانوں کو مدعو کیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔

Wigner, Hans Bethe, Dirac, Heisenberg, Oscar Klein, اور Landau (Landau) بیماری کی وجہ سے خود تو نہ آسکے۔ ان کی طرف سے ان کے مشہور ساتھی Lifshitz تشریف لائے۔) یہ گرینڈ اولڈ ماسٹرز وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اس صدی کی فزکس کی تحقیق و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ گویا کہ شام کے یہ لیکچرز "فزکس کی کہانی، اس کے خالق کی زبانی" کا پروگرام تھا۔ جن میں وہ لوگ ان واقعات، کیفیات اور پس منظر کا بھی ذکر کرتے جو انہیں اپنے تخلیقی سفر میں پیش آئے تھے۔ ایک شام Heisenberg کا لیکچر تھا۔ Dirac بھی موجود تھے۔ دونوں نوبل انعام یافتہ، خیال رہے کہ سلام صاحب ابھی اس الیٹ (Elite) کلب کے ممبر نہیں بنے تھے۔ میزبان ہونے کی حیثیت سے سلام صاحب سٹیج پر آئے اور یہ واقعہ سنایا۔ صدیوں پہلے ایران کے بادشاہ کے ہاں کسی پڑوسی سلطنت کے بادشاہ مدعو ہوئے دونوں بادشاہ دربار میں تشریف فرما ہیں اور ساتھ ایران کے بادشاہ کے وزیر باتدبیر بھی بیٹھے ہیں۔ مشروبات پیش کی جاتی ہیں وزیر کے لئے اب مسئلہ ہے کہ مشروب پہلے اپنے بادشاہ کو پیش کرے یا مہمان بادشاہ کو، دونوں صورتوں میں اعتراض کی گنجائش نکلتی ہے۔ پرانے بادشاہوں کے وزیر تو سیانے ہوا کرتے تھے۔ اس لئے اپنے بادشاہ کی طرف مشروب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک بادشاہ کو ہی زیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے بادشاہ کو مشروب پیش کرے۔

(It befits one king to present to another)

یہ واقعہ سنا کر سلام صاحب نے کہا آج میری بھی وہی کیفیت تھی مگر اس وزیر باتدبیر نے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے تو میں دعوت دیتا ہوں کہ جناب Dirac تشریف لائیں اور Heisenberg کو متعارف کروائیں۔

It befits one Noble Laureate to introduce another.

اس کانفرنس کا ماحول جداگانہ اور نرالا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک سہانا خواب دیکھ رہے ہیں۔ فزکس کی دنیا کے ستارے ہر طرف جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔ اتنا Stimulating اور inspiring ماحول یقیناً یہ ایک Life-time experience تھا۔ یہ کام صرف اور صرف سلام صاحب کی انوکھی اور بے مثال شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ نوبل انعام سائنسدانوں کی معراج ہے۔ تحقیق کے میدان میں متعارف لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سائنس کی دنیا کتنی بے رحم ہے اور کس بے دردی سے دوسروں کے خیالات و نظریات کو پرکھتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ امریکہ دوسرے شعبہ جات کی طرح سائنس میں بھی اجارہ داری رکھتا ہے۔ اس کا غرور، نخوت اور تعصب دنیا کے کسی دوسرے علاقہ کے لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ سلام صاحب کے لئے دوہرا مسئلہ تھا۔ ایک تو غیر امریکی اور دوسرے ترقی پذیر ملک کے کالے باشندے۔ مگر آفرین اس جھنگ کے فرزند پر جس نے چند سالوں میں اپنی علمیت کے بل بوتے پر سارا یورپ فتح کر لیا اور اس طرح سلام صاحب امریکہ کے مقابل یورپ کے نمائندہ لیڈر سمجھے جانے لگے۔ سلام صاحب کو پورا اعتماد تھا کہ نوبل انعام ان کا مقدر بن چکا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انہوں نے امریکہ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنا کام پیش کیا۔ دوسرے دن انٹرنیشنل پریس میں تصویریں چھپیں جس میں سلام صاحب اور Professor Oppenheimer جو کانفرنس میں صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے سٹیج پر کھڑے ہیں۔ تصویر کا Caption تھا۔

Salam is asking Prof. Oppenheimer: Give me my noble prize

یاد رہے پروفیسر اوپن ہائمر ایک مایہ ناز تھیوریٹیکل فزسسٹ تھے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم پراجیکٹ کے انچارج تھے جس کا خفیہ نام مین ہٹن پراجیکٹ تھا۔

سلام صاحب کی تمام تر خوبیوں کے باوجود نوبل انعام حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ دو تین دفعہ نوبل انعام کے قریب پہنچ کر بھی کامیاب نہ ہوئے۔ اور اس میں شاید مغرب کا تعصب تھا اور ڈاکٹر صاحب کو

اس کا احساس بھی تھا۔ کیونکہ امریکی سائنسدان حسب عادت مذکورہ تھیوری کا بیان کرتے وقت دوسرے امریکی سائنسدانوں کا تو ذکر کرتے مگر سلام صاحب کا نام نہ لیتے۔ اسی احساس کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ہمیں ایک دفعہ بتایا کہ امریکیوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ میں ارادتاً کانفرنسوں میں جاتا ہوں اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سپیکرز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہوں تا کہ وہ ہمارے کام کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا نام لینا نہ بھول جائیں۔

1979ء میں جس دن سلام صاحب کے نوبل انعام کا اعلان ہوا میری خوش قسمتی کہ میں ٹریسٹ سنٹر میں تھا۔ انعام کی خبر پہنچتے ہی پورے ٹریسٹ شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر سلام صاحب کی باتیں اور پاکستان کے چرچے ہونے لگے۔ اسی طرح کئی دن اخبارات سلام صاحب اور سنٹر کے بارے میں بھرے ہوتے تھے۔ ٹریسٹ کے عام شہریوں نے اس طرح خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جیسے سلام صاحب ان کے اپنے ہیں۔ پاکستانیوں کو بڑی عزت ملی۔ عام شہریوں کی نظر میں پاکستان ایک قابل احترام ملک بن گیا اور ٹریسٹ سنٹر میں پاکستانی سائنسدان مستقبل کے نوبل لاریٹس سمجھے جانے لگے۔ پاکستان کو سلام صاحب سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ایمبیسڈر ملے۔

سلام صاحب جو ان دنوں لندن میں تھے اعلان کے دو دن بعد ٹریسٹ تشریف لے آئے۔ جشن کا سا سماں بن گیا۔ استقبال کے لئے سارا سٹاف اور وہاں موجود سائنسدان بلڈنگ سے باہر دروازے پر آن کھڑے ہوئے۔ جونہی سٹاف کار دروازے پر رکی میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور سلام دی نوبل لاریٹ سے ہاتھ ملایا۔ اس شام سنٹر میں reception دی گئی۔ سلام صاحب توجہ کا مرکز تھے۔ لوگ باری باری آگے بڑھ کر سلام صاحب سے مل رہے تھے اور اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ میری باری آئی۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ پرانا سٹوڈنٹ ہونے کے حوالے سے سلام صاحب سے بے تکلفی کی جرات نہ ہو سکتی تھی مگر اس دن خلاف عادت آگے بڑھ کر سلام صاحب سے گلے ملا اور مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

Sir you have created history, you are the first from the Muslim world to have received this honor (i.e.Nobel Prize in Science.)

اور سلام صاحب یہی کئے جا رہے تھے۔ انشاء اللہ انشاء اللہ۔ افسوس کہ ہم پاکستانیوں نے سلام صاحب کی گوناگوں صلاحیتوں کا پورا فائدہ نہ اٹھایا۔

جن دنوں ICTP کے قیام کی تجویز زیر غور تھی۔ پاکستان میں صدر ایوب کی حکومت تھی۔ سلام صاحب پاکستان کے سائنس ایڈوائزر تھے۔ جنرل ایوب سلام صاحب کے مداح تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ سلام صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ کیوں نہ یہ سنٹر پاکستان میں قائم ہو۔ چنانچہ انہوں نے حکومت وقت سے کہا کہ وہ بھی دوسرے ممالک کی طرح اس سنٹر کے قیام کے لئے پیش کش دیں۔ اس وقت کے وزیر خزانہ تجویز پر غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر صدر ایوب نے وزیر خزانہ سے فون پر جواب مانگا۔ سلام صاحب صدر کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ وزیر خزانہ نے جواب دیا سر یہ تجویز پاکستان میں تھیوریٹیکل فزکس سنٹر کے قیام کے لئے نہیں بلکہ پروفیسر صاحب تو یہاں ایک انٹرنیشنل ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں آ کر سائنسدان اپنی چھٹیاں گزار سکیں۔ افسوس صد ہا افسوس کاش اس وزیر کو احساس ہوتا کہ وہ ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کاش وہ یہ جانتے کہ ان کے قلم کی ایک جنبش پاکستان کی تقدیر بدل سکتی تھی۔

ایک اور واقعہ سنئے۔

جب سلام صاحب کو ۱۹۷۹ء کا نوبل انعام ملا۔ تو دنیا جہان سے انہیں اعزازات سے نوازنے کے لئے مدعو کیا جا رہا تھا۔ حکومت پاکستان نے بھی دعوت کا پیغام بھیجا۔ سلام صاحب نے جواب میں پاکستان میں سائنسی ترقی کے متعلق کچھ باتیں کہیں اس سلسلہ میں سلام صاحب کی طرف سے کئی ایک پیغامات آئے۔ ایک پیغام مجھے بھی لانے کا شرف حاصل ہوا یہ پیغام اس وقت کے چیئرمین ایٹمی توانائی کمیشن جناب منیر احمد خان صاحب کے لئے تھا جو ان دنوں حکومت پاکستان کی طرف سے تقریب کے انتظامات کروا رہے تھے۔ سلام صاحب نے مجھے کہا کہ منیر احمد خان سے کہیں کہ وہ حکومت پاکستان کو بتا دیں کہ مجھے ذاتی طور پر ان کے اعزاز اور میڈل کی کوئی بھوک نہیں مجھے جس میڈل کی تمنا تھی وہ مجھے مل گیا ہے۔ ہاں البتہ اگر وہ پاکستان میں سائنس کی ترقی کے لئے کوئی سنجیدہ اقدامات کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں ضرور آؤں گا۔ انہوں نے یہ بھی خواہش کی کہ اعزاز کی

تقریب جھنگ شہر میں ہو۔ قصہ مختصر سلام صاحب پاکستان تشریف لائے۔ ان کی اور ان کے خاندان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ قائداعظم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ سلام صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو یہ پیشکش دی کہ میں اپنے نوبل انعام کی پوری رقم ۶۶ ہزار ڈالر وقف کرنے کو تیار ہوں جس سے پاکستانی طلباء بیرون ملک جاکر سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے بشرطیکہ حکومت پاکستان بھی اس کام کے لئے دس لاکھ ڈالر اپنی طرف سے مختص کرے۔ جنرل ضیاء نے اصولی طور پر اتفاق کر لیا اور کہا کہ گورنر پنجاب اس کا جائزہ لیکر دوسرے روز باقاعدہ طور پر اعلان جاری کریں گے مگر دوسرے دن جو ہوا وہ بہت مایوس کن تھا۔ اعلان کیا گیا کہ حکومت نے سلام صاحب کی تجویز قبول کر لی ہے مگر رقم سلام صاحب کی پیش کردہ رقم کے مساوی ہوگی اس سے زیادہ نہیں۔ سلام صاحب کو سخت مایوسی ہوئی۔ فوراً جنرل ضیا کے نام تار بھیجا کہ اگر حکومت پاکستان صرف ایک فرد کی طرف سے پیش کردہ رقم کے برابر رقم دیتی ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس صورت میں تو میں اپنی الگ فاؤنڈیشن قائم کروں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حکومت اور بیوروکریٹس کی مہربانیوں سے پاکستان کی کہانی Missed Opportunities کی کہانی ہے۔

ایک اور واقعہ جو نہ صرف پاکستان کے لئے بلکہ تمام ترقی پذیر اقوام کے لئے افسوس ناک ہے۔ ۱۹۸۶ء میں یونیسکو کے نئے ڈائریکٹر جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔ سلام صاحب کا نام تجویز ہوا۔ اٹلی کے وزیر خارجہ (جو سلام صاحب کے بڑے مداح تھے) کی طرف سے اور کئی دوسرے ممالک کی طرف سے سلام صاحب کی نامزدگی کے لئے کوششیں ہونے لگیں۔ حسن اتفاق کہ اس وقت ساری دنیا میں سلام صاحب وہ فرد واحد تھے جو اس پوزیشن کے لئے مطلوبہ معیار پر پورا اترتے تھے۔ معیار یہ ہے۔

A person who is an academic of international standing, preferably a Noble Laureate in his field, who has demonstrated ability in an internation environment, awareness of political dimension of education, science and culture, particularly in the third world, and someone who has exerted an influence on this area even handedly between the East and West, so that he is also acceptable to the (former) Soviet Union.

یوں لگتا ہے کہ کسی نے یہ معیار Crystal Ball میں جھانک کر بنایا تھا مگر افسوس کہ حکومت پاکستان نے سلام صاحب کو نامزد کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی جگہ کسی اور کو نامزد کیا جو کہ انتخاب بری طرح ہار گیا۔ اس طرح یہ معاملہ سیاست کا شکار ہو گیا۔ خیال رہے کہ سلام صاحب کو نامزدگی کا مسئلہ نہ تھا۔ اٹلی، انگلینڈ اور دوسرے ممالک ان کو نامزد کرنے کیلئے تیار تھے۔ مگر سلام صاحب کے لئے ذاتی طور پر یہ بات اہم تھی کہ ان کو اپنا ملک نامزد کرے۔ ان کی قومی حمیت کو دوسروں کی نامزدگی قابل قبول نہ تھی۔

آیئے اب ہم سلام صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو "وہ استاد کیسے تھے" کا جائزہ لیں۔

سلام بحیثیت استاد

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے امپیریل کالج لندن سے پروفیسر عبدالسلام کی سرپرستی میں تربیت حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی سند پائی۔ یہ ۱۹۶۳ء کا زمانہ تھا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کی لیکچرر شپ چھوڑ کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کی ملازمت اختیار کی اور فوراً بعد کولمبو پلان سکالر شپ سکیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے امپیریل کالج پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر عبدالسلام اور ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے مل کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بہت سے پروگرام شروع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اہم پروگرام بیرون ملک ٹریننگ کا تھا۔ آج پاکستان میں بہت سے سینئر سائنسدان اور انجینئر اسی پروگرام کی پیداوار ہیں اور سلام اور عثمانی کی کوششوں کے مرہون منت ہیں۔

میں نے Particle Physics کا انتخاب کیوں کیا؟۔

میں سمجھتا ہوں یہ فیصلہ قدرتی بات تھی۔ فزکس اور میتھ کا بیک گراؤنڈ ہو اور ہر طرف پروفیسر عبدالسلام کے چرچے ہو رہے ہوں (وہ سائنس کی دنیا میں پہلے ہی سے (Celebrity) بن چکے تھے) اور حسن اتفاق کہ ان کو سننے کا بھی موقع مل گیا ہو۔ وہ پاکستان آئے ہوئے

تھے اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک ولولہ انگیز لیکچر دیا۔ سلام صاحب یقیناً نوجوان نسل کے ہیرو اور آئیڈیل بن چکے تھے۔

امپیریل کالج میں پی ایچ ڈی میں داخلہ کیلئے DIC کورس نہ صرف پاس کرنا ضروری تھا بلکہ داخلہ کی سیٹ مقابلہ کی بنیاد پر حاصل کرنا ہوتی تھی۔ (برٹش گریجوایٹس اس شرط سے مستثنیٰ تھے) خیر ہم نے DIC کورس شروع کر دیا۔ پروفیسر عبدالسلام کے گروپ میں دوسرے اساتذہ Streater, Kibble ،P.T.Mathews اور Lovelace تھے۔ یہ چھوٹا سا گروپ Theoretical Particle Physics میں یورپ کا بہترین سنٹر مانا جاتا تھا۔

سلام صاحب کو بحیثیت استاد کیسا پایا؟ وہ یقیناً ان اساتذہ میں سے نہیں تھے جو لیکچر کی تیاری میں محنت کرتے ہیں اور کوشش کے ساتھ اس کو آسان فہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ سٹائل پروفیسر P.T. Matthews کا تھا۔ سلام صاحب کا نہیں اور نہ ہی سلام صاحب ان اساتذہ میں سے تھے جو لیکچرز کے باقاعدہ نوٹس تیار کرتے ہیں اور پھر خوبصورت طریق سے بلیک بورڈ پر ہو بہو نقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح بلیک بورڈ پر لکھا ہوا لیکچر کتاب کی تصویر بن جاتا ہے۔ یہ پروفیسر Kibble کا انداز تھا۔ سلام صاحب کا نہیں۔ سلام صاحب ان سے مختلف تھے۔ ان کا انداز اپنا اور منفرد۔ ان کے نزدیک مذکورہ باتیں خاص اہمیت کی حامل نہ تھیں۔ رویہ سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تکلفات عام انسانوں کے کرنے کے ہیں اور وہ یقیناً ان میں سے نہیں۔ یہ بات نہ تھی کہ سلام صاحب یہ کام کر نہیں سکتے تھے۔ ہم نے ان کے کئی ایک سیمینار سنے اور ان کو کئی انٹرنیشنل کانفرنسز میں دیکھا اور سنا جہاں وہ (وی آئی پی) سپیکر کی حیثیت سے مدعو ہوتے۔ ان کے لیکچر کو سننے کے لئے لوگ بیتاب ہوتے۔ ہال کھچا کھچ بھر جاتے۔ سحر انگیز لیکچر' باتیں طبیعات کی ہو رہی ہیں اور انداز بیان لٹریری ہے۔ زبان پر کیا عبور ہے کہ اہل زبان بھی عش عش کرتے ہیں۔ پھر اس پیکر علمیت و ذہانت کو کس طرح سامعین کی والہانہ داد (Standing ovation) ملتی ہے کہ جیسے سبھی کے دل کی آواز ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

بات DIC کورس کی ہو رہی تھی۔ سلام صاحب نے اپنے کورس کا آغاز Theory of Life Groups سے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب Particle Physics میں گروپ تھیوری کے نظریات شامل ہونے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں Symmetry Group SU (3) اور Eigthfold way معرض وجود میں آئے اور Omega minus کی دریافت ہوئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ Quark Model کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دنوں بعد سلام صاحب کے لیکچرز کا انداز بدل گیا۔ اب وہ جب کلاس روم میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں Research Journals کے تین چار شمارے ہوتے ہیں۔ جن میں جگہ جگہ Page indicator رکھے ہوئے ہیں۔ اب لیکچرز کیا ہیں؟ Frontiers of Physics کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تحقیقی مسائل کا تجزیہ ہو رہا ہے۔ لکھتے لکھتے بلیک بورڈ بھر جاتا ہے خیالات و افکار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ بورڈ پر تیروں کے نشان بکھرے ہوئے مختلف اجزا کو ایک لڑی میں پرو رہے ہیں۔ اکثر طلباء کے لئے زیادہ تر باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ اس کے باوجود بے حد متاثر وجدانی کیفیت میں بیٹھے نوٹس لے رہے ہیں۔ سلام صاحب کے لیکچرز ایک Exciting Experience ہوتا جو طلباء میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا۔ سلام صاحب کی خواہش ہوتی کہ ان کے طلباء تیز رفتاری سے آگے بڑھیں اور ایسے لگتا جیسے وہ بہت جلدی میں ہیں۔ انکے پاس وقت کم ہے اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسروں کے لئے پیغام ہوتا کہ اگر آپ ہمارے شانہ بشانہ نہیں چل سکتے تو کوئی اور راہ اختیار کریں۔ ہم آپ کا انتظار نہیں کر سکتے۔

if you cannot rise to us, we cannot stoop to you

ہمارے شہر میں صرف قد آور بستے ہیں۔ بونوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ تھا سلام صاحب کے کام کروانے کا سٹائل۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کے بے شمار سٹوڈنٹس رہے مگر صرف گنے چنے لوگوں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی جسارت کی۔

سلام صاحب کی بارعب شخصیت' ان کا دبدبہ اور جلالی مزاج' اور اس پر طرہ ان کی آنکھوں کی چمک' کسی کی مجال کہ آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ کسی چیز کا جواب معلوم بھی ہو تا تو کہنے کی جرات نہ ہوتی۔ شروع شروع میں ہمیں گمان ہوا کہ یہ سب کچھ ہم مشرقی لوگوں کا مسئلہ ہے مگر جلد ہی اس راز کی بھی قلعی کھل گئی۔ ہم نے دیکھا کہ گوروں کا بھی برا حال تھا۔ وہ بھی اسی کشتی میں سوار تھے۔ قصبہ جھنگ کی یہ شخصیت مغرب ہو یا مشرق دنوں پر یکساں طور پر حاوی تھی۔

سلام صاحب کی آنکھوں کی خیرہ کن چمک کے متعلق ایک واقعہ ہے کہ سلام صاحب کی سیکرٹری جو mannerism کی مناسبت سے تھیٹر کی دنیا میں شاید زیادہ موزوں ہوتی P.T.Matthews کے پاس شکایت لیکر گئیں آنکھوں میں آنسو' کہنے لگیں دیکھیں یہ سلام صاحب کیسے ہیں مجھے دفتر میں بلاتے ہیں میں جاتی ہوں اور سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں نہ وہ مجھے ہیلو کرتے ہیں اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بس Dictation شروع کر دیتے ہیں P.T.Mathews نے (جو بڑے شفیق انسان تھے اور سب انہی کے پاس جا کر اپنے دکھڑے سناتے تھے) دلاسا دیتے ہوئے کہا "شکر کرو اس نے تمہاری طرف نہیں دیکھا ورنہ تم خوف سے لرز جاتیں۔"

ایک دن ایسا ہوا کہ ہم اپنے ساتھی طلباء کے ہمراہ چائے کی میز پر تھے۔ اچانک وہاں P.T.Matthews تشریف لے آئے۔ باتیں سلام صاحب کے متعلق ہونے لگیں۔ موضوع یہی تھا کہ سلام صاحب کو سمجھنا آسان نہیں P.T.Matthews بتانے لگے کہ میں نے ایک دفعہ سلام سے کہا کہ تم دوسروں کی سہولت کے لئے دقیق موضوعات کو آسان بنا کر کیوں نہیں پیش کرتے۔ ہنس کر جواب دیا اگر میں تمہارے لئے ایسا کروں تو تم کہو گے ارے یہ تو بہت آسان بات تھی۔ میں خود بھی سوچ سکتا تھا۔ (خیر اس قصہ میں مذاق کا پہلو زیادہ تھا) میں نہیں سمجھتا کہ سلام صاحب میں خود غرضی تھی یا تکبر۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنا وقت بیجا صرف کرنے اور سر کھپانے کو تیار نہ تھے۔

And he had no patience for mediocrity

جب ہمارا Dic کورس ختم ہونے کو ہوا تو انہوں نے سب پاکستانیوں کو بلا کر کہا کہ بھئی اب تم لوگوں کا Dic. Exam ہونے والا ہے تمہیں ابھی سے اپنے پی ایچ ڈی پروگرام کا خیال کرنا ہو گا۔ یہاں پر ہم لوگ تو اپنے اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ تمہیں وقت نہ دے سکیں گے۔ کسی دوسری یونیورسٹی چلے جاؤ وہاں Supervisor بہت خیال رکھیں گے توجہ دیں گے۔ تمہارے لئے آسانی ہو گی ہم تمہارا داخلہ بھی کروا دیں گے ہم لوگ اس پیغام سے بہت مایوس ہوئے۔ کچھ نے پریشان ہو کر دوسری یونیورسٹیوں میں داخلہ کی کوشش شروع کر دی۔ مگر اس بات کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ سلام صاحب طلباء کی مدد کرنے کو تیار نہ تھے وہ یقیناً طلباء کی مدد کرتے۔ ان کی رہنمائی کرتے' تحقیقی موضوعات تجویز کرتے اور حل کرنے کی راہیں بتاتے مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے DIC کورس مکمل کرنے کے بعد تحقیق کا کام شروع کیا تو سلام صاحب نے سب کو بلوایا Research problems بتائے میرے لئے بھی پرابلم تجویز ہوا۔ سلام صاحب بولتے جا رہے تھے اور میں لکھتا جا رہا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ جلد کامیابی ہوئی۔ مسودہ تیار کر کے سلام صاحب کے پاس لے گیا۔ اس کام میں انہی کا تجویز کردہ ایک ماڈل استعمال کیا گیا تھا اور ساتھ Symmetry Group SU(3)۔ چند بنیادی ذرات کے Decay process کو سٹڈی کیا گیا تھا۔ سلام صاحب نے مسودے کو دیکھا۔ ورق پلٹے اور پوچھا کہ اس میں Kaon Praticles کی Contributions کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ میں نے جواب دیا کہ دوسروں نے ایسا ہی کیا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ کوئی جواب نہیں۔ سائنسی تحقیق میں دوسروں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر میز پر پڑے ہوئے Physical Review اور دوسرے رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تمہارا کیا خیال ہے کہ اس خرافات کے پلندے پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

(Do you think you can trust all this junk)

خیر ہم نے ان کی تجویز کردہ Contributions شامل کیں۔ اور مسودے کو اشاعت کیلئے بھجوا دیا۔ یہ ہماری پہلی Publicaton تھی۔ اس پر سیمینار بھی دیا P.T.Matthews اور دوسرے اساتذہ سیمینار میں تھے۔ مگر سلام صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ نہ آ سکے اور ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا ورنہ شاید ہم سٹیج پر ہی ڈھیر ہو جاتے۔ سلام صاحب کا یہ خاصہ تھا کہ ان کی بات سمجھ آئے یا نہ آئے بندہ Inspire ضرور ہوتا وہ ہر وقت Excited state میں ہوتے جس سے دوسرے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جہاں بھی

جاتے ہلچل مچا دیتے۔ نت نئے خیالات' ایسے لگتا کہ انقلاب آنے ہی والا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ کی حالت یہ تھی کہ مسلسل Visiting Scientists چلے آ رہے ہیں۔ اکثر سیمینار ہو رہے ہیں۔ کیا یورپ' کیا امریکہ دنیا جہاں سے ماہر طبیعات South Kensington کے طواف کو پہنچ رہے ہیں۔ کسی دن Julian Schwinger کا سیمینار ہے اور کسی Weinber Steven کا۔ آج Feldman آئے ہوئے ہیں اور کل J.C.Ward' ڈیپارٹمنٹ میں لٹریچر کی بھی بھرمار رہتی۔ ہرروز ڈاک میں دنیا کے چاروں کونوں سے Preprints کے ڈھیر پہنچ رہے ہیں۔

سلام صاحب بحیثیت استاد Spoon-feeding تو نہیں کرتے تھے مگر وہ آپ کو ایک آئیڈیل ماحول ضرور مہیا کرتے جہاں آپ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتے تھے۔

سلام صاحب کے کیریئر پر ایک سطحی نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت اتنی عظیم تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور یا پنجاب یونیورسٹی تو کجا انگلستان کی شہرہ آفاق کیمبرج یونیورسٹی بھی بہت چھوٹی ثابت ہوئی یہاں تک کہ امپیریل کالج لندن جس کو اس بات پر ناز تھا کہ ان کے ہاں نوبل انعام یافتہ ستاروں کا جھرمٹ رہتا ہے (وہ) بھی سلام صاحب کے تخیل کی تسکین نہ کر سکا۔ چنانچہ سلام صاحب نے امپیریل کالج کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کے سب سے بڑے فورم اقوام متحدہ میں سائنس اور تیسری دنیا کے حق میں آواز بلند کی اور بالآخر اپنی کرشمہ ساز شخصیت اور عالمی شہرت کے بل بوتے پر اٹلی میں ایک انٹرنیشنل سنٹر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ICTP کا وجود میں آنا اور پھر کامیابی سے جاری ساری رہنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ مگر اس جھنگ قصبہ کے عقابی فرزند کی پرواز یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے اب بھی نت نئے خیالات کی آمد ہے اور وہ ہمہ وقت اسلامی دنیا اور دوسری ترقی پذیر اقوام کے لئے نئی راہوں کا متلاشی ہے کہیں Third World Acadamy of Sciences قائم کی جا رہی ہے اور کہیں سائنس سٹی بنانے کے ارادے ہیں۔ فزکس کی گرینڈ یونیفیکیشن تھیوری کے ساتھ ساتھ یہ گرینڈ سکیم بھی بن رہی ہے کہ دنیا بھر میں ICTP کی طرح کے بہت سے بین الاقوامی مراکز کا جال بچھا دیا جائے اور ساتھ اقوام متحدہ کے تحت ایک جامعہ۔ تاکہ تمام اقوام عالم اور بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کی نعمتوں سے مالا مال ہو سکیں۔

سلام صاحب آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی باتیں نہ ختم ہونے والی ہیں اور ان کے حیرت انگیز کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

بشکریہ "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور

بقیہ از صفحہ 80

شاہی بینڈ وقتاً فوقتاً اپنے نغموں سے محظوظ کرتا رہا۔ یہ پروگرام براہ راست ٹیلی ویژن پر کاسٹ ہو رہا تھا اور سارے ملک میں دکھایا گیا۔ پاکستان ٹی۔وی نے بھی سیٹلائٹ کی مدد سے ڈاکٹر صاحب والا حصہ براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا۔ اس کے بعد سب لوگ سٹاک ہالم سٹی ہال میں گئے جہاں ڈنر کا اہتمام تھا۔

جب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو یکدم بگل کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ مع دیگر مہمانان خصوصی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ پارٹی دو قطاروں میں آ رہی تھی۔ ملکہ سلامت ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ساتھ تشریف لا رہی تھیں اور کھانے کی میز پر بھی انہی کے ساتھ ان کی جگہ تھی۔

کھانے کے دوران یونیورسٹی کے طلباء نغمات گاتے رہے۔ بینڈ بھی وقفے وقفے سے دھنیں بجاتا رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ آئس کریم لائی جا رہی ہے۔ بیرے ہاتھوں میں آئس کریم کی ٹرے تھامے چلے آ رہے تھے اور آگے آگے میوزک بج رہا تھا۔ ہر ٹرے میں ایک بڑا آئس کریم کا ٹکڑا تھا جس پر حرف "N" نمایاں طور پر لگا ہوا تھا۔ "N" سے نوبل کی طرف اشارہ مقصود تھا گویا نوبل کے نام کی آئس کریم تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد مہمانوں کو کافی پیش کی گئی۔

ازاں بعد انعام حاصل کرنے والوں نے باری باری تقریریں کیں اور یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے بزم سے جن کو ✤ تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

پروفیسر عبدالسلام صاحب آئیوری کوسٹ میں

(مکرم نصیر احمد صاحب شاہد سابق مشنری انچارج آئیوری کوسٹ)

آئیوری کوسٹ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے صرف دو مرتبہ انہیں ملنے کا موقعہ ملا۔ پہلا موقعہ تو وہ یادگار لمحہ تھا جب آپ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد پاکستان تشریف لائے تھے۔ ربوہ شہر نے والہانہ استقبال کیا اور قوم و ملک کے ہیرو کو گھروں سے باہر نکل کر سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہو کر اھلاً و سھلاً و مرحبا کہا تھا۔ اس موقعہ پر جمعۃ المبارک کے بعد مصافحہ اور معانقہ کا موقع ملا۔ دوسری مرتبہ آپ سے ملاقات تحریک جدید کے گیسٹ ہاؤس میں ہوئی۔ آپ لندن سے ربوہ تشریف لائے۔ غالباً تبشیر کی طرف سے محترم ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں چائے کا پروگرام تھا۔ اس موقعہ پر سب سے پہلے آپ نے اپنے خطاب میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی طرف سے "السلام علیکم" کا محبت بھرا پیغام پہنچایا۔ پھر چند فقرے اردو میں بول کر کہنے لگے کیوں نہ پنجابی میں بات کروں۔ اور پھر ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کیں اور دنیا کی طرف سے نوبل انعام ملنے پر جو محبت اور قدر کے پھول نچھاور ہوئے ان کا ذکر کیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں خاص کر کویت اور علی گڑھ میں لوگوں کے جوش و خروش اور ان کی محبت کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ "علی گڑھ میں تو یوں لگتا تھا کہ گویا وہ میری کار کندھوں پر اٹھالیں گے۔"

تیسری مرتبہ سب سے لمبی ملاقات ہوئی اور وہ غالباً ۱۹۸۷ء میں مغربی افریقہ کے فرانسیسی بولنے والے ایک ملک آئیوری کوسٹ میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاکسار آئیوری کوسٹ میں خدمت دین کی توفیق پا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ برادرم انعام الرحمان کے ساتھ آئیوری کوسٹ کی نیشنل یونیورسٹی میں فرنچ زبان بھی سیکھ رہا تھا۔

ایک دن جب ہم واپس آرہے تھے تو ہم نے کوٹ پتلون میں ملبوس، ایک پروقار شخص کو یونیورسٹی کے شعبہ حساب کے سربراہ کے ساتھ اس کے دفتر میں جاتے دیکھا۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ہم رک گئے۔ چونکہ ہماری طرف آپ کی پشت تھی۔ کبھی کبھی آپ کی عینک اور کچھ کچھ داڑھی نظر آجاتی تھی۔ یوں ہمارا شک کچھ کچھ یقین میں بدلنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہیں۔ ہم نے بھی تیز تیز قدم بھرنے شروع کر دیئے اور جا داخل ہوئے صدر شعبہ حساب کے دفتر میں جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ مختصر تعارف کروایا احمدیت کا رشتہ بھی عجیب ہے۔ کتنا دل کو گرما دینے والا اور کتنا آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا، بلکہ دوسروں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والا!! وہاں موجود لوگ اب ہم تینوں کو پتھرائی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہم اردو اور پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اپنائیت کے لہجہ میں باتیں کرتے ہمیں دیکھ کر میزبان نے سمجھا کہ ہم نے ان کے محترم مہمان کو مل لیا ہے۔

یہ معلوم کر کے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں ہم خوش و خرم وہاں سے مشن ہاؤس آگئے۔ لیکن کیا یہ ممکن تھا ہمارے لئے کہ آپ کو مشن ہاؤس میں مدعو نہ کریں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کے مطابق ایک شام کا پروگرام بنا لیا گیا۔ مشن ہاؤس واپس آکر ہم نے احباب جماعت اور دوستوں کو یہ خوشخبری سنائی۔ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ احمدیت کے جس سپوت کا ذکر سالہا سال سے سنتے تھے وہ اپنی آنکھوں میں اسے دیکھ سکیں گے اور اس سے ہاتھ ملا سکیں گے۔ اس کی باتیں سن سکیں گے۔ اپنے علاقہ کے میئر کو جب فون پر اطلاع دی گئی اور آنے کی دعوت دی تو

اس نے بڑے شکریہ سے اسے قبول کیا کہ ہم نے اس اہم بین الاقوامی شخصیت کی مشن میں آمد کے موقع پر اسے یاد رکھا ہے۔ اس میئر کے بارہ میں یہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہو گا کہ موصوف کا نام "لامینے ڈانملیے" ہے احمدیہ مشن کے شروع سے ہی دوست رہے ہیں۔ اور ابھی تک دوست ہیں اب تو بفضل اللہ ممبر آف پارلیمنٹ ہیں۔ امسال جلسہ سالانہ یوکے پر بھی تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مغرب سے قبل مشن ہاؤس تشریف لے آئے اور میئر صاحب موصوف بھی خوشی خوشی حاضر ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی بہت عزت افزائی کی ان سے باتیں کرتے رہے۔ برادرم انعام الرحمان نے ترجمانی کا کام کیا۔ پھر نماز مغرب ادا کی گئی اس کے بعد موجود احباب کی خواہش کے عین مطابق خطاب فرمایا۔ اس میں اسلام اور سائنس اور مسلمانوں میں سائنس سے عدم دلچسپی کا ذکر کیا۔ آپ کے الفاظ سے مسلمانوں میں سائنسی علوم کی ترویج کا عظیم جذبہ مترشح ہوتا تھا۔ آپ نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ قرآن کریم کی آیات کا 1/8 کائنات کے مطالعہ اور سائنسی علوم کے حصول کیلئے ترغیب پر مشتمل ہے لہٰذا مسلمانوں کے خطیب حضرات کو اور علماء کو آٹھ خطبات جمعہ میں سے ایک خطبہ سائنس کے کسی پہلو پر دینا چاہئے۔ محترم امیر صاحب ساتھ ساتھ فرانسیسی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ آپ کی تقریر کے بعد میئر موصوف نے بھی کچھ کہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ چونکہ انگریزی زبان کی کچھ شدبد رکھتے تھے اس لئے انگریزی میں ہی شکریہ کے الفاظ ادا کئے اور اپنی اس خوش قسمتی کا ذکر کیا۔ کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نوبل انعام یافتہ سے ملاقات ہوئی۔ اس مختصر سے پروگرام کے بعد احمدیہ کلینک میں نصرت جہاں سکیم کے تحت کام کرنے والے ہمارے میڈیکل آفیسر جناب ڈاکٹر بدھن صاحب نے پر تکلف چائے کا انتظام کیا ہوا تھا لہٰذا تمام مدعوئین وہاں چائے نوش فرمانے کیلئے تشریف لے گئے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے پروگرام میں صدر مملکت Houphouet Boigne اور وزیر تعلیم و وزیر برائے سائنسی ریسرچ سے ملاقات بھی کرنا تھا۔ اس لئے آپ نے محترم امیر صاحب سے فرانسیسی ترجمہ القرآن کی چند کاپیاں لے لیں۔ آپ نے اپنی ملاقات کے دوران صدر مملکت کی خدمت میں اس عظیم کتاب کو پیش کیا۔

آئیوری کوسٹ کے صدر کے بارے میں آپ نے بیان فرمایا کہ گو وہ بہت عمر رسیدہ ہے لیکن مستعد اور باخبر ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک جہاں کے عمر رسیدہ صدور اور سربراہان سے مجھے ملنے کا موقعہ ملا ہے ان سب سے آئیوری کوسٹ کے صدر زیادہ چاک و چوبند ہیں۔

یہ وہی صدر ہیں جن کا ۱۹۸۸ء میں حضور ایدہ اللہ نے اپنے آئیوری کوسٹ کے دورہ کے دوران ان سے ملاقات کے بعد بہت اچھے پیرائے میں ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ملاقات کے دوران ان کے اپنی قوم کے بارہ میں اخلاص اور ہمدردی کی وجہ سے ان کیلئے میں دعا کرتا رہا کہ خدا تعالیٰ انہیں صحت والی دراز عمر عطا فرمائے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے بارہ میں ایک بڑے کانفرنس ہال میں ایک پروگرام بھی تھا۔ جہاں آپ نے لیکچر دینا تھا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے کیلئے یونیورسٹی کے سائنس کے طلباء کے علاوہ پروفیسرز، وزیر تعلیم، وزیر سائنسی ریسرچ اور عام شہری بھی موجود تھے۔

آپ کے لیکچر کے بعد وزیر تعلیم اور سائنسی ریسرچ کے وزیر نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سائنٹیفک ریسرچ کے وزیر نے بیان کیا کہ ڈاکٹر صاحب اور صدر مملکت کی ملاقات میں میں موجود تھا۔ صدر مملکت کو چونکہ فرنچ افریقہ میں "امن کے پیامبر" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس لئے وزیر موصوف نے کہا کہ جب امن کا پیامبر اور عبدالسلام دونوں باتیں کر رہے تھے تو ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوئی۔ کیوں نہ ایسا ہوتا کیا یہ ممکن ہے کہ "عبدالسلام" کہیں ہو اور امن، سلامتی، ترقی تعلیم اور خلق خدا کی بہبودی کی بات نہ ہو۔

وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ ملاقات کے دوران مجھے ایک کتاب بطور تحفہ ڈاکٹر صاحب نے پیش کی۔ میں نے کہا دیکھیں تو سہی کہ سائنس کی کون سی کتاب محترم مہمان نے مجھے دی ہے۔ جب پیکٹ کھولا تو وہ قرآن کریم تھا۔ یہ بات سننا تھا کہ ہال سے تحسین کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے خوشی کے اظہار کیلئے خوب خوب تالیاں بجائی گئیں۔ اس کے بعد وزیر موصوف نے خود بڑی دلچسپی اور تفصیل کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کا تعارف کروایا۔

بقیہ صفحہ 116 پر

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور گورنمنٹ کالج لاہور

- ڈاکٹر عبدالسلام ــــ کالج کی طلباء یونین کے صدر اور مجلہ "راوی" کے ایڈیٹر انچیف بھی رہے۔
- کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب صاحب سے گفتگو۔

ــ ڈاکٹر صاحب کے نام پر "سلام میڈل" کا اجراء۔

ــ کالج کے اولڈ ہال کا نام "سلام ہال" رکھا گیا ہے۔

- شعبہ فزکس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد زکریا بٹ صاحب کا خراجِ تحسین۔

ــ ڈاکٹر صاحب ہمارا قومی اثاثہ تھے ــ

ــ ساری عمر ان کی پوجا کریں تب بھی ان کا دیا ہوا نہیں دے سکتے۔

- شعبہ فزکس کے سابق چیئرمین پروفیسر محمد اکرام الحق صاحب سے انٹرویو۔

ــ One of the most God Fearing Scientist.

ــ اِس صدی کی فزکس کا سب سے ذہین اور روشن دماغ سائنسدان

(تحریر و ترتیب مکرم راشد جاوید صاحب ایم۔اے ابلاغیات)

تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا گہوارہ لاہور جہاں پہ واقع گورنمنٹ کالج اپنے اعلیٰ تعلیمی معیار اور عظیم روایات کی بدولت امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے اور بلاشبہ اسے پاکستان کی بہترین دانش گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن جیسے ہر مکان کی عزت اس کے مکین سے بنتی ہے اسی طرح تعلیمی اداروں کی شہرت اور عظمت بھی اس ادارے کے فارغ التحصیل طلباء بناتے ہیں اگر وہ دنیا میں عظمت و شہرت کے بلند مقام حاصل کریں تو وہ اپنی مادر علمی کے ماتھے کا جھومر اور اس کیلئے باعث امتیاز و صد افتخار ہوتے ہیں اور گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہونے والے بہت سے ایسے طلباء ہیں جنہوں نے مختلف میدانوں میں بلند مقام حاصل کر کے اپنی مادر علمی کی شان و شوکت اور قدر و منزلت میں اضافہ کیا اور گورنمنٹ کالج کے افق پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مانند ہیں۔ لیکن اس ادارہ سے فارغ ہونے والا ایک طالبعلم ایسا بھی تھا جو سائنس کی دنیا میں عظمت و شہرت کے بلند و بالا مینار تک جا پہنچا اور اس کے کارہائے نمایاں نے بیرون پاکستان بھی گورنمنٹ کالج کا نام روشن کیا اور بلاشبہ وہ گورنمنٹ کالج کے افق پر چمکنے والا چاند ہے اس چاند کا نام عبدالسلام ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام جس نے نہ صرف سائنس کے میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے تہلکہ مچا دیا بلکہ آپ نے دنیا بھر کے پسماندہ ممالک میں سائنس کے فروغ اور دکھی انسانیت کی بھلائی کیلئے بھی نابغہ روزگار کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کیلئے داخل ہوئے اور یہیں سے آپ نے ایم۔ اے ریاضی کا امتحان پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر عبدالسلام کا پڑھائی میں شوق اور لگن کا یہ حال تھا کہ یکسوئی کے حصول اور خلل سے محفوظ رہنے کیلئے کالج کے مالی بابا سید سے معاہدہ کیا ہوا تھا جو مقررہ اوقات میں آپ کے کمرہ کو باہر سے مقفل کر جاتا اور بوقت ضرورت آکر کھانا اور دودھ وغیرہ دے جاتا۔

گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر عبدالسلام نے غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا جس کے بارے میں آپ خود تحریر کرتے ہیں کہ

"گورنمنٹ کالج کے قیام کے دوران مجھے کئی طرح سے خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً مجھے ۱۹۴۵ء میں کالج یونین کا صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا میں نیو ہاسٹل کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میں "راوی" کے اردو اور انگریزی حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اس طرح کالج میں قیام کے دوران بہت بھرپور زندگی گزاری۔"

یہ تو ڈاکٹر عبدالسلام کا گورنمنٹ کالج میں تعلیمی کیریئر تھا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج کا یہی ذہین طالبعلم ۱۹۴۹ء میں شعبہ ریاضی کا ہیڈ اور پروفیسر بن کر لوٹا۔ آپ امنگوں، ولولوں اور جوش سے بھرا ہوا دل لیکر آئے تا اس دانش گاہ سے سول سروینٹس، شاعروں اور فلسفیوں کے ساتھ ساتھ ایسے سائنسدان بھی نکلیں جو آپ کے پیارے وطن پاکستان کو بھی سائنسی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکیں۔ لیکن ایک طرف تحقیق وسائل کا فقدان اور اچھی لائبریریوں کی کمی دوسری طرف ہوس پرستی، تعلیم سے عدم دلچسپی اور نوکر شاہی کی بے حسی نے کچھ ہی عرصہ میں ڈاکٹر عبدالسلام جیسے شخص کو بھی مایوس کر دیا۔ ہماری نوکر شاہی کا یہ حال تھا کہ ایک طرف وہ عبدالسلام جسے نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان وولف پاؤلی (Pauli) جب بھابھا انسٹیٹوٹ

ضروری نوٹ:۔ بیرون ملک شائع ہونے والے اخبارات اور کتب اور اسی طرح ڈاکٹر صاحب کو دی جانے والی اعزازی ڈگریوں میں جو کہ مسلم ممالک کی طرف سے پیش کی گئی ہوں یا دیگر ممالک۔ ان سب میں ڈاکٹر صاحب کو ایک سچا اور مخلص مسلمان وغیرہ لکھا گیا ہے۔

لیکن ملکی قانون کے مطابق کوئی بھی احمدی اپنے مذہب یا عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آپ کو "مسلمان" نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں اس کا قانون کے تحت رسالہ میں ایسے مضامین شائع کرتے ہوئے مسلمان کا لفظ وہاں سے حذف کرنا پڑا۔ اس تکلیف اور ترمیم پر ہم ہر ایک سے معذرت خواہ ہیں۔

تیرے جیسا نہ ملا پر نہ ملا تیرے بعد

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے چند مدّاحین جن کے انٹرویوز اِس رسالہ میں شامل ہیں
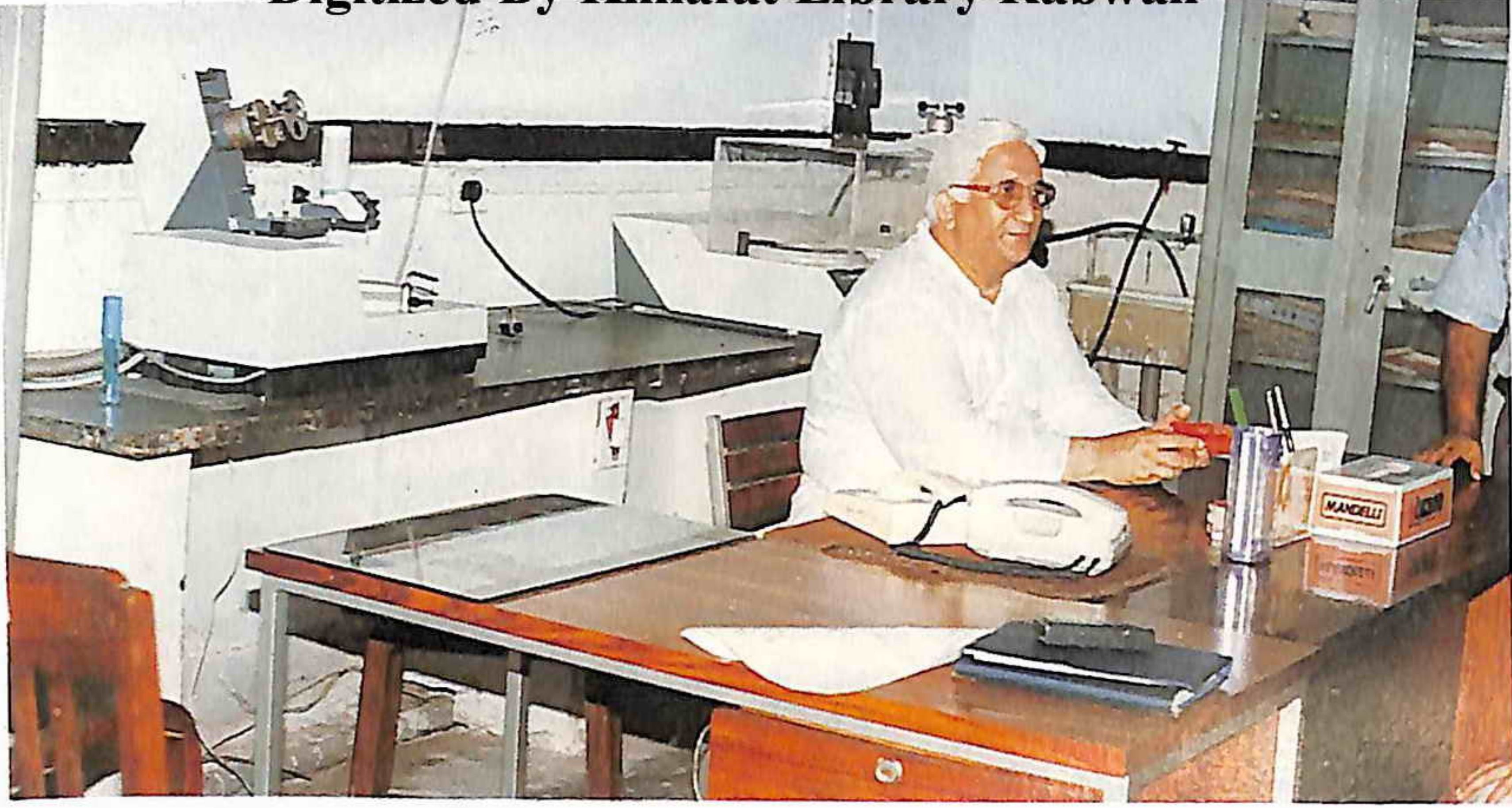
مکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد زکریا بٹ صاحب
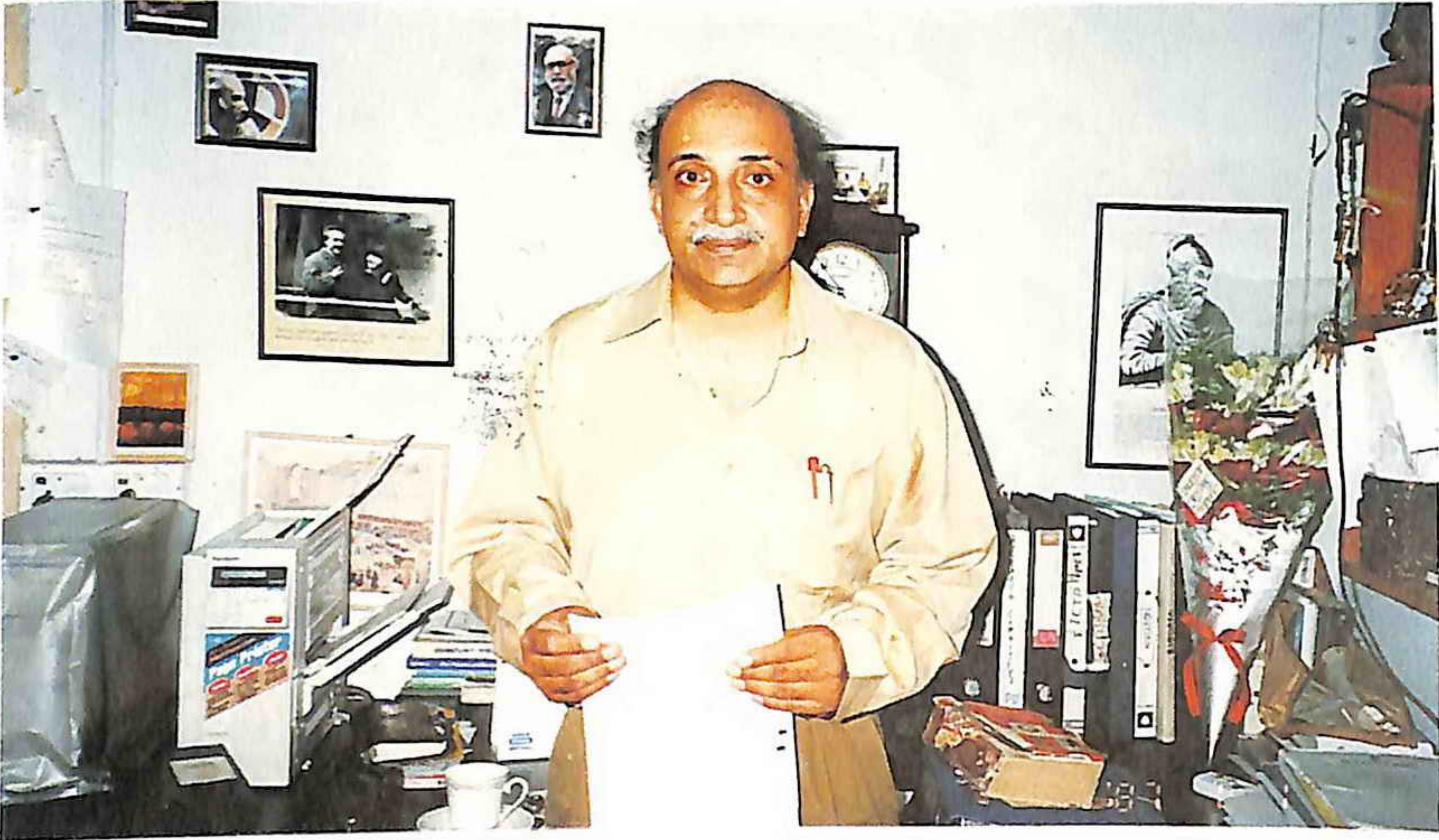
مکرم پروفیسر مجاہد کامران صاحب

مکرم پروفیسر ڈاکٹر [illegible]
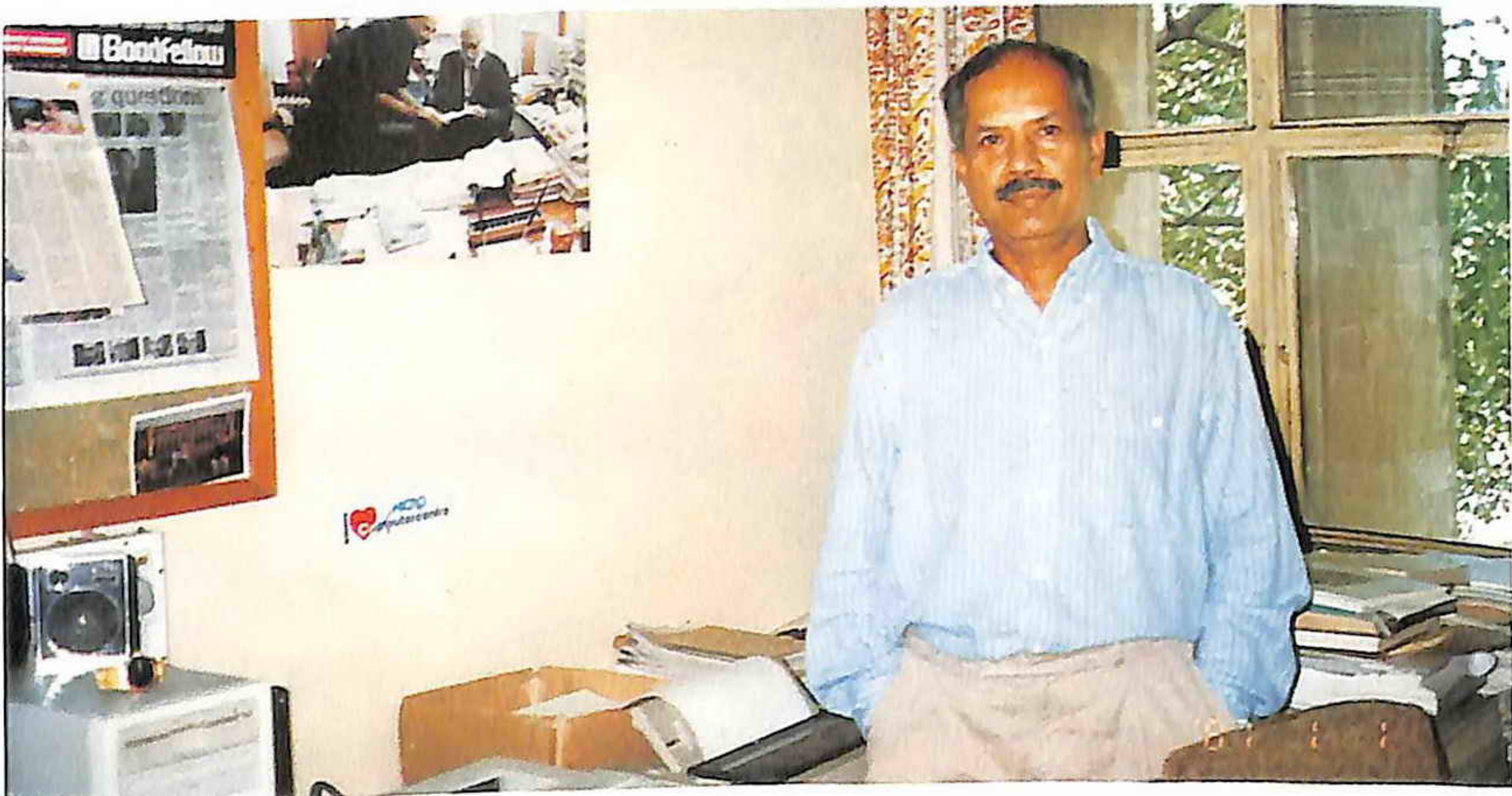
ڈاکٹر صاحب اپنے دفتر (ٹریسٹے۔اٹلی) میں کام کرتے ہوئے
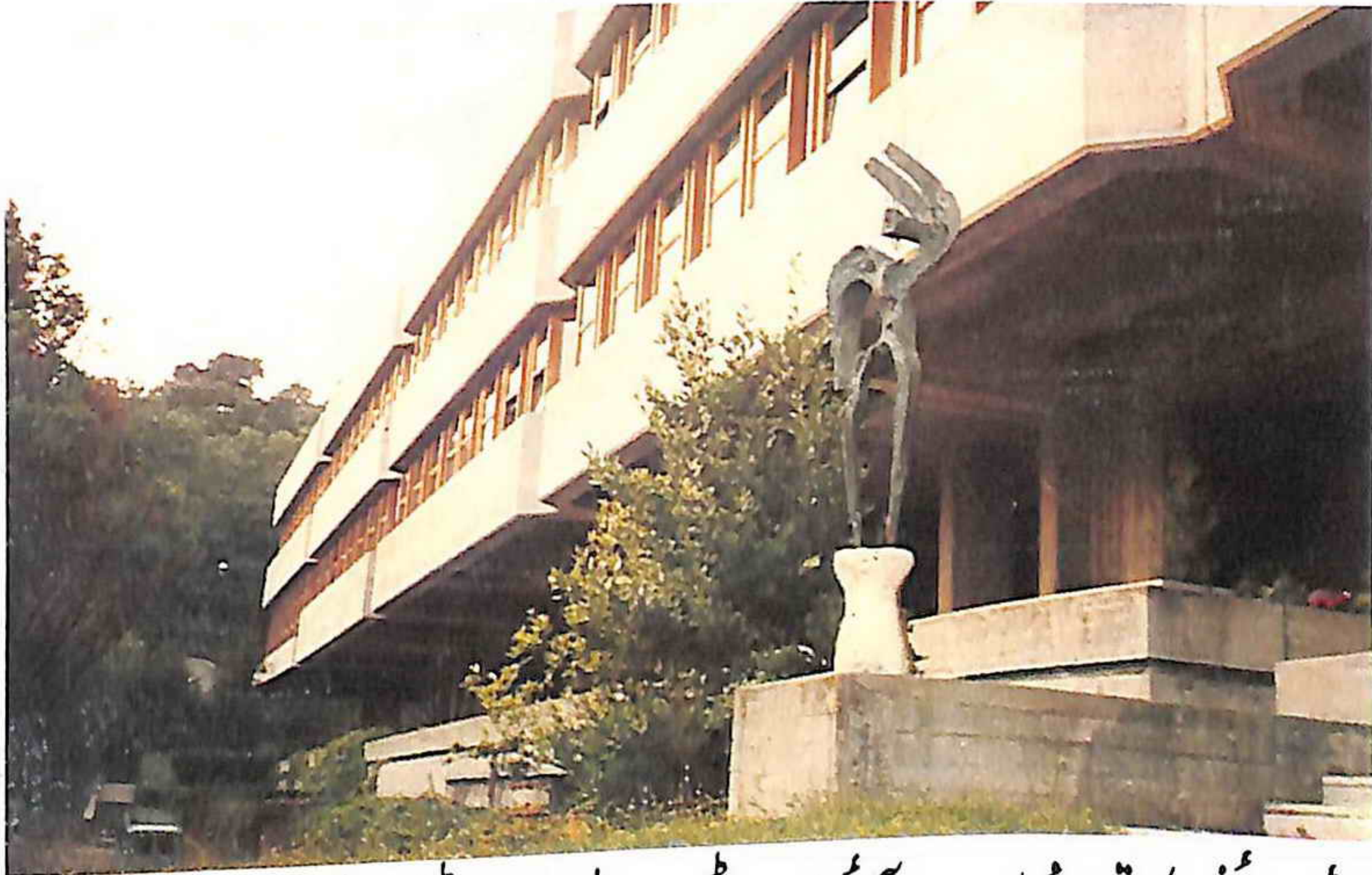
دُنیائے سائنس کا تاج محل آئی۔سی۔ٹی۔پی۔ٹریسٹ۔اٹلی کی مرکزی عمارت کا ایک مرکز
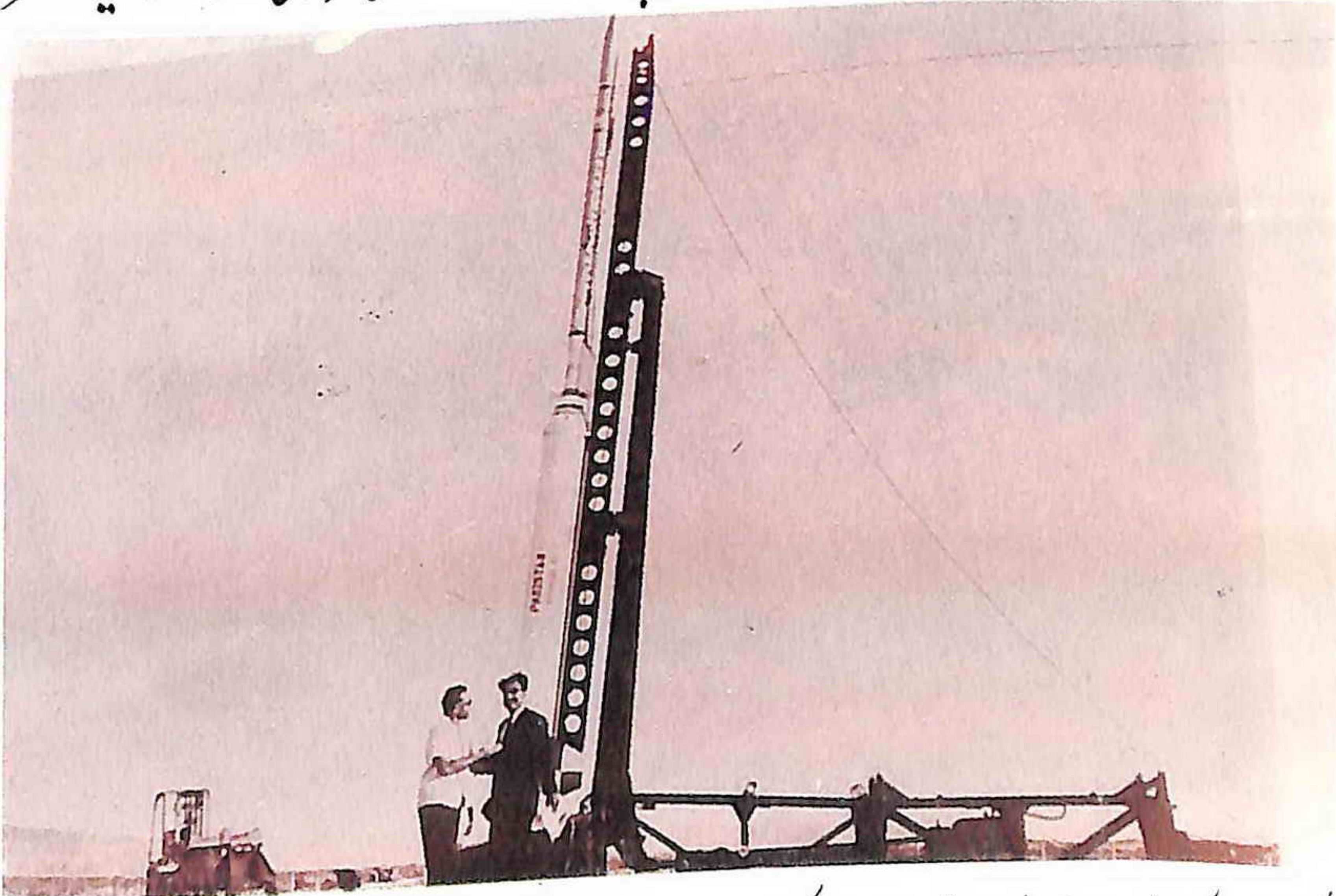
سپارکو (پاکستان) کی جانب سے چھوڑا جانے والا پہلا راکٹ رہبر تھا۔سپارکو کے بانی چیئرمین مکرم ڈاکٹر عبد السّلام صاحب ساتھ کھڑے ہیں

آف انڈیا میں لیکچر دینے آتا ہے تو ۲۵ سالہ پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام کی سائنس میں عظیم کامیابیوں کی بناء پر آپ کو سپیشل ٹکٹ بھیج کر اس لیکچر میں شمولیت کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ آپ اپنے نظریات کو پاؤلی سے ڈسکس کر سکیں۔ اور دوسری طرف پاکستان میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کا یہ حال ہے کہ آپ کو مجبور کرتا ہے کہ ہاسٹل کے وارڈن یا شعبہ اکاؤنٹس کے انچارج (یہ ذمہ داری اس لئے دی جاتی ہے کہ آپ چونکہ ریاضی کے اتنے عظیم پروفیسر ہیں اس لئے کھاتے روزنامچے بھی چیک کیا کریں) یا فٹ بال کے کلب کے صدر، ان میں سے ایک ذمہ داری بھی قبول کریں کیونکہ آپ کے پاس کافی وقت ہوتا ہے...... پھر اسی پر بس نہیں وہ عبدالسلام جس نے کبھی کیمبرج یونیورسٹی کے لئے درخواست نہیں دی بلکہ اپنے ملک میں خدمت کو ترجیح دی اس کو کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے دو دفعہ بڑے آنرز کے ساتھ لیکچر شپ کی پیشکش کی جاتی ہے اور دوسری طرف یہاں کی بیوروکریسی کا یہ حال ہے کہ گورنمنٹ کالج کا پرنسپل ڈاکٹر عبدالسلام کی سالانہ رپورٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

Salam is not fit for Govertment College Lahore. he may be excellent for reserch, but he is not a good college man.

چنانچہ یہ حالات تھے جن سے ڈاکٹر عبدالسلام کو بہت دکھ ہوا اور پھر ملک میں مذہب کے نام پر سیاست اور ظلم سے بھی آپ بہت مایوس ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام بادل نخواستہ ۱۹۵۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی کی دعوت پر بطور لیکچرار وہاں تشریف لے گئے اور خدا کی قدرت دیکھئے وہاں جاکر بھی آپ کو کس طرح اپنے پیارے وطن پاکستان کی خدمت کی توفیق ملی۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے مادر وطن پاکستان کی طرح اپنے مادر علمی گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بہت پیار تھا۔ گو گورنمنٹ کالج لاہور سے ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد بھی آپ سے بعض اوقات تعصب کا مظاہرہ کیا گیا مثلاً ۱۹۸۹ء میں گورنمنٹ کالج نے اپنی ۱۲۵ سالہ تقریبات کے سلسلہ میں "راوی" کا جو خصوصی نمبر شائع کیا اس میں تمام سابقہ ایڈیٹران کی فہرست بھی شائع کی گئی ڈاکٹر عبدالسلام کا نام ہی خارج کر دیا گیا۔

گورنمنٹ کالج کے ایک پروفیسر صاحب نے مجھے بتایا کہ جب میں نے یہ رسالہ اٹلی میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو ڈاکٹر صاحب نے پر مسرت چہرے سے رسالہ کو لیا اور چونکہ ٹائیٹل کے اندر والے صفحہ پر ایڈیٹران کی فہرست تھی تو خوشی خوشی اس فہرست کو دیکھا کہ ان کے مادر علمی کے رسالہ کے مدیران میں سے ان کا بھی نام ہے لیکن "اسوقت انہیں یہ جان کو بہت دکھ ہوا کہ ان کا نام نہیں لکھا گیا۔" اور موجودہ پرنسپل صاحب کے بقول یہ غلطی سے ہوا اور بعد میں دوبارہ لسٹ تصحیح کے ساتھ شائع کی گئی جب کہ اس وقت کی تحقیقات کے مطابق متعلقہ شعبہ نے محض احمدی ہونے کی وجہ سے تعصب کا مظاہرہ کیا تھا (گو کہ اب جب دوبارہ فہرست شائع کی تب بھی تعصب کی نمایاں جھلک قائم تھی جس کا ذکر اسی رسالہ میں الگ صفحہ پر پڑھا جاسکتا ہے۔ مدیر)

(حیرت ہے غلطی سے صرف احمدیوں کا نام ہی خارج ہوتا ہے۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج سے معذرت کے ساتھ) لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ گورنمنٹ کالج کے موجودہ پرنسپل جناب خالد آفتاب ڈاکٹر عبدالسلام سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں اور ۱۹۹۶ء میں گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر صاحب کی ۷۰ویں سالگرہ بھی منائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی جناب پروفیسر خالد آفتاب صاحب کی سرپرستی میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خدمات کے اعتراف میں مزید کام بھی ہوئے جن کا تفصیلی ذکر ان کے انٹرویو میں شامل ہے۔ مزید بر آں پاکستان گولڈن جوبلی کے موقع پر جو "راوی" کا خصوصی شمارہ شائع ہوا اس کا انتساب بھی اس وقت گورنمنٹ کالج کی ڈاکٹر عبدالسلام سے عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور وہ انتساب یہ ہے:۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے عظیم فرزند نوبل انعام یافتہ سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام اور ان تمام شخصیات کے نام کہ جن کی کاوشوں کی بدولت گورنمنٹ کالج ایک روشن روایت بنا۔

راوی کے اس رسالہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ۲۳ صفحات پر مشتمل "گوشہ عبدالسلام" بھی ترتیب دیا گیا ہے۔

رسالہ خالد کے "ڈاکٹر عبدالسلام نمبر" کے لئے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب صاحب، شعبہ فزکس کے چیئرمین جناب

"دروغ بر گردن راوی"

ڈاکٹر صاحب کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر کس و ناکس مثبت رائے رکھتا ہے اور ان کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے سوائے متعصب اور ایسے لوگوں کے گروہ کے جنہیں اخبارات میں بھی "مذہبی جنونیوں کا ٹولہ" کہا جاتا ہے۔ اور جن کو برسراقتدار طبقہ نے اپنے مفاد کی خاطر ہمیشہ Free Hand دیا۔ جہاں بھی ان کا بس چلا ڈاکٹر صاحب کے خلاف جو بھی ان سے ہو سکا کیا۔ اور یہاں تک کہ اگر کہیں ان کا نام بھی آیا تو اس کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ ایک مثال گورنمنٹ کالج لاہور کی 125ویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والا "راوی" کا ضخیم خصوصی شمارہ ہے۔
یہ رسالہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کے آغاز میں ٹائیٹل صفحہ پر "فہرست مدیران حصہ اردو" شائع ہوئی ہے۔ جس میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۸۹ء تک کے مدیران کی فہرست ہے۔ تعصب کی گھٹیا ترین مثال ہے کہ دونوں جگہ پر ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اس مجلہ کے مدیر رہ چکے ہیں۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ متعلقہ افراد کو علم نہیں ہوا ہو گا۔ کیونکہ اول تو راوی کے مجلات لائبریری میں محفوظ ہیں آخر بقیہ مدیران کی فہرست بھی تو مرتب کی ہوگی۔ اور پھر اسی شمارے کے مضامین میں سے سب سے پہلا مضمون ہی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا تحریر کردہ ہے جو کہ صفحہ ا سے صفحہ ۸ تک ہے۔ اس میں صفحہ ۲ پر خود ڈاکٹر صاحب رقم فرماتے ہیں۔

"..... ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ "راوی" کے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا....."

ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کالج کے تاریخی ریکارڈ کو جس طرح مسخ کیا گیا اس پر انصاف پسند طبقہ کو دکھ ہوا ہو گا اور خود ڈاکٹر صاحب نے بھی توجہ دلائی۔ اور شاید اس صریحاً ناانصافی کا احساس تھا یا کوئی اور امر کہ اگست 1997ء میں راوی کے گولڈن جوبلی نمبر میں مدیران کی دوبارہ فہرست شائع کی گئی تو اردو والے حصہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کا نام ایک دوسرے صاحب کے ساتھ دیا گیا انگریزی والے حصہ میں ایک اور صاحب کے ساتھ نام دیا گیا گویا کہ اس کے دو مدیر تھے۔ لیکن اب اس تصحیح شدہ فہرست کو دیکھنے کیلئے اب ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اور یوں "عذر گناہ" کے طور پر ڈاکٹر صاحب کا نام دے تو دیا گیا۔
لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس تعصب کا فائدہ؟ اس سے کیا حاصل ہوا؟

کیا ڈاکٹر صاحب کے وقار یا عزت کو کچھ نقصان ہوا یا الٹا گورنمنٹ کالج اور اس کے مجلہ "راوی" کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے اس کے وقار کو دھچکا لگا۔

The RAVI

Magazine of the Government College, Lahore.

BOARD OF EDITORS

Editor-in-Chief—ABDUS SALAM.

Joint Editor—Anand Kumar Malik.
Asst. Editor—R. K. Kaul.

Urdu Editor—Mohamed Hussain.
Hindi Editor—Maharaj Krishan.
Punjabi Editor—Gurindarjit Singh.

January 1946.

Vol. XXXX. No. 3.

Printed by L. Moti Ram, Manager, at the [illegible] Press, Chatterji Road, Lahore, and Published by Mr. [illegible], Manager, for the Government College Council, Lahore.

ہم ڈاکٹر صاحب کے زمانہ ارادت کے مجلہ راوی کے ٹائیٹل پیج کا عکس ریکارڈ کی درستی کیلئے شائع کر رہے ہیں۔

محمد زکریا بٹ صاحب اور شعبہ فزکس کے سابق صدر ڈاکٹر اکرام الحق صاحب سے ہم نے انٹرویو کی درخواست کی تھی۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود نامور دانش گاہ کے ان نامور اساتذہ نے ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر جس طرح ہمیں خوش آمدید کہا اس پر خاکسار ذاتی طور پر رسالہ خالد اور اس کے قارئین کی طرف سے ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ (آمین)۔

محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب صاحب سے گفتگو

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب گورنمنٹ کالج کے طالب علم اور استاد بھی رہے اور انہوں نے سائنس کے میدان میں جو عظیم کارنامے سرانجام دیئے بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ اصل میں تو ڈاکٹر صاحب کے دور میں میں یہاں تھا نہیں۔ وہ لوگ جو اس دور میں یہاں پڑھتے ہیں یا جو یہاں تھے سبھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو ان کے ساتھی رہے اور وہ بھی شامل ہیں جو ان کے شاگرد رہے۔ ہم نے پچھلے سال ڈاکٹر صاحب کی ۷۰ ویں سالگرہ منائی تھی اور اس دور کے لوگوں کو بلایا تھا۔ جو ان کے تاثرات سنے اس سے یہی پتہ چلا کہ واقعی بڑا سیانا' ذہین نوجوان استاد تھا جو گورنمنٹ کالج میں تھا۔ بعد میں انہوں نے جو بھی کامیابیاں حاصل کیں اس پر گورنمنٹ کالج کو بہت فخر اور ناز ہے۔

سوال:۔ گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے اعتراف میں کوئی اقدامات کئے ہیں؟

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر دو میڈل جاری کئے ہیں جن کا نام سلام میڈل رکھا گیا ہے۔ جو ہر سال فزکس اور ریاضی کے شعبہ میں اول آنے والے طالب علم کو دیا جائے گا۔ دوسرے ہم اپنے اولڈ ہال کا نام بھی ڈاکٹر سلام ہال رکھ رہے ہیں۔ اس کی تختی بن چکی ہے۔ صرف لگانے کی تقریب ہونی ہے۔ اس ہال کے اندر ڈاکٹر صاحب کی بڑی سی تصویر لگائی جائے گی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر گورنمنٹ کالج میں ایک چیئر قائم کرنے کا بھی اصولی فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کالج نے گرانٹ کی منظوری بھی دے دی ہے۔

سوال:۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ چیئر کے لئے فنڈز کی منظوری گذشتہ حکومت نے دی تھی اور وہ رقم بھی بہت تھوڑی تھی اور اب گرانٹ ملنے میں کچھ مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ سب کام ہو چکا ہے صرف یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سے گرانٹ لینی ہے۔

سوال:۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو کردار ادا کیا اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ پاکستان میں سائنس کی ترقی میں انہوں نے کافی کردار ادا کیا ہے جیسے وہ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر بھی رہے۔ اس طرح انہوں نے اور بھی بہت سے کام کئے۔ (تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں)

سوال:۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو خدمات کیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے ان کا حق ادا کیا گیا۔

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ نہیں' بالکل نہیں۔

سوال:۔ گورنمنٹ کالج کی ۱۲۵ سالہ تقریبات کے سلسلہ میں جو راوی کا خصوصی نمبر شائع ہوا اس میں ایڈیٹرز کی فہرست سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام خارج ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ غلطی سے ایسا ہو گیا تھا۔ بعد میں تصحیح کے ساتھ دوبارہ فہرست شائع کر دی گئی تھی۔

سوال:۔ محترم پرنسپل صاحب اس طرح ایک اور ناگوار سی لیکن قابل افسوس بات کے متعلق پوچھنا چاہوں گا گذشتہ دنوں جب وزیر اعظم نواز شریف صاحب گورنمنٹ کالج آئے تو انہوں نے کالج میں پڑھنے والی نمایاں شخصیات کے نام لئے ان میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام نہیں تھا۔ تو اس کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر عبدالسلام۔ نئی ایسا نام نہیں

تھا کہ از خود نظر انداز ہو سکتا۔

جناب خالد آفتاب صاحب:۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔ اس بارے میں تو آپ نواز شریف صاحب سے پوچھیں۔

آخر پر جناب خالد آفتاب صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ایک ذہین' بہت سیانے' لائق' نہایت محنتی اور بہت اعلیٰ پائے کے سائنسدان تھے۔ اس پر گورنمنٹ کالج کو بھی فخر ہے' بلکہ پوری پاکستانی قوم کو فخر ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ فزکس کے

چیئرمین ڈاکٹر محمد زکریا بٹ سے گفتگو

پروفیسر ڈاکٹر محمد زکریا بٹ گورنمنٹ کالج آف لاہور شعبہ فزکس اور

for Advanced Studies in Physicsi Center

کے چیئرمین ہیں۔ آپ کو فزکس کے شعبہ میں نمایاں تحقیقی کام کرنے پر ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے "تمغہ امتیاز" سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بہت سے ایوارڈز حاصل کئے۔ آپ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف فزکس کے نائب صدر بھی ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (ICTP) ٹریسٹ آف اٹلی کی طرف آپ کو ایسوسی آف ایوارڈ ملا۔ جس کے تحت آپ چھ سالوں کے دوران تین دفعہ تین سے چھ ہفتوں کے لئے ٹریسٹ جاسکتے تھے۔ ICTP (ٹریسٹ) میں اسی عرصہ قیام کے دوران آپ کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور آپ ان سے بہت متاثر ہوئے۔

قارئین خالد کے لئے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو جو اپنے پیارے وطن پاکستان سے محبت تھی اس بارے میں زکریا بٹ صاحب بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے جو میری ملاقاتیں ہوئیں ان میں میں نے دیکھا کہ پاکستانیت ڈاکٹر صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہاں پاکستان میں رہنے والوں کو شاید اتنا لگاؤ نہ ہو جتنا ڈاکٹر صاحب کے دل میں پاکستان کا درد تھا۔ ٹریسٹ میں کسی پاکستانی کو کوئی مسئلہ ہو خواہ مالی نوعیت کا ہو یا انتظامی نوعیت کا اگر ڈاکٹر صاحب کے علم میں آجائے تو فوراً اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اپنے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ مجھے ٹریسٹ سے ایک ہفتہ کے لئے لندن جانا پڑ گیا۔ میری خواہش تھی کہ مجھے جو ڈیلی الاؤنس ٹریسٹ کے قیام کے دوران مل رہا ہے وہی لندن میں قیام کے دوران بھی ملتا رہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ بعد میں فنانس سیکشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اس پر اعتراض کیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جو میں نے فیصلہ کر دیا وہی فائنل ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی یہ عادت تھی کہ کوئی بھی پاکستان سے جاکر ملتا اس سے پاکستان کے حالات کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ اگر کوئی تشویشناک خبر ملتی تو آپ کو بہت دکھ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب سائنسی علوم کے تو سمندر تھے۔ آپ ہمیشہ پاکستانیوں کو مشورہ دیتے رہتے کہ وہ فزکس کے جدید علوم کی طرف توجہ کریں تاکہ ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کر سکیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی شدید خواہش تھی کہ کاش میرا ملک پاکستان بھی ترقی یافتہ ممالک کی برابری کر سکے۔

زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام عام انسانوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ کسی کا کسی بھی نوعیت کا مسئلہ ہو اگر ڈاکٹر صاحب کے علم میں آجاتا تو ڈاکٹر صاحب ممکن حد تک اس کی ہر طرح سے مدد کرتے۔ آپ ایک انسان دوست اور وطن پرست شخصیت تھے۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ہمارے میڈیا اور قوم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے یا نہیں زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ ہمارے میڈیا نے ڈاکٹر صاحب کو جس طرح حق تھا اس طرح کی کوریج نہیں دی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں تعلیم عام نہیں۔ یہاں اہمیت ان لوگوں کی ہے جو لوگوں کو جیل بھجوا سکے یا جیل سے چھڑا

سکے۔ پٹواری کی عزت ہے جو زمین کو ادھر ادھر کر سکے۔ فنکاروں اور کرکٹروں کی عزت ہے کیونکہ ان میں گلیمر ہے اور ہمارا میڈیا صرف گلیمر کے پیچھے دوڑتا ہے۔ کوئی فنکار فوت ہو جائے تو کئی کئی دن اس کو کوریج دی جاتی ہے۔ ہمارا یہ رویہ جہالت کی وجہ سے ہے۔ یہاں سائنسدان اور عالم کی کوئی عزت نہیں۔ اس کے برعکس اگر ترقی یافتہ قوموں کی طرف دیکھیں تو ان رویہ میں توازن ہوتا ہے۔ وہ اپنے سائنسدانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کو اوپر لے جانے والے ہیں۔ ان کا یہ بہت احترام کرتے ہیں۔ زکریا صاحب نے کہا اس کا عملی واقعہ جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بتاتا ہوں۔ ٹریسٹ (اٹلی) میں سائنس کے بارے میں ایک تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس میں ایک لمبی سی میز تھی جس کے درمیان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب تشریف فرما تھے اور دونوں طرف پانچ پانچ کرسیاں تھیں۔ ایک طرف پانچوں سائنسدان تھے جب کہ دوسری طرف چار سائنسدان بیٹھے تھے اور ایک کرسی ٹریسٹ صوبے کے گورنر کے لئے تھی۔ گورنر کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے لیکن تقریب اپنے وقت پر شروع ہو گئی۔ کسی نے گورنر کا انتظار نہیں کیا۔ جب گورنر صاحب تشریف لائے تو تقریب جاری تھی۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے آئے کہ مبادا تقریب میں خلل پڑے اور پہلے ڈاکٹر سلام صاحب کو جھک کر سلام کیا اور پھر خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور جب تقریب ختم ہوئی تو گورنر صاحب خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے اور کوئی بھی انہیں دروازے تک چھوڑنے نہیں گیا کیونکہ وہاں تو گورنر بھی جانتا ہے کہ وہ تو محض ایڈمنسٹریٹر ہے اور یہ لوگ تو علوم کے ماہرین ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو معاشرے کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ہے ترقی یافتہ قوموں کا رویہ لیکن ہمارے ہاں جب تک تعلیم عام نہیں ہوگی لوگوں میں شعور بیدار نہیں ہوگا اور لوگوں کا ایسا ہی رویہ رہے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہاں بعض اوقات بعض تعصبات کی بناء پر ڈاکٹر صاحب سے زیادتیاں کی گئیں جس کی مثال دیتے ہوئے زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور نے ۱۲۵ سالہ تقریبات کی خوشی میں "راوی" کا خصوصی نمبر نکالا اور ۱۹۹۰ء میں مجھے ٹریسٹ جانے کا موقع ملا اور میں وہ خصوصی شمارہ ڈاکٹر صاحب کے لئے لے گیا۔ میرا خیال کہ ڈاکٹر صاحب رسالہ دیکھ کر خوش ہوں گے اور میں نے جاتے ہی "راوی" کا خصوصی شمارہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے فوراً پہلا صفحہ نکال کر دیکھنا شروع کیا تو وہاں جب سے راوی نکلنا شروع ہوا اس وقت سے اب تک کے ایڈیٹرز کے نام درج تھے کہ فلاں فلاں عرصہ میں فلاں صاحب ایڈیٹر رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صفحہ پر انگلی پھیرتے ہوئے تیزی سے وہ فہرست دیکھنی شروع کی اور ایک جگہ آکر رک گئے اور کہنے لگے میرا نام کہاں ہے۔ اس عرصہ کے دوران تو میں ایڈیٹر تھا لیکن میرا نام غائب ہے۔ زکریا بٹ صاحب بتاتے ہیں یہ صورتحال دیکھ کر بجائے اس کے کہ تحفہ دے کر مجھے خوشی ہوتی مجھے انتہائی شرمندگی ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھو یہ بندہ ہم پاکستانیوں کے لئے کیا کر رہا ہے اور ہم نے اس کا کیا حال کیا ہے کہ محض اس کے احمدی ہونے کی وجہ سے اس کا نام ایڈیٹرز کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے اور یہ Intellectual Dishonesty تھی۔ میں نے واپس جاکر پرنسپل گورنمنٹ کالج سے بات کی اور تحقیق کے بعد یہی پتہ چلا کہ مذہبی تعصب کی بناء پر لسٹ بنانے والے نے ان کا نام ڈراپ کر دیا تھا۔ بعد میں وہ لسٹ دوبارہ شائع کی گئی لیکن کیا فائدہ ہوا۔ ہم نے ایک دفعہ تو اس بندہ کو ذہنی صدمہ پہنچا دیا۔ تو بعض اوقات ہمارے مذہبی تعصب کی یہ انتہا بھی ہے۔

آخر پر ڈاکٹر زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب تو ہمارا قومی اثاثہ تھے۔ یہ تو قوم کی بدقسمتی ہے کہ ان کی وہ قدر نہیں کی گئی جو کرنی چاہئے تھی ورنہ تو ساری عمران کی پوجا کریں تو تب بھی یہ ان کا دیا ہوا نہیں دے سکتے۔

گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ فزکس کے سابق چیئرمین پروفیسر محمد اکرام الحق سے

انٹرویو

آپ نے بی۔ اے آنرز کا امتحان ۱۹۴۷ء میں پنجاب

یونیورسٹی سے اول پوزیشن میں پاس کیا اور یہیں سے ۱۹۵۰ء میں فزکس میں ایم۔ایس۔سی کی ڈگری نمایاں پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ آپ کو ۶۰۔۱۹۵۹ء میں امپریل کالج لندن میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں شعبہ فزکس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے آپ کی تقرری گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی۔ آپ کو وزارت خارجہ کے تحت بیرون ممالک میں پاکستانیوں سفارتخانوں میں بھی خدمات کی توفیق ملی۔ آپ نے اقوام متحدہ میں ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی کمیشن میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔

آپ نے انٹرمیڈیٹ اور ڈگری سطح کے لئے فزکس کی بہت سی کتب بھی تحریر کیں۔ آپ اس وقت پاکستان فورم لاہور کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں۔

آپ نے رسالہ خالد کے ڈاکٹر عبدالسلام نمبر کے لئے جو انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر اکرام الحق کو امپریل کالج میں ڈاکٹر سلام صاحب سے پڑھنے کا موقع ملا۔ بحیثیت ٹیچر ڈاکٹر سلام صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ تیاری کرکے آتے تھے اور مضمون سے متعلقہ جتنے حوالوں کی ضرورت ہوتی وہ سب کے سب ڈاکٹر صاحب کے پاس ہوتے تھے اور ہمیں بھی ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سمجھنے کے لئے پہلے بہت سے کورسز سے گزرنا پڑتا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے جس موضوع پر لیکچر دینا ہوتا اس بارے میں وہ بہت تیاری کرتے تھے اور یہ ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خوبی تھی اور بہت بڑے بڑے نام ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ ہمارے دور میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی تھے۔ منیر، ڈاکٹر فیاض اور ڈاکٹر ریاض تھے۔ ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر نی مان (Niman) تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کا لیکچر خصوصی طورر پر سننے کے لئے آیا کرتا تھا حالانکہ وہ امپریل کالج سے پی۔ایچ۔ڈی کرچکا تھا اور برطانیہ میں اپنے ملک کے سفارت خانے میں بہت بڑے عہدے پر تھا۔ اس کی ریسرچ اتنی زیادہ تھی کہ اس کا نام کئی دفعہ نوبل انعام کے لئے Mention ہوا۔ ہم اس سے پوچھتے تھے کہ تمہیں کیا ضرورت ہے لیکچر سننے کی تم تو زندگی کی Peak پر پہنچ چکے ہو۔ وہ کہا کرتا کہ اسرائیل میں اس کی کوئی قدر نہیں کہ تم ڈی۔سی یا وزیر بن گئے ہو یا تمہیں بہت بڑا عہدہ مل گیا ہے وہاں تو سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تعلیمی میدان میں آپ سب سے اونچے مقام تک پہنچ جائیں۔ بعد میں وہ اپنے ملک میں سائنس کا وزیر بھی بنا۔ گو اسے ابھی تک نوبل انعام تو نہیں ملا لیکن اس کا نام بڑے بڑے سائنسدانوں میں لیا جاتا ہے۔ تو اس قسم کے عظیم سائنسدان بھی ڈاکٹر سلام صاحب کے شاگرد تھے۔ امپریل کالج میں تو بعض اوقات شعبے کا سارا اسٹاف ڈاکٹر سلام صاحب کا لیکچر سننے کے لئے آیا ہوتا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیکچر میں بہت سی نئی چیزیں پتہ چلتی ہیں۔

اس کے بعد سلام صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرام الحق نے کہا کہ ڈاکٹر سلام

One of the most God fearing scientist

تھا۔ یورپ میں ایک کتاب بھی شائع ہوئی میں اس کا نام بھول رہا ہوں اس میں ایک باب ڈاکٹر سلام کے بارے میں تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ اس صدی کی فزکس کا سب سے ذہین اور روشن دماغ سائنسدان، خوف خدا رکھنے والا اور مذہبی شخص تھا۔ ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے بتایا کہ قرآن کریم سے تو ڈاکٹر سلام صاحب کو حد سے زیادہ عشق تھا۔ سب سے بڑی مثال اس کی یہ ہے کہ جب نوبل انعام وصول کرنے جانا تھا تو وہاں نوبل انعام لینے والے کو اڑھائی منٹ دیئے جاتے ہیں کہ آپ اتنے وقت میں بتاؤ کہ کیا کیا ہے تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جو نوبل پرائز لینے والے تھے گلیشو اور وائنز برگ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ آپ (معتبر اور) فلاسفر آدمی ہیں آپ ہی ہماری نمائندگی کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب گئے اور آپ نے سورۃ الملک کی چار آیات پڑھیں اور کہا کہ خدا نے اس کائنات میں اس قدر سمٹری رکھی ہے کہ ہم کوئی نقص نہیں نکال سکتے اور اسی کائنات کے سربستہ رازوں کے بارے میں ہم کام کر رہے ہیں۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ ایسے پلیٹ فارم پر قرآن کریم کو Quote کرنا بڑی جرات اور اعتماد کی بات ہے اور بعد میں دونوں سائنسدانوں نے ڈاکٹر سلام صاحب کو کہا کہ آپ نے ہماری ترجمانی بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔

سائنس کے میدان میں ڈاکٹر سلام کی Contributions کا ذکر کرتے ہوئے اکرام الحق صاحب فرماتے ہیں کہ ۹ویں صدی سے ۱۴ویں صدی عیسوی تک جیسے آج نیوٹن اور آئن سٹائن کا نام لیا جاتا ہے اس طرح کے مسلمان سائنسدان جو ٹاپ کے ہوتے تھے اور اس کے بعد بیسویں صدی تک ہمیں کوئی بڑا سائنسدان نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر سلام نے اس سلسلہ کو دوبارہ گویا کہ جاری کیا اور اس تاریخ کو دوبارہ جوڑا ہے۔

ڈاکٹر سلام کی یہ بھی خوبی تھی جب وہ فزکس کی کلاس میں لیکچر دیتے تو ان کا لیکچر بہت علمی ہوتا لیکن وہی سلام جب عوامی سطح پر سائنس کی بات کرتے تو ان سے زیادہ عام فہم انداز میں کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی زبان میں روانی تھی اور ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور

He was a great lover of punjabi

یعنی وہ پنجابی زبان کے بھی عاشق تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ امرتسر یونیورسٹی نے انہیں اعزازی ڈگری دینے کے لئے بلایا تو ڈاکٹر سلام نے وہاں ساری کی ساری تقریر پنجابی میں کی۔ تقریر کے بعد ایک سکھ سائنسدان نے پنجابی میں سوال کیا کہ "تسیں دواں قوتاں نوں ملاکے چاراں تو تن کردتا اے۔ ھن تے تاڈے کول جدید سامان وی اے۔ کمپیوٹیر وی ہیں تے ھن Unity ثابت ھون چے کن سال لگن گیں گے" (یعنی آپ نے دو قوتوں کو ملا کر تین قوتیں ثابت کردی ہیں۔ اب تو آپ کے پاس جدید ذرائع ہیں۔ کمپیوٹرز ہیں۔ اب ایک قوت ثابت ہونے میں کتنی دیر لگے گی)۔ فوراً اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے پنجابی میں ہی دیا اور کہا کہ "سردار جی سائنسداناں کول کوئی جھرلو نئیں ایں جس نال او اے کرسکن۔ دو سو سال وی لگ سکدے نیں تے تین سو سال وی"۔ (یعنی سائنسدانوں کے پاس کوئی جھرلو نہیں ہے جس سے وہ فوراً ثابت کرسکیں۔ اس پر دیر بھی لگ سکتی ہے)۔ ڈاکٹر صاحب کے اس جواب کو ہندوستان کے ایک پنجابی اخبار نے اسی طرح شائع کیا۔

ڈاکٹر اکرام صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے نظریات کی بنیاد مذہب پر تھی۔ مثلاً اس وقت تک سائنسدانوں کا خیال ہے کہ پروٹان غیر فانی ذرہ ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب فرماتے تھے کہ جب خدا نے کہہ دیا ہے کہ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام تو پروٹان کیسے لافانی ہو سکتا ہے۔ آپ کی بیٹی نے بھی جب ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا تو لکھ دیا کہ ہو سکتا ہے کسی وقت ثابت ہو جائے کہ پروٹان بھی تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس پر کالج کے پروفیسروں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس طرح تو کائنات کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی اور اب ڈاکٹر صاحب اس پر بھی کام کر رہے تھے۔

پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر سلام صاحب صدر پاکستان کے سائنسی مشیر رہے ہیں۔ پاکستان میں بہت سے ادارے ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے معرض وجود میں آئے اور اس وقت فزکس کے میدان میں جتنے بھی پاکستان کے نمایاں سائنسدان ہیں ان کی ٹریننگ میں ڈاکٹر سلام صاحب ہی کا بنیادی کردار ہے۔ ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ فزکس میں پاکستانی ماہر لڑکوں کو مزید تعلیم کے لئے باہر ایڈجسٹ کروائیں۔ ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے فزکس ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر مجاہد کامران کا حوالہ دیتے ہوئے کہا مجاہد کامران تو کہا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کے ساتھ جنون کی حد تک محبت تھی۔ جب انہیں پتہ چلتا کہ فزکس کا فلاں پروجیکٹ شروع ہو رہا ہے تو فوراً بتاتے کہ اس میں فلاں پاکستانی سائنسدان کو ایڈجسٹ کرواؤ۔ ڈاکٹر اکرام صاحب نے کہا کہ اب دیکھیں پاکستان میں فزکس کے چند سائنسدان ہیں اور ۱۵ فی صد یہاں کی شرح خواندگی ہے۔ پھر ڈاکٹر عبدالسلام کی یہ کوشش تھی کہ ICTP کا ادارہ پاکستان میں بنے لیکن اس کے برعکس یہاں کے ارباب حل و عقد کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے اکرام صاحب نے بتایا جب اس ادارہ کے لئے سلام صاحب نے صدر ایوب سے بات کی تو اس کے اخراجات کا تخمینہ مانگا اور اس تخمینہ پر اس وقت کے سیکرٹری فنانس نے صدر کو خفیہ رپورٹ دی کہ پروفیسر اپنے پروفیسر بھائیوں کے لئے انٹر کانٹینینٹل ہوٹل بنانا چاہتا ہے۔ ہمارا ملک اس عیاشی کو افورڈ نہیں کرسکتا۔ حالانکہ اس سینٹر پر بہت بڑی رقم خرچ نہیں ہونی تھی کیونکہ تھیوریکل فزکس کے لئے کیا چاہئے عمارت، کمپیوٹرز، لائبریری اور ذرائع ابلاغ۔ لیکن اس پر ہمارے

حکمرانوں کا رویہ کیسا تھا۔

اور اس کے برعکس مختلف ممالک نے کوشش کی کہ ڈاکٹر سلام ان کی شہریت لے لیں۔ مثلاً نے ڈاکٹر سلام صاحب کو کہا کہ آپ تقسیم ہند سے پہلے تو انڈین تھے۔ ایک دفعہ انڈیا آجائیں۔ ہم جیسا ادارہ آپ کہیں گے بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب بھلا کیسے ماننے والے تھے۔ بلکہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کے دوران انڈین اخبارات کے تراشے دیکھے ہیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے بار بار کہا کہ ہم آپ کو ۳۰۰ کروڑ آفر کرتے ہیں اور "سلام یونیورسٹی" سری نگر میں بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہ آپ میرے نام پر جو مرضی بنائیں میں اول و آخر پاکستانی ہوں۔ اس کے بعد بڑے دکھ بھرے انداز میں ڈاکٹر اکرام صاحب نے بتایا کہ جھنگ کی سرزمین نے دو نوبل انعام یافتہ پیدا کئے۔ ایک سلام اور دوسرے ھری گوبند سرانہ۔ موخر الذکر کو ۱۹۶۹ء میں DNA میڈیسن میں نوبل انعام ملا تھا۔ اس نے کنگ ایڈورڈ سے ایم۔بی۔بی۔ایس کیا تھا اور امریکہ میں رہ کر ریسرچ کر رہا تھا جب اسے نہرو نے کہا تم انڈیا واپس آجاؤ اور ہم تمہارے نام سے بائیالوجیکل ریسرچ لیبارٹریز آف انڈیا بنائیں گے اور پورے بھارت میں ان لیبارٹریز کی ایک (Chain) زنجیر بنادیں گے۔ ہری گوبند نے کہا کہ مجھے مزید تعلیم کے لئے امریکہ نے مواقع فراہم کئے اس لئے میرا سب کچھ امریکہ کا ہی ہے۔ مجھے بھول جاؤ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ اس کے برعکس دیکھئے دوسرا سپوت بھی جھنگ کا ہی تھا یعنی ڈاکٹر عبدالسلام۔ اس کو اپنے وطن پاکستان سے اس قدر محبت تھی کہ کہا زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد مجھے دفن تو پاکستان میں کریں۔ پاکستان ڈاکٹر سلام کی First Priroity تھا اور پاکستان ہی ڈاکٹر سلام کا First and Last Love تھا۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستانیوں میں بہت Potential ہے لیکن اس کے لئے ملک میں حالات سازگار نہیں کہ وہ آگے آسکیں۔

بقیہ از صفحہ 114

میں اطالیہ کے شہر ٹریسٹے میں قائم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے جسے نسل در نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔

انٹرویو پینل

مکرم حافظ راشد جاوید صاحب (نمائندہ خصوصی)، مکرم منصور احمد صاحب، مکرم انصر رضا صاحب

اس مرکز کے قائم ہونے میں عبدالسلام کو کن کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے کیا کیا جنگ کرنی پڑی اس کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ مرکز عبدالسلام کے عزم محکم، جہد مسلسل اور جذبہ صادق کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں ہر سال تیسری دنیا کے ہزاروں سائنس دان مختصر قیام کے لئے آتے ہیں اور علوم جدیدہ کے ماہرین سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ ان سائنس دانوں کے سفر اور قیام کے اخراجات مرکز خود برداشت کرتا ہے۔ یہ مرکز کیا ہے وحدت انسانی کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ یہاں سیاست دانوں کی بنائی ہوئی ساری سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مشرق و مغرب ہاتھ ملاتا ہے۔ گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکیت سرمایہ داری کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔ تنہا اس مرکز کا قیام ہی عبدالسلام کا وہ کارنامہ ہے جس پر ایک اور نوبل انعام ان پر نچھاور کیا جاسکتا ہے۔ عبدالسلام کی شخصیت بڑی ہی پیاری اور دلاویز ہے۔ سامنے ہوں تو بے اختیار عقیدت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔

مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف ۱۹۷۱ء میں آئی۔سی۔ٹی۔پی ٹریسٹے میں ہوا جس کے وہ ڈائریکٹر ہیں۔ اس وقت تک ان کو نوبل انعام نہ ملا تھا۔ مگر ان کے علمی اور دیگر کارناموں کو سن سن کر دل پر ایک رعب بیٹھ چکا تھا۔ ان سے ملنے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی اور ملاقات کو جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز ہمت کرکے ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔ تعارف ہوا پھر تو شفقت کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ یکسر بھول گیا کہ ابھی چند منٹ قبل مجھے ان سے ملاقات کرنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ گفتگو اردو میں ہوئی (وہ اردو جاننے والوں سے اسی زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں) اور زیادہ تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں۔ وہ تو اس یونیورسٹی سے کبھی منسلک نہیں رہے پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس ادارے سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ہماری یونیورسٹی سائنسی تحقیق کے میدان میں کافی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تو بہت خوش ہوئے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ وہ اس کو کیمبرج اور آکسفورڈ کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ پھر کسی ہندوستانی عبدالسلام کو حصول علم کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان نہ جانا پڑے۔ کاش! ہم ان کے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا سکیں۔

پروفیسر عبدالسلام ـــــ ایک مطالعہ

آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی ـــــ تیسری دنیا پر ایک احسانِ عظیم

(مکرم پروفیسر اسرار احمد صاحب علیگڑھ یونیورسٹی۔ بھارت)

عبدالسلام اگر ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء کی بجائے اس سے سو سال قبل پیدا ہوئے ہوتے تو وہ ماہر طبیعات پروفیسر عبدالسلام نہ ہوتے بلکہ شمالی ہند کے ٹیپو سلطان ہوتے۔ ان کا حب وطن، اہل اسلام کو سربلند دیکھنے کا اضطراب اور ظلم و استحصال کے خلاف جذبہ جہاد، آتش فرنگ میں بے خطر کود پڑنا۔ مختلف طاقتوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کا ان کا ہنر، ان کا عزم، ان کا ولولہ انگریز تاجروں کے مکروہ مقاصد کے سامنے ایک ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کر دیتا لیکن قدرت نے ان کے لئے کچھ اور ہی کام تفویض کر رکھا تھا۔ وہ ایک غیر معروف قصبہ جھنگ میں اس وقت پیدا ہوئے جب انگریزوں کا پنجہ استبداد مدتوں پہلے ہندوستان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور بات کھل کر سامنے آچکی تھی کہ جب تک ہم ان علوم و فنون میں مہارت نہ حاصل کریں جو فی الحقیقت ہمارا ہی گم شدہ مال ہے اور جس کی بدولت مغرب مغرب ہے اس وقت تک مکمل آزادی اور عالمی برادری میں ایک باوقار مقام کی تمنا خیال خام ہے۔

یہ عبدالسلام کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو امیر بھی تھا اور غریب بھی۔ ان کا خاندان علم کی دولت سے بھرا تھا مگر اس کے پاس مادی وسائل کی کمی تھی جس کے نتیجے میں بچپن سے ہی ان کے دل میں علم کی عظمت جاگزیں ہو گئی اور ان کو وہ مواقع ہی نہ ملے جو اکثر بچوں کی بربادی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے والدین نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ان کی تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لی جس کی وجہ سے اسکول کی سطح سے لے کر یونیورسٹی تک کوئی بھی امتحان ایسا نہ تھا جس میں کامیاب ہونے والوں میں ان کا نام سرفہرست نہ رہا ہو۔ غیر منقسم ہندوستان میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اپنا آخری امتحان ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے ریاضی کا دیا اور ۹۵ فی صد سے زیادہ نمبر حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

نوجوان عبدالسلام کی تعلیمی میدان میں یہ قابل رشک کامیابیاں صرف ان کی خداداد ذہانت اور بہتر سرپرستی کی وجہ سے ہی نہ تھیں بلکہ اس میں ان کی دن رات کی مسلسل محنت اور لگن کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ انہیں شروع سے ہی وقت کی قیمت کا احساس تھا اور وہ شب و روز کے ۱۳-۱۴ گھنٹے حصول علم پر صرف کرتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں بھی ان کے شوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے کھلی رہتی تھی۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ وہ مطالعے میں کچھ ایسے غرق ہوئے کہ مرغی ان کی سالن کی پلیٹ سے بوٹیاں نکال کر لے گئی اور ان کو کچھ پتہ بھی نہ چلا۔

عبدالسلام جیسا شاندار تعلیمی ریکارڈ اور اپنے سماج میں سول سروس کے اعلیٰ عہدیداروں کی اہمیت، بہت ممکن تھا کہ وہ اس راہ پر لگ جاتے مگر قدرت ان کی پشت پر تھی۔ اس نے ان کی عبقریت کو فائلوں کی نذر ہونے سے بچانے کا کچھ اور ہی انتظام کر رکھا تھا۔ اولاً دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے سول سروس کے مقابلے کے امتحانات بند کر دیئے گئے تھے جس سے اس راہ پر لگنے کا امکان ہی باقی نہ رہا۔ دوم اس جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد کے لئے ایک مشہور زمیندار خضر حیات ٹوانہ نے ۱۵ لاکھ کی رقم اکٹھا کی تھی وہ ۱۹۴۵ء میں جنگ بند ہو جانے کی وجہ سے استعمال ہونے سے رہ گئی۔ بعد میں یہی رقم چھوٹے زمینداروں کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وقف کر دی گئی تھی۔ عبدالسلام کو اس فنڈ سے پانچ سو پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ

انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے ایک سال بعد ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کی وجہ سے کسی اور کو اس فنڈ سے وظیفہ نہ مل سکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ فنڈ خاص طور سے عبدالسلام ہی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

عام ایشیائی نوجوانوں کے لئے مغربی تہذیب بڑی کشش رکھتی ہے۔ وہاں کی چکاچوند بہت جلد انہیں مسحور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے نہ صرف برگشتہ ہو جاتے ہیں بلکہ الٹے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ البتہ ذہین اور حساس نوجوانوں کے لئے اسی مغرب کا قیام ایک تازیانے کا کام کرتا ہے۔ گاندھی سوٹ بوٹ میں گئے، دھوتی چپل میں واپس آئے۔

اقبال مغرب کیا گئے سراپا مشرق بن گئے

عبدالسلام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ان کا قیام کیمبرج (انگلستان) میں ۴۶ تا ۱۹۴۹ء رہا۔ اس دوران جہاں انہوں نے اعلیٰ امتیازات کے ساتھ بی۔ اے (آنرز) ریاضی کا کورس دو سال میں اور سہ سالہ بی۔ اے (آنرز) فزکس کا کورس ایک سال میں پاس کیا اور متعدد اعلیٰ پیمانے کے تحقیقی مقالے لکھے وہیں انہیں اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے اعلیٰ ہونے کا عرفان بھی ہوا۔ وہ نیوٹن اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی دن بدن بو علی سینا اور ابن الہیثم کے قریب ہوتے گئے۔ ان کا جذبہ حب الوطنی شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اپنے وطن پاکستان کی خدمت کے جذبے سے سرشار اور اسے عالمی برادری میں ایک اعلیٰ علمی مقام دلانے کی آرزو سینے میں دبائے ۱۹۵۱ء میں وہ واپس آئے جہاں گورنمنٹ کالج میں انہیں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

ایک سائنس دان غیر سائنسی مزاج کی سوسائٹی میں نکما بن جاتا ہے۔ عبدالسلام جس دور میں واپس پاکستان لوٹے وہاں کی سوسائٹی نہ صرف غیر سائنسی تھی بلکہ سائنس کش بھی تھی۔ سائنس کی اہمیت کا زبانی اقرار تو کیا جاتا تھا مگر عملاً اس کے فروغ کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ سائنس میں تحقیق کو فروغ دینے کی کوششوں کو تضیع اوقات سمجھا جاتا تھا اور کالج کی انتظامیہ اس عمل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس ماحول میں سائنس دان عبدالسلام جلد ہی اپنے آپ کو ماہی بے آب محسوس کرنے لگے اور جب بات یہاں تک پہنچی کہ ایک علمی مباحثے کے سلسلے میں گرمیوں کی تعطیل میں ان کے بمبئی آنے پر تنخواہ کاٹ لی گئی تو انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بے موت مرنے سے بچانے کے لئے پھر انگلستان کی طرف رجوع کیا۔ وہاں امپیریل کالج لندن میں ان کی تقرری بحیثیت لیکچرر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد وہیں پروفیسر کا عہدہ ملا جس پر وہ آج تک قائم ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی تحقیق کا میدان نظریاتی ذراتی طبیعات ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں کام کرنے سے بڑے بڑے لائق سائنسدان گھبراتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیقات میں ہمیشہ ہی بنیادی اہمیت کے مسائل کو اٹھایا ہے اور اس کا خوبصورت حل پیش کیا ہے۔ اب تک انہوں نے تقریباً دو سو پچاس بنیادی اہمیت کے بین الاقوامی ایوارڈ اور میڈل حاصل کئے ہیں۔

صرف ۳۳ سال کی عمر میں ہی ان کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا اور دنیائے علم کا سب سے بڑا انعام نوبل انعام ۱۹۷۹ء میں ان کو ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے علمی اور دیگر کارناموں پر دیئے گئے اعزازات کی فہرست کافی لمبی ہے اور اس کا بیان اس تعارفی خاکے میں ممکن نہیں۔

انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی قد آور کیوں نہ ہو اگر اس کا دل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ بونا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا دل بے در و دیوار ہو۔ تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مفلوجوں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبدالسلام عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو۔ عبدالسلام کے دل میں ہے۔ پاکستان کے جس سائنسی ماحول نے جنوری ۱۹۵۴ء میں ان کو اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا وہ اسے بھولے نہیں۔ ذاتی کامیابیوں اور اعزازات کی بارش میں بھی انہوں نے تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کے اس سائنسی ماحول کو یاد رکھا جس میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں سائنس کو فروغ دینے اور وہاں ایک سائنسی ماحول پیدا کرنے کے لئے وہ مستقل بے قرار رہے۔ اس بے قراری کو بالآخر "انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس" کی شکل میں سکون ملا۔ یہ مرکز جو آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی کے نام سے مشہور ہے ۱۹۶۴ء

بقیہ صفحہ 112 پر

چند یادیں — چند باتیں

مدیر ہفت روزہ "لاہور" جناب ثاقب زیروی صاحب کی خصوصی تحریر

ایاز صاحب (مدیر خالد) کا اصرار ہے کہ میں ان روح پرور یادوں کی جگالی کروں جن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام (نوبیل انعام یافتہ) کے خلق و مروت کی مہک رچی بسی ہو۔ مگر یہ سلسلہ تو ربع صدی پر محیط ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ لہٰذا آج کی صحبت میں بڑے اختصار کے ساتھ صرف مبادیات اور عنوانات ہی پر اکتفا کیا جائے گا۔

(1) یہ اغلباً ۱۹۷۲ء کی بات ہے میں جو ایک دن دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم نے بتایا کہ کوئی صاحب یہ "سیزنل اوور کوٹ" دے گئے ہیں اور جاتے ہوئے سلام کہہ گئے تھے اور میں حیران کہ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے اپنا نام بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ یہ عقدہ رات گئے کھلا جب ایئرپورٹ سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا فون آیا جس میں اوور کوٹ کا ذکر تھا۔ میں نے کہا بھائی آپ اتہ پتہ تو بتا جاتے۔ کہنے لگے میں نے نام تو بتایا تھا۔ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ہوں ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن میں فزکس کا پروفیسر تو وہ تکلف میں پڑ جاتیں۔ پھر مجھے کچھ جلدی بھی تھی۔ بس نام بتایا اور چلتا بنا۔ مگر بیگم اس نام کو سلام سمجھیں۔ اس پر اس منکسر المزاج نے ہنستے ہوئے کہا کہ "گویا نام کے علاوہ میرا سلام بھی پہنچ گیا"

(2) ڈاکٹر صاحب کو نوبیل انعام مل چکا تھا وہ ربوہ کے جلسہ سالانہ پر تشریف لائے۔ امام وقت نے انہیں اسٹیج پر بلا کر پرجوش مصافحہ اور معانقہ سے نوازا۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں حاضرین جلسہ سے چند منٹ کیلئے خطاب بھی کیا۔ اس کے بعد میں نے نظم پڑھی جس کے دو شعر یوں تھے۔

ہجوم غم سے شب خونفشاں سے گزریں گے
کھلیں گے پھول وہاں ہم جہاں سے گزریں گے

فراز دار سے کس نے ہمیں پکارا ہے
ہم آ رہے ہیں کہو ہم وہاں سے گزریں گے

میں جلسہ کے ایام میں عام طور پر "الکیمسٹ" کے مدار المہام جناب لطیف قریشی کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اگلی صبح نماز سے فراغت کے معاً بعد ایک بچے نے آکر بتایا کہ کوئی سلام صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کون سلام؟ دماغ پر زور دینے کے باوجود کوئی واضح شکل سامنے نہ آئی عرض کیا بلاؤ۔ تو دیکھا کہ وہ تو پروفیسر عبدالسلام ہیں جنہیں پچاس سے زائد یونیورسٹیاں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کر چکی ہیں اور جنہیں درجن سے زائد حکومتیں بڑے فخر و ناز سے اپنے ملک کے اعلیٰ ترین اعزازات و تمغات سے نواز چکی ہیں۔ میں نے عرض کیا بھائی مجھے بلوا لیا ہوتا! کہنے لگے میں رات بھر آپ کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ کل جو نظم آپ نے پڑھی اس کا ہر شعر میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ کاش! وہ میں نے کہی ہوتی کاش یہ سعادت میرے حصہ میں آئی ہوتی اور میں ان کی دعوت الی اللہ کیلئے تڑپ کے تصور

میں گم ہو کر رہ گیا۔

(3) ایک دن دارالذکر لاہور میں جمعہ کی نماز کے بعد ملے تو فرمایا کہ آج پانچ اور چھ بجے کے درمیان آپ کے ہاں چائے پئیں گے۔ عرض کیا "زہے نصیب" مگر چھ بج گئے ساڑھے چھ ہو گئے۔ سات بج گئے ساڑھے سات ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہیں نام و نشان نہ تھا جب کہ میں نے دو ایک دوستوں کو بھی یہ کہہ کر چائے پر بلا رکھا تھا کہ

"آج بعد دوپہر کی چائے میرے ہاں پئیں تا کہ کل اس قلق سے دوچار نہ ہونا پڑے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو نہیں دیکھا۔ اس ہستی کو جس کے جان و دل وطن عزیز پر قربان ہیں مگر وطن والوں نے اسے جلاوطنی کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں گلی کی نکڑ پر جا کر کھڑا ہوتا ہوں۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہیں آگے نکل گئے ہوں گے مگر پونے آٹھ بجے آپ آگئے اور آتے ہی بڑی سادگی اور بے تکلفی سے فرمایا "پھر میں نے سوچا۔ چائے کا کیا پینا ہے کھانا کھائیں گے تا کہ کچھ دیر بیٹھیں بھی۔"

کھانے کے دوران "لاہور" کے پیکٹ اور بنڈل (ڈاک سے) اٹھوائے جانے کا ذکر چھڑا تو میں نے بتایا کہ ۲۷۵۴ گاہک ٹوٹے ہیں تو کہنے لگے جنرل ضیاء کا اصرار ہے کہ میں اس سے ضرور ملوں۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا۔ مگر اب ضرور ملوں گا اور لاہور سے ہونے والی زیادتی کا ذکر کروں گا۔ عرض کیا اگر آپ کی ملاقات ہو ہی جائے تو متعدد اور جماعتی امور ذکر کرنے کے ہیں۔ "لاہور" کا ذکر نہ ہی چھیڑیئے گا۔ دراصل میں اسے یہ مسرت نہیں پہنچانا چاہتا کہ ثاقب نے اذیتوں سے ہار مان کر سفارشیں شروع کر دی ہیں۔ متردد ہوئے پھر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے۔ "تو یوں کہو ناں کہ کشتیاں جلا کر میدان میں اترے ہو۔"

(4) ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی لاہور یاد آجاتا تو چندہ بھجوا دیتے بعض اوقات تو سال میں تین تین چار دفعہ بھجوایا۔

۹۵ء کے جلسہ سالانہ لندن میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تو ڈاکٹر صاحب کی عیادت کا خیال قلب و ذہن پر سوار ہو گیا۔ بشیر احمد آرچرڈ محترم کا بھلا ہو کہ انہوں نے ہماری ملاقات کرانے کی ذمہ داری لے لی۔ چوہدری حمید نصراللہ خان اور میں "آکسفورڈ" میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی اقامت گاہ پر بیٹھے رہے۔ چائے پی' بالآخر رخصت کی اجازت لی۔ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھائے مگر ڈاکٹر صاحب تو ہاتھ چھوڑتے ہی نہ تھے ان کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی گرفت لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے مگر بولنے کی سکت نہ تھی۔ بالآخر رو پڑے اور میری آنکھیں بھی غمناک ہو گئیں۔ واپسی پر تمام وقت یہ احساس قلب و ذہن پر مستولی رہا ایک شریف النفس انسان' ایک موحد سائنسدان' جس نے تمام عمر وطن عزیز کیلئے خیر و برکت کی دعائیں مانگیں۔ نوبیل انعام پا کر عالم اسلام کو سربلند کیا نوبل انعام میں ملنے والی رقم بھی وطن عزیز کی نذر کر دی۔ مگر اجہل ملاؤں میں گھرے ہوئے حکمرانوں نے اس کے خلوص کی کوئی قدر نہ کی۔

بقیہ از صفحہ 102

رات کی خبروں میں ٹی وی پر صدر مملکت سے ملاقات اور اس کانفرنس کو کوریج دی گئی۔ اگلے روز آپ بیجنگ کیلئے روانہ ہو گئے۔ ایک دور دراز کے اجنبی ملک میں عبدالسلام کی کتنی قدر اور احترام میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ خدا نے آپ کے والد بزرگوار کو عبدالسلام کی بشارت دی تھی۔ جب اس نے بتادیا تھا کہ تمہارا بیٹا بہت بلندی اور عروج پائے گا خدا کی بات پوری ہونی تھی سو ہو گئی قوموں نے استفادہ کیا۔ قوموں نے قدر کی۔ قوموں نے اس کا اعتراف کیا۔

ہاں ایک چوتھی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ ملاقاتی پیار و محبت کا جذبہ لئے لمبی قطاروں میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے میں بھی ان میں شامل تھا لیکن اس وقت "آپ کی اپنی جلاوطنی کی زندگی" ختم ہو چکی تھی اور آپ اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو چکے تھے اسی مالک حقیقی سے جس نے حضرت چوہدری محمد حسین کو عبدالسلام کی خوشخبری دی تھی۔ جہاں ہمیں امید ہے کہ "سلاماً سلاما" کی صدائیں آرہی ہوں گی۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خدماتِ جلیلہ اور اوصافِ جمیلہ کے تذکرے

تحریر و ترتیب: امۃ الحی آسیہ صاحبہ ـــ لاہور

- ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے انہیں جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا۔
- انہوں نے ہمیشہ قرآن کو مشعلِ راہ بنائے رکھا۔
- ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی میں دو دکھ ـــ پاکستان اور عالمِ اسلام کی سائنس سے بے توجگی
- سائنس کی کانفرنس کا آغاز ڈاکٹر صاحب نے بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم پڑھ کر کیا اور روسی سائنسدان کی حیرانی ـــ
- ڈاکٹر صاحب کے ارشاد پر دنیا بھر کے سائنسی رسائل مجھے ملنے لگے ـــ
- کسی یونیورسٹی، علاقہ یا سڑک کو "عبدالسلام" کے نام سے موسوم کیا جائے۔
- خداحافظ ـــ ! جائیے پاکستان کی خدمت کیجئے ـــ
- ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر "بزمِ ڈاکٹر عبدالسلام کراچی" کے زیرِ اہتمام ایک سیمپوزیم ـــ
- سابق چیف سیکرٹری سندھ جناب کنور ادریس صاحب، معروف صحافی خاتون زاہدہ حنا صاحبہ، آنسہ ممتاز زینب صاحبہ، پروفیسر میاں محمد افضل، ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی صاحب اور سائنس میگزین کے ایڈیٹر سید قاسم محمود صاحب کی تقاریر۔

یہ مضامین محترم عبدالمالک صاحب آف لاہور نے ہمیں ارسال کئے ان کے ہم مشکور ہیں اس طرح محترمہ عزیزہ امتہ الحی آسیہ صاحبہ کے بھی مشکور ہیں کہ جنہوں نے اس تقریب کی ویڈیو کیسٹ سے تمام تقاریر سن کران مضامین کو از سرنو اس نمبر کیلئے تحریر و ترتیب دیا۔

"بزم ڈاکٹر عبدالسلام" کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالسلام کی ۷۰ ویں سالگرہ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۹۶ء کو (کراچی) ہوٹل میں منائی گئی۔ تقریب کی صدارت پاکستانی حقوق انسانی کمیشن کے تاحیات چیئرمین (ریٹائرڈ) جسٹس دراب پٹیل نے فرمائی۔ مقررین میں سابق چیف سیکرٹری حکومت سندھ جناب کنور ادریس کے علاوہ، زاہدہ حنا، عرفان رضا ایڈووکیٹ، ماہ ناز زینب، سید قاسم محمود، ڈاکٹر عزیز الحسن اشرفی، ایس ڈبلیو احمد، پروفیسر میاں محمد افضل اور کریم بخش خالد شامل تھے۔

تقریب کا آغاز اللہ تبارک و تعالیٰ کے بابرکت کلام سے ہوا اس کے بعد سیکرٹری بزم ہذا جناب ممتاز حسین شاہ بخاری نے ڈاکٹر عبدالسلام کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے خصوصی طور پر روانہ کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے پیغام میں فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ میں ایک طبعی بیماری "پروگریسو سپرانیوکلیئر پالسی" میں مبتلا ہوں یہ ایک ایسی بیماری ہے جو رفتہ رفتہ جسم کی طبعی حرکات معکوسہ کو تباہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔ یہی وہ بیماری ہے جس نے مجھے میرے وطن کا سفر کرنے کے قصد سے دور رکھا ہوا ہے۔ مجھے میرے وطن کی یاد بہت ستاتی ہے اور بے حد دل چاہتا ہے کہ میں وطن لوٹوں اور اپنے پیاروں اور اپنے دوستوں اور اپنے عزیز و اقارب سے ملوں۔ یقین کیجئے کہ اس وقت بھی آپ کی یاد میرے دل و دماغ میں تازہ ہے میں آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ میں ممنون رہوں گا اگر مجھے تقریب کی ویڈیو مل جائے۔

پاکستان کو قابل و لائق دانشوروں کی ضرورت ہے۔ میں نے کوشش کی کہ لوگوں کو بتا سکوں کہ ایک پاکستانی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ آپ بھی ایک دانشمند و قابل شخصیت کے طور پر اپنی اہلیت و لیاقت کے سفر کو جاری رکھتے ہوئے آنے والی نسلوں کو مزید بلندیوں تک پہنچائیں۔ جب میں وطن عزیز سے آنے والے بعض والدین کے خطوط پڑھتا ہوں تو مجھے یہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنے بچوں کے لئے چند حوصلہ افزاء الفاظ لکھنے کی التجا کرتے ہیں۔ بزرگ اپنے خطوط میں اس بات کا

شکوہ کرتے ہیں کہ یہاں ایسی قابل فخر ہستیاں (Role Models) نہیں رہیں جنہیں وہ اپنے بچوں کی رہنمائی کیلئے نمونے کے طور پر پیش کر سکیں۔ یہ آپ سب پر فرض ہے کہ ارض پاک کے نونہالوں کو قابل فخرو سربلند ہستیوں سے متمتع کریں۔

ہم بحیثیت بزرگ نسل کے اپنے وطن کیلئے آئیڈیلز پیدا کرنے اور وطن عزیز کی مانگ میں کامیابیوں کی افشاں بھرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اپنے اختلافات' ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔ ایک بہتر پاکستان کی تعمیر کرنا ہوگی۔ ہم نے اپنا بہت وقت اور توانائیاں برباد کر دیں اور دوسروں کو یہ موقع دیا کہ وہ تعلیم و تربیت کی دوڑ میں ہم سے بہت آگے نکل جائیں۔ اب یہ غفلت بند ہونی چاہئے۔ کبھی مت بھولیئے کہ آپ دنیا کے لئے بہت کچھ تخلیق کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیئے کہ اعلیٰ تخلیق صرف اور صرف بے حد محنت انہماک اور مستقل مزاجی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارے پاس دوسروں کو متاثر کرنے اور خود آگے بڑھنے کا گرانقدر اثاثہ موجود ہے۔ ہمیں کبھی نہیں بھلانا چاہئے کہ ہمارے مسلمان علماء و دانشوروں نے صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کی ہے۔"

آنسہ مہناز زینب

ڈاکٹر عبدالسلام کے خصوصی پیغام کے بعد سب سے پہلی مقررہ آنسہ مہناز زینب صاحبہ نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کا عظیم ترین دماغ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی کامیابیاں نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ تیسری دنیا کے لئے سائنسی میدان میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔ انہوں نے طبیعات کے شعبہ کو جہاں ایک نیا رخ دیا وہاں انہوں نے اپنی شخصیت سے مسلم ثقافت کو تمام عالم میں روشناس کرایا یہی وجہ تھی کہ انہیں ۱۹۷۹ء میں طبیعات کے شعبے میں ان کی گرانقدر خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ ترین اعزاز نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا پاکستان کیلئے ایک خواب تھا کہ یہاں ایک انٹرنیشنل ریسرچ سنٹر قائم کیا جائے جہاں پر طبیعات کو فروغ دیا جائے مگران کا یہ خواب اس وقت کے مفاد پرست حکمرانوں کی ذاتی پسند اور ناپسند کی نذر ہو کر شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہ ادارہ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کے نام سے اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں قائم کیا اس کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب نے متعدد بار اپنی خدمات پاکستان میں سائنس کی ترقی و ترویج کے لئے پیش کیں مگر انہیں نظرانداز کیا جاتا رہا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے طبیعات کے شعبہ میں نئی جہتوں کو روشناس کروایا۔ باوجود اس کے پاکستان کو تیسری دنیا کا پسماندہ ملک شمار کیا جاتا ہے مگر اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ڈاکٹر عبدالسلام کی شکل میں ایک نوبل انعام یافتہ گوہر نایاب پیدا ہوا جس نے نہایت خلوص کے ساتھ سائنسی شعبے کی خدمت کی۔ ان کی انتھک کوشش اور بار بار کی نشاندہی کی بناء پر پاکستان میں پنسٹیک (Pinstech) اور اٹامک انرجی کمیشن جیسے دو اہم تحقیقاتی ادارے وجود میں آئے مگران کے پاکستان سے ہجرت کر جانے کے بعد مزید کوئی معتبر تحقیقاتی مرکز وجود میں نہ آ سکا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار بڑی تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور ایک بڑا طبقہ تعلیم کے زیور سے محروم ہے اگر ہم سنجیدگی سے اپنے تعلیمی معیار کو بہتر بنائیں اور سائنس کی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں اور جہتیں متعین کریں تو پاکستان میں ایسے زرخیز اور غیر معمولی اذہان کی کمی نہیں۔

انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک ایماندار انسان دوست شخصیت تھے جنہوں نے خود کو سائنس کی ترقی' معلومات کی فراہمی کیلئے وقف کر دیا۔ یہی وقت ہے کہ ان کی لازوال خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے سائنسی میدانوں

میں نئے جہانوں کی تلاش کیلئے ایسے مراکز قائم کریں جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے نہ صرف لائحہ عمل ترتیب دیں بلکہ ڈاکٹر عبدالسلام کے تحقیقی شعبوں میں کام کو مزید آگے بڑھائیں اور دنیا کو پاکستان کے نام سے روشناس کرائیں۔

پروفیسر میاں محمد افضل

"ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت کے چند پہلو" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ان اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس پر ان کا کوئی دیرینہ رفیق کار ہی لب کشائی کر سکتا ہے۔ عام طور سے انسانی شخصیت اتنی پہلودار ہے کہ کسی ایک جہت کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں ہوتا اور خاص کر ڈاکٹر عبدالسلام جیسے شخص کی قدر اور شخصیت۔ پروفیسر میاں محمد افضل نے ڈاکٹر صاحب کی طالبعلمی کے زمانے کے کارنامے اور اس وقت ان کی شخصیت کے بعض بہت اہم گوشوں سے سامعین کو روشناس کروایا اور اس بات کا بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ان کے مادر وطن کے علمی گہوارے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ کر سکے اور پاکستان میں ان کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا گیا۔ وہ پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اپنے علم سے اسی ملک کے نونہالوں کو سیراب کرنا چاہتے تھے مگر جس کالج میں وہ لیکچرار مقرر ہوئے وہیں کے پرنسپل نے حکومت وقت کو یہ لکھا کہ یہ شخص کالج کے تعلیمی ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا لہٰذا اس کا تبادلہ کہیں اور کیا جائے۔ دوران ملازمت انہیں تدریسی سرگرمیوں سے دور رکھ کر اور ان کے ریسرچ کرنے کے جذبے کا گلا گھونٹ کر انہیں کالج کے فٹ بال کلب کا انچارج بنانے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان سے ڈاکٹر عبدالسلام کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر میاں محمد افضل نے ایک واقعہ سنایا کہ انہیں بزرگوں نے مشورہ دیا کہ آپ کی ساری عمر تو یورپ میں گذر گئی لہٰذا اٹلی یا انگلستان کی شہریت لے لیجئے بے شک پاکستانی شہریت بھی برقرار رکھیئے۔ مگر ڈاکٹر عبدالسلام نے ایسا کرنے سے قطعی انکار کر دیا ان کی سوچ یہ تھی کہ اگر انہیں نوبل پرائز مل گیا تو وہ اسے بطور ایک پاکستانی کے حاصل کر کے یہ طرہ امتیاز پاکستان کے سر باندھنا چاہیں گے وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو یہ فخر حاصل ہونا چاہئے کہ دنیا کا سب سے بڑا اعزاز پاکستان کے حصے میں آیا اور انہیں ۱۹۷۹ء میں جب یہ اعزاز ملا تو وہ اسے لینے کیلئے مکمل پاکستانی لباس پہن کر پہنچے اور پاکستان کو مزید عزت اس وقت ملی جب ڈاکٹر عبدالسلام کو ایڈریس اردو میں پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر میں قرآنی آیات کا حوالہ دیا اس طرح پاکستان کے ساتھ اسلام کا جھنڈا بھی بلند کیا۔ یہ اعزاز اپنے ساتھ ایک خطیر رقم بھی لایا۔ روپیہ ملنے پر انسان کے لاکھوں منصوبے ہوتے ہیں۔ کوئی گھر خریدتا ہے، کوئی جائیداد بناتا ہے، بیوی اور بچوں کیلئے خوشیوں کے سامان خریدتا ہے مگر ڈاکٹر عبدالسلام کے ذہن میں صرف ایک خیال، فقط ایک مقصد تھا کہ یہ رقم پاکستان کے سائنسدانوں پر اور پاکستان میں سائنسی ترقی پر صرف ہوگی سو آپ نے تقریباً ساری رقم سائنس کے لئے لنڈھا دی اور وقف کر دی، پاکستانی سائنس دانوں کے لئے۔ اس وقت میں بھی آپ اپنے اولین مادر علمی یعنی چھوٹے سے جھنگ کالج کو نہیں بھولے اور اس کی سائنسی لیبارٹری کی بھی معقول مالی معاونت کی۔ ایسی مثال تاریخ عالم مشکل ہی سے پیش کر سکے گی کہ کسی شخص کو بھاری رقم حاصل ہوئی ہو اور اس انعام یافتہ نے وہ رقم نہ خود اپنے اوپر خرچ کی ہو اور نہ ہی بیوی بچوں پر بلکہ وہ ایک ہی جذبے سے سرشار ہو کہ آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ مالی طور پر بھی اپنے وطن عزیز کی خدمت کر سکوں اور پھر وہ شخص اپنا سب کچھ اپنے ملک کو پیش کر دے۔ کتنا عظیم جذبہ حب الوطنی ہے اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی انگلی اٹھائے تو وہ انگلی اس قابل ہے کہ اسے کاٹ دیا جائے۔

انہوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر عبدالسلام جو ۱۹۴۷ء سے سمندر پار کی بڑی یونیورسٹیوں میں کام کر رہے تھے انہیں اپنے ملک یعنی پاکستان میں پہچانا ہی نہیں گیا۔ پذیرائی کا ملنا تو دور کی بات ہے:۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے

خوش قسمتی سے ۱۹۵۷ء میں میاں افتخار الدین انگلستان پہنچے تو یہ معلوم کر کے دنگ رہ گئے کہ وہ ایک پاکستانی سائنسدان ہی تھا جس نے سائنس کی دنیا میں پورے یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور ابھی تک پاکستان اس سے بے خبر تھا۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے اس ابھرتی ہوئی سائنسی شخصیت کو پاکستان میں متعارف کراویا مگر پھر بھی سرکاری حلقوں میں کوئی ہل چل نہ ہو سکی۔ مزید چار سال گذر گئے کہ ۱۹۶۱ء میں صدر پاکستان کی نگاہ التفات اس طرف اٹھی اور ڈاکٹر صاحب کو صدر پاکستان کا چیف سائنٹفک ایڈوائزر بنا دیا گیا اور پھر اس محب وطن سائنسدان کی ساری سوچیں پاکستان کی سائنسی ترقی کے گرد گھومنے لگیں۔ اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ پاکستان کی سائنسی ترقی کے لئے کوئی عملی قدم اٹھا سکیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی مساعی کے نتیجے میں ایک کے بعد دوسرا ادارہ وجود میں آیا اٹامک انرجی کمیشن میں چستی آئی (Pinstech) قائم ہوا Pinstech Sparco وجود میں آیا۔ ایٹم کی بات ہوئی' نیوکلیر انرجی کی بات ہوئی۔ فضائی تسخیر کی بھی ابتداء ہوئی مگر سائنسدانوں کو بھی پوچھا جائے ان کے لئے بھی تو کچھ کرنا چاہئے سو پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ سب ادارے پاکستان میں سائنسی ترقی کے ضامن مگر ڈاکٹر عبدالسلام نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے لئے بھی سوچتے ہیں۔ انہیں اسلامی ممالک کی بہتری اور ترقی بھی مقصود ہے اپنی اس سوچ کو عملی شکل دیتے ہوئے انہوں نے اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی ایک تجویز پیش کی اور اسلامی ممالک سے ان کی ایکسپورٹ کی آمدنی کا صرف ایک فیصد اس کے فنڈ کیلئے تجویز کیا اس طرح چار سالوں میں ایک بلین ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہو سکتا تھا مگر مسلمان کہاں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر ان کی تعیشات کہاں اجازت دیتے ہیں کہ ایک فیصد ہی سہی ان فضول قسم کی لیبارٹریوں پر لگایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب عالم اسلام کی اس بے حسی پر تڑپتے رہے' آواز اٹھاتے رہے مگر ان کی آوازیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ مگر ان کی یہ تجویز ان کے اس جذبے کی آئینہ دار ہے جو وہ ترقی پذیر اسلامی ممالک کی بہتری اور خوشحالی کے لئے رکھتے ہیں۔ ان کا دل ایک حساس دل ہے وہ نہ صرف تیسری دنیا کے سارے ممالک کی غربت و افلاس تنگدستی اور بیماری پر کڑھتے رہے بلکہ اپنے لیکچروں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہے اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز بھی سوچتے اور پیش کرتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نہ صرف ایک سائنسدان ہیں بلکہ ایک بہت اچھے اکانومسٹ اور ایک اعلیٰ پایہ کے فلسفہ دان بھی' ان کی سوچ ان کی قابل عمل تجاویز ایک انقلاب پیدا کر سکتی ہیں اگر حاکم ویسا ہی دردمند دل رکھیں۔

ہندوستان میں تو ان پر جگجیت سنگھ نے کتاب لکھ دی مگر ہمارے ہاں ان پر بہت ہی کم لکھا گیا۔ پاکستان نے جو سرد مہری برتی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ایک وزیر اعظم نے تو ان سے ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ ایک نے گورنمنٹ کالج میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ گویا اس ادارے سے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ پاکستان میں' پاکستان کی ترقی کیلئے کوشاں رہا۔ اس عظیم سائنسدان کی یہ صفت بھی بے مثال ہے کہ وہ تیسری دنیا کے ملک پاکستان کی پیداوار ہونے پر اتراتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں' نازاں ہیں' کتنا محب وطن ہے یہ عظیم سائنسدان' کتنا بڑا پاکستانی۔

مایہ ناز دانشور اور صحافی محترمہ زاہدہ حنا

آپ نے مختصر اور جامع مقالہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے

حوالے سے پیش کیا۔ آپ کہتی ہیں۔

کیا ہم آج اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا کا ایک ذی وقار شہری اور مایہ ناز سائنسدان ستر برس کا ہو گیا۔ کیا ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ اس انسان کو اس کے سائنسی کارناموں پر داد دیں، اس کے علم و فضل کے باب میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائیں اور واپس چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہاں اس لئے آئے ہوں لیکن معافی کی طلب گار ہوں کہ میں یہاں اس لئے نہیں آئی۔ وہ شخص جو مغرب و مشرق کی دو درجن سے زیادہ یونیورسٹیوں کا اعزازی ڈگری یافتہ ہے، جسے دو درجن سے زیادہ اعلیٰ ترین بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جو دو درجن سے زیادہ اہم ترین سائنسی اور تحقیقی کام کرنے والی سوسائٹیوں کی فیلو شپ اور ممبر شپ رکھتا ہے، اسے آپ کی اور میری تعریف و توصیف کی ذرہ برابر بھی ضرورت نہیں۔

میں یہاں حاضر ہوئی ہوں تو اس لئے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر خود اپنی اور اپنی قوم کی بدبختی پر گریہ کروں۔ اس بات کو کہوں کہ ہم نے نوبل انعام یافتہ عبدالسلام کے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جو سینکڑوں برس سے ہم اپنے علماء اور فضلاء کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ ہم تاریخ کے اتنے بڑے جھوٹے ہیں کہ کل اپنے جن خرد افروز اور علم دوست مفکروں، دانشوروں اور فلسفیوں پر ہم نے کفر و الحاد کے فتویٰ لگائے تھے۔ جن پر زیست حرام کر دی تھی۔ آج ہم ان ہی کے ناموں کے آگے رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں اور ان کے نام سے پہلے "امام" نہ لکھنے کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

ہم بھول چکے ہیں کہ ابن حزم کا مدرسہ اور کتب خانہ ہم نے جلایا تھا اور اسے قید و بند کی صعوبتوں سے ہم نے گزارا تھا۔ آج وہ ہمارے لئے امام ابن حزمؒ ہے۔

ہم کسی کو نہیں بتاتے کہ ہم نے ابن تیمیہ کی کتابیں جلائیں، اسے قید کیا اور جب اس پر بھی ہمارا جی خوش نہ ہوا تو قید کے دوران اس سے تصنیف و تالیف کی آزادی سلب کر لی۔ اس کی کتابیں اور مسودے ضبط کر لئے۔ آج ہم اسے "امام" لکھتے نہیں تھکتے اور تاریخ کا یہ سچ چھپاتے ہیں کہ کاغذ اور قلم سے محروم ہونے والے ابن تیمیہ نے اپنے قید خانے کی دیواروں پر اپنے ناخنوں سے کھرچ کر کیا جملہ لکھا تھا۔

مسلم دنیا کا آخری نابغہ روز گار ابن رشد، جو اپنے خیالات و افکار کے سبب ذلیل و رسوا ہوا، جسے مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر نمازیوں کے جوتے صاف کرنے کی سزا دی گئی، جسے جلاوطن کیا گیا، جس کی کتابیں قرطبہ کے چوک پر جلائی گئیں۔ آج اسی ابن رشد کے حوالے سے ہم یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ راجر بیکن نے ۱۲۳۰ء میں ابن رشد کی کتابوں کے لاطینی ترجمے کو یورپ کی علمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا تھا۔ عالم اسلام میں علم پروری اور عقل دوستی کا زوال ابن الہیثم اور البیرونی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور یہ عمل بارہویں صدی کے آخری برسوں میں ابن رشد کی ذلت آمیز جلاوطنی کے ساتھ مکمل ہوا۔ اس عظیم سانحے کو ہزار برس گزر چکے لیکن پستیوں میں مسلسل اترتے رہنے، یورپی استعمار کی نو آبادیات بن جانے اور نام نہاد سیاسی آزادی کے بعد مغرب کی اقتصادی غلامی میں آنے کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کے باب میں، ایک روشن خیال اور وسیع المشرب سماج کی تعمیر کے سلسلے میں ہمارے رویے آج بھی دسویں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی سے آگے نہیں بڑھے۔

ابن رشد کو ہسپانیہ کے یہودیوں نے سینے سے لگایا اور اس کے خیالات و افکار یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کا نقطہ آغاز بنے اور آج ہم آٹھ سو برس بعد بھی اتنے ہی بدبخت ہیں کہ ہم نے اپنے ایک نابغہ روز گار کے لئے اس کے اپنے ملک میں اس پر عرصہ حیات تنگ کر

دیا۔ دیار غیر میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے ڈاکٹر عبدالسلام سے مغرب و مشرق کی ذہانتیں استفادہ کرتی ہیں۔ یہ شخص طبیعات کا نوبل انعام لینے جاتا ہے تو سویڈن کے بادشاہ اور ملکہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ شاہی خاندان کے سامنے اس کی آمد کا اعلان بگل بجا کر کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے ہزار ہا سائنسدان، دانشور اور طالب علم سرو قد کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن یہی نوبل انعام یافتہ سائنسدان جب اپنے ملک کا رخ کرتا ہے تو برسراقتدار خواتین و حضرات اسے ملاقات کا وقت نہیں دیتے۔ معمولی سرکاری اہل کار سائنس کی ترقی کے لئے اس کی بیش قیمت تجاویز اور پیشکشوں کے معاملات کو سرد خانے میں ڈال دیتے ہیں اور اسی شہر کا ایک تعلیمی ادارہ اسے اپنے یہاں مدعو کرتا ہے تو مذہبی جنونیوں کا ایک ٹولہ اس کی آمد کو کفر و اسلام کی جنگ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

آج ہم تباہی و بربادی کی جس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہماری علم دشمنی، جہل دوستی اور اپنے عالم و فاضلوں کی توہین و تذلیل ہے۔ ہم اپنی دہانتوں کو دیس نکالا دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں تفکر اور تدبر کے سوتوں پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ ہم اپنی دانش گاہوں میں ذہانتوں کو پنپنے نہیں دیتے اور انہیں کبھی ملحد، کبھی کافر اور کبھی بے راہ رو قرار دے کر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ دیار غیر کا رخ کریں اور ان کی ذہانتیں یورپ و امریکہ میں گل و گلزار کھلائیں۔

ہم جس تیزی سے زوال اور ذلت آمیز غلامی کی طرف جا رہے ہیں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما اور ہمارے دانشور منافقت میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی قوم کی رہنمائی اس کے سیاستدان، مدبر، مفکر اور دانشور کرتے ہیں اور جب یہی طبقہ مصلحت و منافقت کا شکار ہو جائے تو قوم کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا ہے۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اٹھ کر باآواز بلند یہ کہہ سکیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کا وعدہ جناح صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں سے کیا تھا۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بانی پاکستان نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ

"پاکستان ایک مذہبی ریاست نہیں ہوگا اور یہ کہ اس نئے وطن میں مذہب، نسل، رنگ اور زبان کو تفریق کا سبب نہیں ٹھہرایا جائے گا اور پاکستان کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔"

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام ہر مرتبہ تنگ نظر مذہبی راہنماؤں کو مسترد کر دیتے ہیں اور جمہوریت پسندی اور روشن خیالی کے دعویدار سیاستدانوں کو حق حکمرانی سونپتے ہیں لیکن ایسی ہر جماعت اقتدار میں آنے کے بعد منافقت اور سیاسی مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے سول اور فوجی نوکر شاہی اور جاگیردار اشرافیہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ لبرل، عوام کی نمائندہ اور بانی پاکستان کے سیاسی افکار کی پیروکار ہونے کی دعویدار جماعتیں Establishment سے جس قدر خوف زدہ رہتی ہیں اس کی بہترین مثال پاکستان کا آئین ہے ان جماعتوں نے Establishment کے دباؤ میں آکر آئین میں ایسی تبدیلیاں کیں یا ایسی ترامیم کو تحفظ فراہم کیا جس نے پاکستانی آئین کو بانی پاکستان کی سیاسی فکر سے یکسر متصادم آئین بنا کر رکھ دیا۔

آج اگر ڈاکٹر عبدالسلام اس محفل میں موجود نہیں اور وطن سے دور شدید ذہنی اذیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر وہ وطن میں اپنی بے وقعتی اور ناقدری پر غمزدہ ہیں اور اگر آج وہ اس ملک کے دوسرے درجے کے شہری ہیں تو اس کے ذمہ دار نہ پاکستانی عوام ہیں اور نہ بانی پاکستان۔ اس تمام صورت حال کی ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو خود کو قائد اعظم کا وارث کہتی ہیں لیکن عملاً ان کے افکار کی نفی کرتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری ان ترقی پسند اور روشن خیال تنظیموں پر عائد ہوتی ہے جو پاکستان کے رواداراور کشادہ دل عوام کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں اور سب سے بڑھ کر اس

الم ناک صورت حال کے ذمہ دار ہیں ایسے تمام دانشور جو اپنی جماعتی وابستگی یا کسی خوف یا کسی مصلحت کے سبب سچ بولنے اور سچے موقف پر اصرار کرنے سے دامن بچاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام اس صدی میں طبیعات کے شعبے کی عظیم ذہانتوں میں سے ایک ہیں۔ جس دھرتی سے ان کا خمیر اٹھا اسے ان پر ناز کرنا چاہئے تھا لیکن یہ ان کی نہیں ہماری سیہ بختی ہے کہ ہم نے انہیں جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے منافق رہنماؤں کی عمر اور صحت انہیں لگے۔ مغرب سے متعدد معاملات پر شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہمارے جلاوطنوں کو پناہ وہیں ملتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر مغرب کے شہر ہمارے اس نابغہ روزگار کو پناہ نہ دیتے تو آج وہ بھی ابن تیمیہ کی طرح کسی قید خانے میں ہوتا' اسے بھی کاغذ اور قلم کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہوتا اور اپنے ناخنوں سے کوٹھڑی کی دیوار پر یہ جملہ کھرچ رہا ہوتا کہ "اگر مجھے کوئی حقیقی سزا دی گئی ہے تو وہ یہی سزا ہے۔"

سابق چیف سیکرٹری سندھ و ممتاز دانشور

جناب کنور ادریس

پروفیسر عبدالسلام حقیقتاً ایک سچے پاکستانی تھے جس کا اظہار انہوں نے اسٹاک ہوم میں ۱۹۷۹ء میں ہونے والی نوبل پرائز کی تقریب سے اردو میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ جو کہ ان کا اس دھرتی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

انہوں نے ہمیشہ قرآن کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے رکھا یہی وجہ تھی کہ پہلی دفعہ سویڈن کا وہ رائل ہال قرآنی آیات سے گونج اٹھا۔ کنور ادریس نے کہا کہ آج کی محفل دراصل اس عظیم سائنسدان کو جو کہ انسانوں سے پیار کرتا ہے' محب وطن ہے' بے داغ کردار کا حامل ہے کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ اس آدمی کے لئے جس نے سائنس کی ثقافت اور مذہب کے درمیان حائل وسیع خلیج کو پر کیا۔ وہ شخص جس نے سائنس کا سب سے اعلیٰ اعزاز حاصل کیا لیکن اپنی مٹی اور اپنے وطن کو نہیں بھولا۔ ان کو ملنے والا نوبل انعام ایک ایسا اعزاز ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو اعزاز کے ساتھ جو انعامی رقم ملی اس کے لئے انہوں نے کہا یہ خدا کا ایک تحفہ ہے اور اسی کی راہ میں خرچ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کا کچھ حصہ فلاح و بہبود کے شعبے میں چلا گیا اور زیادہ تر تعلیم کے شعبے میں۔ اس موقع پر کنور ادریس صاحب نے حکومت کے سامنے کچھ سفارشات پیش کیں جن میں اسلام آباد میں قائم ہونے والے متوقع فزکس سنٹر کا نام ڈاکٹر عبدالسلام سے موسوم کرنا۔ لاہور کی کسی سڑک یا اسلام آباد کے کسی علاقے کو ڈاکٹر عبدالسلام کا نام دینا ایک ایسے فنڈ کا قیام عمل میں لانا جو کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے نام سے موسوم ہو اور جس کا کام صرف اور صرف سائنس کی ترویج ہو۔

ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی

نے اپنا مقالہ **"ایک سچا پاکستانی"** کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبدالسلام صاحب سائنسی علوم کا وہ روشن مینار ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کا نام روشن ہوا اور پاکستانی قوم کو ان پر بجا طور پر فخر ہے۔ میں نہ تو نظریاتی طبیعات کے بارے میں کچھ جانتا ہوں نہ ڈاکٹر عبدالسلام سے کوئی ذاتی تعلق رہا' ایسے شخص کی نہ میں تعریف کر سکتا ہوں نہ تنقید کرنے کا اہل ہوں' ہاں ان سے ایک رشتہ ضرور ہے اور وہ ہے پاکستانی ہونے کا وہ بھی سچے اور کھرے پاکستانی ہیں اور میں بھی۔ اور یہ رشتہ ہر پاکستانی کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہے اس رشتے کو

ہم کتنی اہمیت دیتے ہیں اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم خود کو کس قدر پاکستانی سمجھتے ہیں اور ہمیں پاکستان سے کتنی محبت ہے۔

انہوں نے کہا کہ آج کل بے شمار لوگ ملک سے باہر جانے' اپنی قومیت چھوڑ کر امریکہ' آسٹریلیا' برطانیہ یا کسی اور ملک کی قومیت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں اور جو اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں بڑے فخر سے اس پر ناز کرتے ہیں۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ ان کو پاکستان یا پاکستانی قومیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو سبز پاسپورٹ رکھنے میں ذلت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے دور میں ڈاکٹر عبدالسلام کی ذات گرامی لائق صد احترام نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنا سبز پاسپورٹ تبدیل نہیں کیا حالانکہ علمی دنیا میں ان کا وہ مقام ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک ان کو اپنا پاسپورٹ دینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

سائنس میگزین کے ایڈیٹر
جناب قاسم محمود صاحب

ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی کے مقالے کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام کے ایک دیرینہ رفیق کار ساتھی اور سائنس میگزین کے ایڈیٹر نے چند یادیں چند باتیں کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کے واقعات پر مشتمل ایک طویل مقالہ پڑھتے ہوئے کہا۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی ویسٹ نے میرے نام کا "سائنس میگزین" کا ڈیکلریشن کیا جاری کیا' میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس ملک میں انقلاب لے آنے کی جو نوید عرصہ دراز سے کانوں میں پڑ رہی ہے' وہ یہی رسالہ برپا کرے گا۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

رومان خیز خواب اور سوکھے ہوئے پھول نہیں' اصل چیز ہے سائنس۔ ہمارے معاشرے کی اولین ضرورت سائنس۔ چنانچہ تلاش بسیار کے بعد ملک کے پچاس بڑے سائنس دانوں کی ایک فہرست بنائی گئی اور انہیں طلبی مضمون کا خط لکھ بھیجا۔ پانچ بڑے عالمی شہرت یافتہ سائنس دانوں سے مضامین کے علاوہ اہل پاکستان کے لئے ان کا پیغام خاص بھی طلب کیا۔ آرتھر کلارک' آئزک اسمو' پروفیسر کارل ساگاں' جاپان کے ڈاکٹر کوڈانشا اور ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن۔

سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالسلام کا مضمون' پیغام اور ایک ٹائپ شدہ خط موصول ہوا جو ٹریسٹ اٹلی سے آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے آخر میں اردو میں سرخ روشنائی سے دستخط کرتے وقت اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا۔ "میں آپ کا دیرینہ مداح ہوں"۔

یہ ایک جملہ ہمیشہ کیلئے میری روح میں اتر کر' جینے کی خواہش کو دو آتشہ کر گیا۔ لفظ "شاباش" یا کوئی اور حوصلہ افزا کلمہ آدمیوں کی روحانی زندگی میں غذا کی نہیں' تو سلاد کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔

کیا یہ اس پرانے دفتری تعلق کی طرف اشارہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے دوران ملازمت پیدا ہو کر وہیں کا وہیں منقطع بھی ہو گیا تھا؟ یا کیا یہ میری ان تحریروں کی طرف اشارہ تھا جو شوق فضول میں مجھ سے سرزد ہو گئی تھیں؟ مگر ان کا دائرہ تو صرف پاکستان تک محیط تھا۔ یہ لندن میں رہنے والا سائنس داں میرے کام سے کیسے واقف ہوا ہو گا؟ یقیناً یہ یونیورسٹی ہی کی ابتدائے جوانی کی یادوں کا زور ہے.....

ڈاکٹر صاحب کا پیغام محبت کے ساتھ "سائنس میگزین" کے شمارہ اول کے صفحہ اول پر شائع ہوا۔ دوسرے شمارے کا سرورق ان کی رنگین تصویر سے مزین تھا۔ شاہد محمود ندیم نے لندن میں ان سے انٹرویو کیا تھا۔ وہ بھی کور اسٹوری کے ساتھ چھپا۔ اس کا ایک جملہ مجھے

کبھی نہیں بھولتا۔ جس میں انہوں نے کہا:۔

"میری زندگی میں فقط دو دکھ ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان میں سائنس دانوں کی اتنی توقیر نہیں جتنی ہونی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ عالم اسلام میں سائنس کی اتنی قدر نہیں، جتنی ہونی چاہئے۔"

"سائنس میگزین" طلبہ میں خاصی تیزی سے مقبول ہو گیا۔ میں نے تو اسے واقفیت عامہ کی نوعیت کا ایک عام سا معلوماتی جریدہ بنانا چاہا تھا لیکن ڈاکٹر عبدالسلام کے اثر سے، نادانستہ طور پر یہ اچھا خاصا سائنسی رسالہ اردو کے ہاتھ آگیا۔ اب میری ڈاک میں دنیا بھر سے سائنسی لٹریچر آنے لگا۔ نیو سائنٹسٹ ویکلی، نیچر، سائنٹیفک امریکن جیسے بلند پایہ جرائد، استنبول، قاہرہ اور اردن وغیرہ کے اشاعتی اداروں سے کتب و جرائد موصول ہونے لگے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی فرمائش پر آپ کو بھیجے جا رہے ہیں۔ کوئی چینی میں، کوئی جاپانی میں، کوئی عربی میں، کوئی ترکی میں۔

زبان یار من ترکی، و من ترکی نمے دانم

گویا ایک بہت ہی غیر سائنسی، بے عقلے کے کاندھوں پر سائنسی ادب کا بار لاد دیا گیا تھا۔ میں ادب تو پڑھتا رہتا تھا لیکن اب آنکھوں کو اور ذہن کو سائنس کے لئے تیار کرنا تھا۔ جو شخص دور بیٹھا میری خاطر، سائنس کی خاطر، اردو کی خاطر، پاکستان کی خاطر احسانات کئے جا رہا ہے، میرا بھی فرض ہے کہ حسب توفیق ان کا حق ادا کیا جائے۔ میں نے ڈکشنریوں، انسائیکلوپیڈیا اور گائیڈ بکس اور Self Teaching Mehtods کے ذریعے آمدہ کتب و رسائل کا لفظاً لفظاً مطالعہ کیا، اور طبیعیات، کیمیا، فلکیات، جینی انجینئرنگ، حیاتیات وغیرہ یعنی ایک ریاضی کو چھوڑ کر، باقی جدید سائنسی علوم کے جدید تر نظریات سے دوستی کر لی۔ ڈاکٹر صاحب میرے مثالی قاری تھے۔ میں دراصل انہی سے پڑھوانے کے لئے یہ پرچہ ایڈٹ کرتا تھا۔ وہ اکثر رسالہ پڑھ کر اپنی رائے، مشورے اور غلطیوں کی نشاندہی سے نوازتے رہتے تھے۔

چند ماہ کے بعد مجھے اٹلی سے ایک تار موصول ہوا کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بنگلہ دیش جاتے ہوئے راستے میں پاکستان کے فلاں ائرلائن کی فلاں پرواز سے گزریں گے آپ ان سے ملاقات کرنا چاہیں تو کر لیں۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ ان سے کس موضوع پر گفتگو ہونی چاہئے۔ محض ملنا تو دوسرے کا وقت ضائع کرنا ہے۔ کوئی ایسی گفتگو ہونی چاہئے جس کا فائدہ "سائنس میگزین" کے قارئین کو بھی پہنچے۔ اس زمانے میں انگریزی و اردو اخبارات میں ڈاکٹر عبدالسلام اور میجر آفتاب حسن کے درمیان اس دیرینہ مسئلے پر تازہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اردو میں سائنسی اصطلاحات کا استعمال ہو تو کیونکر ہو۔ میرے رسالہ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ میں آدھا ڈاکٹر صاحب کا طرف دار تھا، آدھا میجر آفتاب کا۔ نتیجہ یہ کہ آدھی ڈانٹ ڈاکٹر صاحب سے کھائی، آدھی میجر صاحب سے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری عمر لندن میں گزری، کہتے تھے کہ تمام اصطلاحات کو جوں کا توں اردو رسم الخط میں لکھ لینا چاہئے۔ میجر صاحب جامعہ عثمانیہ کے پروردہ، کہتے تھے عربی اور فارسی اردو کی مادر زبانیں ہیں، ان سے استمداد لازمی ہے۔ میں دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ کہتا تھا کہ کچھ بین الاقوامی اصطلاحیں تو جوں کی توں اردو میں لکھی جا سکتی ہیں، تمام اصطلاحات نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی رائے انہی سے باطل قرار دلوانے کے لئے سندھ ٹیکسٹ بورڈ کی شائع کردہ "جنرل سائنس" برائے جماعت نہم کی نصابی کتاب بغل میں داب لی۔

ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم میں، میں پہلا شخص تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہشاش بشاش اور تازہ دم لگ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر بہت خوش ہوئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی انہوں نے جیبی قرآن مجید نکالا۔ کچھ پڑھا۔ یا تو متجسس ذہن میں کوئی نیا سوال پیدا ہوا ہو گا جس کی توثیق یا تردید کے لئے قرآن کریم کی مدد لی ہو گی یا سفر خیریت سے طے ہو جانے کی دعا پڑھی ہو گی۔ اس کے بعد میرا حال چال پوچھا۔ میں نے انگریزی

میں بولنا شروع کیا۔ کہا "نہیں سید صاحب پنجابی یا اردو۔ انگریزی بول بول کر جبڑے تھک جاتے ہیں"۔

نومبر ۱۹۹۲ء کے آخری ہفتے میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام کویت میں چوتھی جنرل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پانچوں براعظموں کے ۷۸ ملکوں سے تین سو سے زائد سائنس دانوں نے شرکت کی تھی اور مجھے بھی "فرض پر محبت کی ترجیح" کی بنیاد پر بلاوا آگیا تھا۔ ویسے یہ بات میری ذات تک محدود نہ تھی۔ کانفرنس کے عام شرکاء آپس میں طنزاً کہا کرتے تھے کہ عبدالسلام نے اپنے وطن پاکستان کے سب سے زیادہ نمائندے بلائے ہیں۔ میریڈین ہوٹل کے کشادہ ہال میں سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے چہرے بھی تھے، گیمبیا اور تنزانیہ کے سیام فام بھی، امریکہ برطانیہ کے لمبے تڑنگے گورے بھی، چین جاپان کے پیلے زرد بھی، ہندوستان پاکستان کے سانولے بھی، دنیا میں انسان کی جتنی بھی نسلیں اور جتنے بھی رنگ ہوسکتے ہیں ان سب کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دنیا میں جتنے بھی مذہب اور عقیدے رائج ہیں، ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگ اس ایک چھت تلے جمع تھے۔ کرہ ارض پر موجود انسان جتنی بھی زبانیں بولتا ہے، ہر زبان کے بولنے والے یہاں دور دور سے آکر حاضر و شریک تھے۔ ہزارہا سال کی تحقیق و کاوش کے بعد انسان نے جتنے بھی سائنسی علوم ایجاد کئے ہیں، ہر شعبہ علم کے ماہرین خصوصی یہاں موجود تھے...... اور یہ بین الاقوامی انسانیت کا اجتماع ایک اور صرف ایک شخص ڈاکٹر عبدالسلام کا مرہون منت تھا۔

حسب پروگرام ٹھیک آٹھ بج کر تیس منٹ پر عقبی دروازہ کھلا اور دو مددگار ایک وھیل چیئر کو سہارا دیتے ہوئے آہستہ آہستہ ہال میں داخل ہوئے۔ تمام حاضرین خیر مقدمی تالیاں بجاتے ہوئے احتراماً کھڑے ہوگئے۔ یہ اظہار عقیدت پاکستان کے اس جلیل القدر سائنس دان کے لئے تھا جس نے پرائمری جماعت سے لے کر آج تک چودہ تا سولہ گھنٹے روزانہ لگن اور محنت سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔

ڈاکٹر سلام کی بیمار بردار کرسی آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی جب مرکزی میز کے کنارے پر آن لگی تو انہوں نے عقیدت کا جواب کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا کیونکہ ہاتھ ہلا نہیں سکتے تھے اور گردن کی خفیف سی حرکت سے حاضرین سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ہال میں گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل نے افتتاحی اجلاس کا ایجنڈا اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کے قریب کردیا۔ انہوں نے ایجنڈے پر نظر دوڑائی۔ ہال میں تمام مائکروفون گونج اٹھے۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔

میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے روسی نمائندے نے پوچھا "سلام نے کیا کہا ہے"۔ میں نے کہا "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے"۔ اس نے پوچھا "یہ اللہ کیا چیز ہے؟"۔ میں "WITH CAPITAL....GOD"۔ بولا "حیرت ہے۔ اتنا بڑا آدمی بھی مائی تھولوجی پر BELIEVE کرتا ہے"۔

ایک عجب منظر میری آنکھوں کے سامنے کھلا تھا۔ اگر کوئی مسلمانوں کے سامنے پڑھے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تو کافر اور اگر وہی شخص کافروں کے سامنے پڑھے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تب بھی کافر۔ شاعر نے ایسے ہی سنگ دل موقع کے لئے کہا تھا

"دست تہ سنگ آمدہ' پیمان وفا ہے"۔

جنرل کانفرنس کی آخری شام پاکستان کے سفارت خانے میں پاکستان سے آئے ہوئے پاکستانیوں کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی۔ سفیر محترم کرامت علی غوری نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر عبدالسلام اور دوسرے مشاہیر کا تعارف کرایا' ڈاکٹر پروفیسر عطاء الرحمن' پروفیسر سید ارتفاق علی' پروفیسر اے کیو انصاری' ڈاکٹر امیر محمد خان' ڈاکٹر سعید اے درانی' پروفیسر وقار الدین احمد' ڈاکٹر ظفر ایچ زیدی وغیرہ۔ پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے جوشیلے انداز میں کہا "چند ماہ پہلے جب یہاں عمران خان اپنے ہسپتال کے لئے چندہ لینے آیا تھا تو یہاں چندہ دینے

والوں کی قطار لگ گئی تھی اور ایک گھنٹے کے اندر اندر تقریباً آٹھ لاکھ روپے جمع ہوگئے اور یہ تو ہمارے پاکستان کے لوگوں کی تعلیم اور سائنس کا معاملہ ہے اور یہ اس سے بھی بڑا نیک مقصد ہے۔ امید ہے کہ آپ لوگ بڑھ چڑھ کر چندہ دیں گے"۔

سفیر محترم کی تقریر کے بعد میری باری آئی۔ جب سے میں کویت آیا تھا' ڈاکٹر صاحب سے یہ میرا پہلا آمنا سامنا تھا۔ وہ میرے دائیں پہلو میں اپنی وھیل چیئر میں براجمان تھے اور زندہ دلان پاکستان کی محفل میں بیٹھ کر لندن اور ٹریسٹ اور میریڈین ہوٹل والے جناب ڈاکٹر عبدالسلام نہیں رہے تھے بلکہ ان کے اندر سے جھنگ والا دیہاتی نکل کر اپنے یاروں پیاروں میں شریک ہوگیا تھا۔ جب میں کراچی سے چلا تھا تو میں نے چلتے وقت ہمشیرہ صاحبہ کو فون کیا تھا کہ میں کویت جا رہا ہوں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو کچھ بھیجنا ہو تو' کوئی چیز یا کوئی پیغام وغیرہ ہو تو بتا دیں لیتا جاؤں گا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے کہا ہاں ایک کام ہے تو سہی لیکن آپ کر نہیں پائیں گے۔ میں نے کہا ضرور کروں گا۔ فرمایا "بھائی صاحب اگر اس ہجوم عاشقاں میں آپ کو کہیں میرا بھائی' سمجھے نا آپ نے کہا میرا بھائی نظر آجائے تو اس کو اس بہن کا سلام پہنچا دینا"۔

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز بہن کے اسی جملے سے کیا۔ اچانک مجھے ڈاکٹر صاحب کی سسکی لینے کی آواز آئی۔ میرے پہلو میں بیٹھا ہوا' کرسی میں دھنسا ہوا ان کا بھاری بھرکم بدن ہل رہا تھا اور آنسو یکے بعد دیگرے ان کے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ ماحول ایک دم اداس ہوگیا۔ رنگ محفل متغیر ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ علالت کی وجہ سے حرکت نہیں کرسکتے تھے۔ آنسوؤں نے اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیا اور خود داڑھی کے بالوں میں چھپ گئے۔

اپنے صدارتی کلمات میں انہوں نے تقریر کیا کی گویا بھیک مانگی۔ "میں کیا عرض کروں میں تو آپ سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ اللہ نے آپ کو توفیق دی ہے۔ ہماری اکیڈمی کے لئے کوئی صدقہ خیرات دیجئے' جو غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی و ترویج کے لئے کام کر رہی ہے۔ آپ اکیڈمی کو چندہ نہیں دینا چاہتے' نہ دیں لیکن میں یہ بات زور دے کر کہوں گا کہ آپ کا پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ اپنے مادری علمی کو ضرور بالضرور اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہا کیجئے۔ جس اسکول یا کالج میں آپ نے تعلیم حاصل کی ہے' جہاں سے تعلیم حاصل کرکے آپ اس لائق ہوئے ہیں کہ یہاں آکر ملازمت کرسکیں' اس کا بھی آپ پر حق ہے اور بہت حق ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں لائبریریوں اور لیبارٹریوں کی کیا حالت ہے۔ کہیں ضروری سازوسامان نہیں۔ کہیں کتابیں نہیں۔ کہیں فرنیچر نہیں۔ کہیں دیواریں ادھڑی ہوئی ہیں۔ کہیں کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ آپ کم از کم اپنے اسکول یا کالج کی یہ چھوٹی موٹی ضرورتیں تو پوری کرسکتے ہیں۔ آپ اس کو بھی چھوڑیئے۔ ہمارے ملک میں معاشی لحاظ سے سب سے کمزور پیشہ استاد کا ہے حالانکہ استاد کا درجہ بڑی فضیلت رکھتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے اساتذہ کی وجہ سے ہیں۔ آپ کے اساتذہ ضعیف ہوگئے ہوں گے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کی معاشی حالت اور بھی دگرگوں ہوگئی ہوگی۔ ان کے بیٹے بیٹیاں شادی کے لائق ہوگئے ہوں گے۔ آپ کی نیک کمائی میں ان کا بھی حق ہے۔ اپنے اسکول' کالج اور استاد کی خدمت کرتے رہا کیجئے۔ اس معمولی خدمت سے بھی بہت کچھ حاصل ہو جائے گا"۔

ان نصیحتوں کا "اثر" یہ ہوا کہ اجلاس میں کسی نے ایک دھیلا بھی چندہ جمع نہیں کرایا۔ شاید کہ اس کے لئے شوبز یا کھیل تفریح کا آدمی ہونا ضروری ہے۔

اگلے روز دس بجے صبح میری روانگی تھی۔ میں ڈاکٹر صاحب سے الوداعی مصافحے کے لئے لفٹ سے نیچے اترا۔ ان کا کمرہ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ ہوٹل کی وسیع و کشادہ انتظار گاہ کے ختم ہونے پر عین صدر دروازے سے کوئی دو میٹر کے فاصلے پر ایک وھیل چیئر رکھی ہوئی تھی۔ وھیل چیئر کے اندر ایک انسان تھا۔ اس کے

دونوں ہاتھ کرسی کی ہتھیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ گرم لمبے کوٹ میں ملبوس، سر پر سیاہ بالوں والی ٹوپی، گلے میں براؤن مفلر، دنیا کے مختلف ملکوں کی تیس یونیورسٹیوں سے سب سے زیادہ ڈاکٹر آف سائنس کا اعلیٰ ترین اعزازی اکیڈمک ایوارڈ پانے والا شخص، دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام نوبل پرائز حاصل کرنے والا واحد پاکستانی فاضل، ہزارہا سال سے رائج و قائم چار مادی قوتوں کو گھٹا کر تین ثابت کرنے والا، تاریخ سائنس کی پیشانی پر اپنا ابدی نام ثبت کرنے والا محقق، نظریاتی طبیعات کی تحقیق کا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ قائم کرنے والا جھنگ کا عام سا انسان، تیسری دنیا کی سب سے بڑی اور فعال ترین سائنس اکیڈمی کا بانی، سینکڑوں مقالات لکھنے والا مصنف آج کس قدر بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ، لیکن کیسی شائستگی اور عظیم اسلامی و انسانی اخلاق روایات کے ساتھ اپنے تین سو مہمانان عزیز کو الوداع کہنے کے لئے سب سے پہلے صدر دروازے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

میں شش و پنج میں پڑا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس مصافحے کے لئے جاؤں یا نہ جاؤں۔ گذشتہ شام میں نے ان کو بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔ بہتر ہے کہ میں ان سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں۔ یہ برا ماننے والا شخص نہیں ہے۔ ابھی میں مڑنے ہی والا تھا کہ ان کی گردن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ ان کی دوربین نظروں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں ان کے قریب گیا۔ ان کی خرخراہٹ والی خفیف آواز سننے کے لئے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے بالکل قریب کرلیا۔ کہنے لگے "کل آپ نے ڈاکٹر عثمانی کا ذکر کرکے بہت اچھا کیا۔ مجھے سکون پہنچا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور وہ آپ کے حلق میں جو سرطان ہوگیا تھا اس کا کیا حال ہے؟"۔

اور کہا "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ جائیے پاکستان کی خدمت کیجئے۔ خط لکھا کریں اور اگر احباب میرا حال پوچھیں تو کہنا اب اچھا ہے۔ جو بھی ملے اسے میرا سلام کہنا"۔

بقیہ از صفحہ 216

کر سکتے تھے۔ اس واسطے کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں اور محققین کو ایک جوش اور ولولہ نصیب ہوا جو اپنے وقت کے عظیم دماغوں سے ملے بغیر ممکن نہیں تھا۔ انہی لوگوں نے اپنے ممالک میں واپس جا کر سائنسی ترقی کیلئے کام کا آغاز کیا جو آج پھول پھل رہا ہے۔ آپ کا سائنس کے متعلق نظریہ بے حد وسیع تھا اور آپ اسے ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ آپ نے کمپیوٹرز، لیزر، جینٹک انجینیئرنگ، بائیوٹیکنالوجی جیسے شعبوں کیلئے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی اور دوسرے مراکز تحقیق بنائے۔ آپ نے نہ صرف شمال اور جنوب کے مابین تعاون کی حوصلہ افزائی کی بلکہ مشرق و مغرب کے مابین بھی تعاون کی فضا قائم کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام اپنی تمام عزت و عظمت و شہرت کے باوجود ہمیشہ ایک عاجز اور منکسر المزاج انسان رہے۔ آپ نے کبھی اپنے مقام اور مرتبہ کو دولت جمع کرنے کی اور محلات تعمیر کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ نوبل انعام کی رقم میں سے آپ نے ضرورت مندوں کو وظائف دینے کا اعلان کیا۔ نوجوان سائنس دانوں کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام ہمیشہ ایک نمونہ اور ماڈل کے طور پر رہیں گے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں فزکس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا ادارہ ہو۔ پاکستان میں منعقد ہونے والے ایک سالانہ سیمینار کے متعلق آپ کو امید تھی کہ یہ ایک ایسے ادارے کے قیام پر منتج ہوگا جو پھر پاکستان میں ماہرین طبیعات اور ریاضی کی ایک نئی نسل کو جنم دے گا۔ آپ خود یہاں آکر لیکچر دینا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایک ایسے مرکز کی تجویز نوکر شاہی کی دلدل میں پھنس گئی اور باہمی جھگڑوں کی نذر ہوگئی۔ پاکستان کے ماہرین طبیعات جو بہترین خراج تحسین ڈاکٹر صاحب کو پیش کرسکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اختلافات سے بالا تر ہو کر ایک ایسا ادارہ قائم کریں جہاں نوجوان سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے نقش قدم پر چل سکیں۔" (ترجمہ مکرم محمود احمد صاحب اشرف)

پروفیسر ڈاکٹر انیس عالم صاحب سے ایک انٹرویو

آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی فزکس اور درھم یونیورسٹی یوکے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کو امپیریل کالج لندن میں پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ آپ کا تدریسی اور تحقیقی تجربہ ۳۰ سال پر محیط ہے۔ آپ کے ۱۹ سے زائد ریسرچ آرٹیکلز مختلف ملکی و غیر ملکی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ آپ نے اٹامک فزکس 'نیوکلیئر اینڈ پارٹیکلز فزکس اور سالڈ سٹیٹ فزکس کے موضوعات پر کتب تحریر کیں اور کئی کتب کے تراجم بھی کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسلام کی کتاب یونیفیکشن آف فنڈامنٹل فورسز کا ترجمہ بھی مکمل کر چکے ہیں جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ۸۹-۱۹۸۸ء میں سترہ ماہ کیلئے آپ نے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس (اٹلی) میں وزٹنگ سائنٹسٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا آپ ۲۰ سے زائد غیر ملکی کانفرنسز اور ورکشاپس میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ رسالہ خالد کے قارئین کیلئے محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں جو آپ نے انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے آپ کا رابطہ کیسے ہوا؟

جواب:۔ پہلی دفعہ میں نے راولپنڈی میں ایک سکول ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ پھر ۱۹۶۰ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں Phd کے دوران ڈاکٹر صاحب کے بعض لیکچرز سننے کا موقع ملا اور انہی لیکچرز سے پارٹیکلز اور فنڈامنٹلز کے بارے میں کچھ آئیڈیا ہوا اور یہیں سے مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں تھیوریٹکل فزکس میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ ۱۹۶۴ء میں جب میں .Ph.D کا مقالہ لکھ رہا ہے تو مجھے ایک سکالرشپ ملا اور میری فزکس میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے لندن ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ ہمارا ایک طالبعلم سکالرشپ پر یہاں آ رہا ہے آپ اسے امپیریل کالج میں ایڈجسٹ کروا دیں۔ چنانچہ سلام صاحب نے مجھے امپیریل کالج میں .Ph.D کیلئے ایڈجسٹ کروا دیا۔ لیکن اسی دوران ڈاکٹر صاحب ICTP کے ڈائریکٹر بن کر ٹریسٹ (اٹلی) چلے گئے اور ان سے کم ملاقاتوں کا موقع ملا۔ ۱۹۶۷ء میں .Ph.D کے بعد میں واپس پاکستان آگیا۔ اور ۱۹۷۰ء میں پہلی دفعہ میں نے گرمیوں کی چھٹیوں کے دو تین ماہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے پاس اٹلی میں گذارے۔ اس کے بعد تقریباً ہر سال میں سلام صاحب کے پاس حاضر ہوتا رہا ہوں۔ اس طرح میری ڈاکٹر سلام صاحب سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور میرا جو سارا کیریئر ہے اس کے بنانے میں ڈاکٹر سلام صاحب کا ہی بنیادی کردار ہے۔

سوال:۔ اس وقت دنیا بھر میں بہت سے سائنسدان کام کر رہے ہیں۔ لیکن سلام صاحب میں وہ کونسی خوبیاں تھیں جو انہیں دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

جواب:۔ ڈاکٹر سلام صاحب کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کیا وہ بنیادی نوعیت کا ہے اور اس کے اثرات ساری فزکس پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ کائنات کی جو قوتیں ہیں ان پر کام کرنے والے بمشکل چند درجن لوگ ہوں گے اور ان میں سے چونکہ سلام صاحب کو نوبل پرائز ملا اس لئے وہ نمایاں ہیں اور اس طرح اس صدی کے جو دس پندرہ چوٹی کے سائنسدان تھے ڈاکٹر سلام صاحب کا ان میں شمار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ باقی سائنسدانوں کو تو صرف اپنی فیلڈ میں ہی دلچسپی ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر سلام صاحب نے "فزکس بطور سبجیکٹ" کے پھیلاؤ اور فروغ کیلئے بہت کام کیا ہے اور اس کام کیلئے بے شمار

ادارے بنائے۔ اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے ڈاکٹر صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ ٹریسٹے میں واقع ICTP اس کی زندہ مثال ہے۔

تیسری بات جو ڈاکٹر صاحب کو دوسرے تمام سائنسدانوں' سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو عام انسانیت سے بھی بہت محبت تھی اور آپ ان کی فلاح و بہبود کیلئے بھی بہت کام کرتے رہے ہیں۔ یہ چیزیں ہمیں اس دور کے باقی سائنسدانوں میں اس طرح نظر نہیں آتیں۔

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی کوششوں سے اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کا جو ادارہ بنا اس سے ترقی پذیر ممالک اور بالخصوص پاکستانی سائنسدانوں کو کون سے فوائد حاصل ہوئے۔

جواب:۔ ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کے واسطے Treaste میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ICTP کا جو ادارہ بنا اس لحاظ سے وہ بہت اہم ہے کہ یہاں پر دنیا کے چوٹی کے سائنسدان آتے ہیں۔ اسی طرح ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کا اس سنٹر میں ان سے رابطہ ہو جاتا ہے اور اس وقت فزکس میں جو بھی نمایاں کام ہو رہا ہے وہ ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو فزکس میں نمایاں کام کرنے والے ان سائنسدانوں سے براہ راست پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان اس سے پہلے سائنسی میدان میں Isolation محسوس کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی شدت سے اس Isolation کو محسوس کیا تھا۔ لیکن اس ادارہ کے قیام سے ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو بھی فزکس کے بڑے بڑے سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آگئے اور جن مشکلات کا سامنا سلام صاحب کو کرنا پڑا اس ادارہ کے قیام سے سلام صاحب نے ان کا حل کر دیا۔

جہاں تک اس ادارے سے پاکستانی سائنسدانوں کو ملنے والے فوائد کا تعلق ہے تو اس وقت پاکستان میں فزکس کے جتنے بھی Active سائنس دان ہیں ان سب کو اس ادارے میں کام کرنے کا موقع ملا اور اس سے انہیں ریسرچ کے میدان میں کافی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

سوال:۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے جو کردار ادا کیا اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب:۔ اصل میں پروفیسر عبدالسلام اور پاکستانی سائنس کو علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا چونکہ وہ پچاس کے دھائی سے ہی پاکستانی سائنس سے وابستہ رہے اور ۱۹۷۴ء تک صدر کے سائنسی مشیر بھی تھے۔ اس لئے پاکستان میں سائنس کے جتنے بھی ادارے بنے اور پاکستان کے جتنے بھی سائنس دان ٹرینڈ ہوئے ان سب میں سلام صاحب کا بنیادی کردار ہے۔ اور یہ بدقسمتی ہے کہ ۱۹۷۴ء میں جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے گئے تو ان کی جگہ لینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ یعنی ان کی مناسب Replacemnt نہیں ہو سکی۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سائنسدانوں کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اور اس وقت ہم شدید بحران سے دوچار ہیں کیونکہ اس وقت فزکس کے پاکستانی سائنس دانوں میں جو فعال ہیں وہ سب کے سب عمر کے لحاظ سے ۵۰ کے لگ بھگ ہیں اور اس کے بعد ۱۰، ۱۵ سال کا گیپ نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے گئے تھے۔ اور بعد میں ان کی Replacemnt نہیں ہوئی۔

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو ناگزیر وجوہات کی بناء پر پاکستان سے جانا پڑا کیا اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب پاکستان میں سائنس کی ترقی کیلئے کام کرتے رہے۔

جواب:۔ پاکستان سے جانے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ پاکستان میں کسی طرح سائنس کی ترقی ہو۔ اس لحاظ سے میرے پر بھی ان کی خاص شفقت تھی۔ کیونکہ میں اپنی ریسرچ کے علاوہ پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں لکھتا لکھاتا

رہتا ہوں۔ تو جب بھی ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں نہایت مفید مشورے دیئے۔ پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں ان کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ اور وہ انفرادی، اجتماعی اور Institutional سطح پر ہر طرح سے کوشش کرتے رہے کہ پاکستان سائنسی میدان میں ترقی کرے۔

سوال:۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے ڈاکٹر صاحب کے جذبات کس قسم کے تھے؟

جواب:۔ پاکستانیوں اور پاکستان سے ڈاکٹر صاحب کو بہت محبت تھی۔ مثلاً جب بھی ہم نے وہاں جانا انہوں نے فوراً پنجابی یا اردو میں بات کرنی شروع کر دینی۔ جب بھی ان سے پاکستان کے حالات پر بات ہوتی جذباتی ہو کر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ پاکستانیوں کیلئے سلام صاحب کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

سوال:۔ سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ایک انسانیت دوست شخص بھی تھے۔ اس بارے میں آپ ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں گے؟

جواب:۔ یہ بات درست ہے کہ آپ بہت انسانیت دوست تھے۔ میں ۸۴ء سے ۸۵ء کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سال ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہا۔ ڈاکٹر صاحب کو جو خطوط آتے ان میں سے اردو خطوط کے جواب دینے کا کام میرے سپرد تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ لوگ کیسے کیسے مسائل ڈاکٹر صاحب کو لکھتے ہیں۔ جن میں سائنسی اور عمومی مسائل کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب سب کو نہ صرف جواب دیتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے اور یہ ڈاکٹر صاحب کا مستقل طریق تھا۔ اور آپ کی اسی فراخدلانہ عنایات اور ہر ممکن اعانت اور تعاون کی بناء پر ہماری فزکس کی کمیونٹی میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر سلام کو خط لکھنے میں ہمیشہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب کے گرد مختلف دائرے تھے پہلا دائرہ ان کی فیملی اور کمیونٹی کا تھا۔ دوسرا پاکستانی کا پھر اسلامی ممالک کا پھر ترقی پذیر ممالک کا اور پھر پوری دنیا کا دائرہ۔ اس طرح انہوں نے ہر دائرے کے حوالے سے کام کیا اور پاکستان میں یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر سلام مختلف رسالوں خاص طور پر مہلک ہتھیاروں کے خاتمے کی تحریک چلانے والے رسالے بلیٹن آف اٹامک سائنسز جس کے بانیوں میں آئن سٹائن بھی تھا اس کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے بھی ممبر تھے۔ اور ڈاکٹر سلام ہمیشہ Peaceful دنیا کیلئے کام کرتے رہے۔ جس میں ہر طرف امن اور خوشحالی ہو۔ اس کی ایک اور مثال میرے سامنے ہے ۸۰ کے دہائی میں جب ریگن امریکہ کا صدر بنا تو اس نے ہتھیاروں کی نئی دوڑ شروع کر دی۔ جسے StarWar کہا جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ایسا سلسلہ بنائیں جس میں امریکہ کے اوپر ایسے سیٹلائٹس ہوں جو روس وغیرہ کی طرف سے آنے والے میزائلوں کو روک لیں۔ امریکی سائنسدان اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ایک تو یہ سلسلہ تقریباً ناممکن تھا دوسرے اس پر اتنا خرچ آتا کہ اگر اس کو دوسری جگہ خرچ کیا جائے تو انسانیت کا بہت بھلا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سلام صاحب نے امریکی اور دیگر یورپی سائنسدانوں سے مل کر اسٹار وار پروگرام کے خلاف مہم چلائی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ

He was a Universal Man ایسے عالمی آدمی تھے کہ ان کی بات سنی جاتی تھی۔ باہر کے ممالک میں ڈاکٹر صاحب کو بہت سے فورمز پر خطاب کا موقع ملا جن میں وہاں کے ممالک کے صدور اور وزراء اعظم بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن پاکستان میں انہیں پبلک کو ایڈریس کرنے کے بہت کم مواقع ملے۔ ۱۹۸۶ء میں وہ کافی عرصہ کے بعد پاکستان آئے تو ہم نے ان کے ایک لیکچر کا اہتمام کیا تھا تو اس لیکچر میں اتنے لوگ آئے کہ سارا ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ پاکستانی عوام ان سے محبت کرتی تھی لیکن بدقسمتی سے ہم نے انہیں ایسے مواقع فراہم نہیں کئے جن میں پاکستانی عوام کے ساتھ ان کا براہ راست رابطہ ہو سکے۔

(انٹرویو مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کا دورۂ تنزانیہ (مشرقی افریقہ)

(مکرم عبدالوہاب احمد صاحب شاہد سابق امیر و مشنری انچارج تنزانیہ)

تیسری دنیا کا درد

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے دنیائے انسانیت اور بالخصوص تیسری دنیا کی دکھی انسانیت کا درد اور سسکتی جانوں کا دکھ دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ ایسے غریب ملکوں کے سائنس میں ترقی کیلئے ہر قسم کی مالی قربانی کے ذریعہ ان کے فلاح و بہبود کے سامان کرتے۔ انہیں جو مختلف انعامات ملتے تھے وہ غریب ملکوں کے سائنسدانوں کی تربیت سے تعلق رکھنے والے اداروں کو دے دیتے تھے۔ دنیا میں انہوں نے عالمی سطح کے کئی سائنسی ادارے قائم کرکے دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ ٹرسٹ اٹلی میں آپ کے قائم کردہ ادارہ سے ہی اب تک چالیس ہزار سائنس دان استفادہ کرچکے ہیں۔ پس غریب دنیا کیلئے آپ بے حد دکھی رہتے تھے اور ملک ملک میں پہنچ کر لوگوں کو غربت کے چنگل سے نجات کی راہیں بتاتے تھے۔ تنزانیہ ایسٹ افریقہ کا دورہ بھی ان کی اسی تڑپ اور جذبہ ہمدردی خلائق کی کڑی تھی۔

دارالسلام ایئرپورٹ پر ورود

مارچ ۸۴ء کو اٹلی سے عازم تنزانیہ ہوئے اور دارالحکومت دارالسلام کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ورود فرما ہوئے۔ خاکسار، میجر جنرل چوہدری نواز سفیر پاکستان مقیم تنزانیہ، صدر جمہوریہ تنزانیہ کے خصوصی نمائندہ اور وائس چانسلر یونیورسٹی تنزانیہ نے جہاز کے ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد دروازہ کھلتے ہی آگے بڑھ کر پروفیسر صاحب کو خوش آمدید کہا انہوں نے ہمیں مصافحہ اور معانقہ سے نوازا اور ہمارے ساتھ وی آئی پی لاؤنج میں تشریف لائے۔ جہاں دیگر اعلیٰ حکام نے آپ کا استقبال کیا۔

خوشی و غم کے آنسو

جہاز سے باہر آتے وقت ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ کر ضبط نہ رہ سکا اور آنسو برس پڑے۔ سب حیران تھے اور سمجھ نہیں پارہے تھے کہ آخر یہ آنسو کیسے ہیں۔ ایک اخباری نمائندہ یا کسی اور اعلیٰ شخصیت نے بالآخر پوچھ ہی لیا کہ جناب ڈاکٹر صاحب یہ آنسو کیسے ہیں۔ جواباً ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:-

"میرے یہ آنسو خوشی و غمی کے امتزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ خوشی اس بات سے ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیارے اور باوقار عاشق صحابی سیدنا بلالؓ ہاں وہی بلالؓ جس نے اپنے خون سے بستان دین محمد ﷺ کو سینچا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان و اقرار کے پاداش میں تپتی ہوئی ریت اور گلیوں کے نوکیلے سنگریزوں پر گھسیٹا جاتا تھا جو ان کے قطرات خون، ان کی محمد ﷺ اور رب محمد ﷺ سے عشق و وفا کی داستان رقم کرتے تھے کی سرزمین پر قدم رکھنے کی توفیق و سعادت پائی ہے اور رنج و غم اس وجہ سے ہے کہ اس عاشق رسول ﷺ کی قوم غربت اور بھوک و افلاس کی چکی میں کیوں پس رہی ہے۔"

آپ کے اس جواب سے عجیب سماں بندھ گیا اور سب اپنے سر جھکائے آپ کے آنسوؤں کو اپنے لئے قسمت نو بہار کے پھول سمجھتے ہوئے پکار اٹھے۔

O, our dear brother Most Welcome

افریقنوں سے محبت۔ انوکھے انسان

ایئرپورٹ سے گاڑیاں ایمبیسی ہوٹل جہاں ڈاکٹر صاحب کے قیام کا انتظام تھا روانہ ہوئیں۔ ایئرپورٹ سے باہر قطار در قطار کھڑے استقبال کرنے والوں کے ہاتھ جونہی ہوا میں لہرائے ڈاکٹر صاحب نے استفسار فرمایا کہ یہ بھائی میرے لئے آئے ہیں" میرے یہ بتانے پر کہ ہاں آپ کیلئے ہی چشم براہ ہیں اور ان میں اکثریت احمدیوں کی ہے جو خادم انسانیت اور اپنے روحانی بھائی کیلئے دیدہ و دل بچھانے آئے ہیں۔ میری بات مکمل ہوئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے گاڑی رکوائی اور نیچے اتر آئے جونہی ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کو بریک لگی آگے پیچھے رواں دواں سب گاڑیاں رک گئیں اور سب بھاگ کر ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کے پاس پہنچ گئے کہ خیر ہو گاڑی کیوں رکی ہے۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو ہر ایک سے ملتے، مصافحہ و معانقہ کرتے دیکھ کر دنگ رہ گئے اور کہا کہ یہاں جو بھی غیر ملکی شخصیات آتی ہیں وہ استقبال کرنے والوں کو گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی ہاتھ ہلا کر کم ہی جواب دیتے ہیں مگر یہ ہیں کہ پیدل چل رہے ہیں اور ہر ایک سے مل رہے ہیں جیسے یہ ان کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔

O, how much he has love with Affrecans. We never forget him.

اور مزید کہا کہ یہ ایک واحد مثال ہے ورنہ آج کے انسان ہم افریقنوں سے محبت نہیں نفرت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دوسروں سے الگ تھلگ ایک انوکھے انسان ہیں۔ انہوں نے تو ہمارے جد امجد سیدنا بلالؓ سے پیار کرنے والے محسن و محب انسانیت حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی یاد تازہ و زندہ کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سب سے ملتے ہوئے آخری آدمی تک پہنچے اور سب اعلیٰ شخصیات آپ کے ساتھ ساتھ پیدل چلتی رہیں اور گاڑی خالی رواں دواں رہی۔ بڑا عجیب نظارہ تھا جس کا الفاظ میں پورا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔

ہمدردانہ مشورے اور خوشی کی لہر

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اپنے چند روزہ قیام تنزانیہ کے دوران میں صدر مملکت، وزراء، مختلف اداروں کے ہیڈز اور دیگر اعلیٰ شخصیات سے ملاقاتوں کے علاوہ Huts میں مکین غریبوں اور مسکینوں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے گھل مل گئے اور انہیں اپنی حالت غربت بدلنے کے راستے بتائے۔ اس طرح تنزانیہ یونیورسٹی اور دیگر بڑے بڑے ہال اور کمیونٹی سنٹر میں دانشوروں، ملکی و غیر ملکی اعلیٰ شخصیات اور حکام سے خطاب فرمائے اور بتایا کہ ساڑھے تین لاکھ سے زائد مربع میل رقبہ پر پھیلا ہوا ملک جس کی آبادی بھی قریباً دو کروڑ ہو کیوں غربت کا شکار ہے۔ اتنی وسیع زمین جو زرخیزی کے لحاظ سے سونا ہے جس ملک کی ہو وہ تو بہت آگے نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگریکلچر کو ترقی دینے پر زور دیا اور سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں مختلف ذرائع اور طریق بتائے اور ڈھنگ سکھائے اور ملک کو صف اول میں لانے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہمدردانہ اور قیمتی مشوروں اور اپنے سے بے پناہ محبت اور پیار کو پا کر بلالی قوم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر کوئی خوشی سے اچھل اچھل پڑا کہ ہمارے بھائی کو ہم سے کتنا پیار اور ہمدردی ہے ہماری حالت زار پر کتنے آنسوں بہاتا اور ہمارے لئے درد سے ہلکان ہو رہا ہے اور ہماری ترقی کا کس قدر خواہاں اور دلی تڑپ رکھتا ہے۔

رچ ملک Rich Country

ایک موقعہ پر ڈاکٹر سلام صاحب نے بلالؓ کے تنزانین سپوتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اے محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیارے بلال کے پیارو اور میرے دل کے لالہ زارو اٹھو اور اگریکلچر کے میدان میں آگے بڑھو اور اعلیٰ مقام پاؤ جو تمہارا مقدر ہے آپ ایک ایسے ملک کے باسی ہیں جو Rich Country ہے۔ اٹھو اور جدید ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاؤ اس طریق پر نہ صرف آپ اپنی غربت دور کر سکیں گے بلکہ دس دوسرے ملکوں کو بھی کھلا سکیں گے۔"

قوتوں کا سرچشمہ - ایک خدا

پروفیسر سلام صاحب کے دورہ کے دوران ایک سوال یہ سامنے

آیا کہ آپ قوتوں کو متحد کرنے کی اپنی تھیوری اور ریسرچ سے یہ تو نہیں ثابت کر رہے کہ خدا ایک ہے اور اس کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا کہ:۔

"خدا کا ایک ہونا ہماری ریسرچ کا محتاج نہیں وہ اپنی تمام قوتوں اور صفات جو اس کی اس وسیع و عظیم کائنات میں پھیلی ہوئی اور محیط ہیں کے باوجود ازل و ابد سے ایک ہے۔ ہم تو اپنی ریسرچ سے اس کے شکر گزار بندے بننے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ اس کی قوتوں اور صفات گوناں گوں جو اس ایک کے وجود میں ایکا کا رنگ لئے ہوئے ہیں ایک نہایت چھوٹے سے چھوٹے حصے اور آئیٹم کی کنہہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے ولا یحیطون بشی من علمه الا بماشاء اس (اللہ) کے علم میں سے جس قدر وہ چاہے اس سے زیادہ کسی بھی چیز کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہر چیز کی بلکہ ہر ذرہ کی بقا اس ایک ذات سے وابستہ ہے اس کے بغیر لم یکن شیا مذکورا یعنی کوئی قابل ذکر چیز ہے ہی نہیں اور کل شئی یرجع الی اصله ہر چیز اصل کی طرف راجع ہے جو ذات خداوندی ہے۔ اصل سے جدا کا نام عدم ہے۔ پس کل یوم هو فی شان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنسدان کس ساعت کی کس شان کے کس چھوٹے سے چھوٹے کلیے یا ذرے کو اس کی کنہہ تک پہنچا سکے گا ناممکن ہے۔ زندگیوں کی زندگیاں ختم ہوتی جا رہی ہیں لیکن ہر مرحلہ پر لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثله مددا کی صداقت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ہم سائنس دانوں کی زندگیاں ریسرچز اور کاوشیں ختم ہو جائیں گی مگر رب کے کلمات جو تمام قوتوں اور توانائیوں کا سرچشمہ ہے کبھی ختم نہ ہوں گے...."

ایک اور موقعہ پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:۔

"یہ ثبوت مل جائے گا کہ یہ چاروں قوتیں دراصل ایک ہیں اور توانائی کا سرچشمہ ایک اور صرف ایک ہے لیکن تجربے کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

(ہفت روزہ لاہور ۷ دسمبر ۱۹۹۶ء)

سائنس اور مذہب

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اپنے لیکچروں اور گفتگو میں آیات قرآنیہ کی تلاوت اور اس کی روشنی میں مضمون کے بیان کو ایک عجوبہ سمجھا گیا کیونکہ تنزانیہ میں بھی یہ خیال بڑی شدت سے پایا جاتا تھا کہ سائنس اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ مذہب اور سائنس ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مذہب خدا تعالیٰ جو خالق کائنات ہے کی طرف سے راہنمائی ہے اور سائنس اس کی عملی شکل ہے۔ سائنسدان عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں مگر انہیں جاننا چاہئے کہ عقل دی کس نے ہے؟ جس نے عقل دی ہے وہی اس کی راہنمائی کرتا ہے اس کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہے اور اسے سائنس دانوں کے ذریعہ کام میں لا کر ان سے ایجادات کرواتا ہے۔ ورنہ

"یہ تو خود اندھی ہے گر نیر الہام نہ ہو"

سائنسدان چونکہ عرفان الٰہی سے محروم ہیں اس لئے اللہ کے نام سے بدکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میری سائنس کی بنیاد قرآن کریم ہے اور خدا کی راہنمائی اور اس کے کلام کی روشنی میں ہی میں قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ میرے اس عمل نے سائنس کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ اور سائنس دانوں کی ایک خدا کی طرف توجہ ہو گئی ہے کہ کوئی ہستی تو ہے جو سلام کی راہنمائی کر رہی ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبیل پرائز جیت چکا ہے۔ پس یہ قدرت خداوندی ہے جو انہیں گھیر کر اس طرف لے آئی ہے اور ان کی زبان سے یہ کہلوا دیا ہے کہ!

"ہم میں ایک ایسا سائنس دان بھی ہے جو حی و قیوم خدا پر ایمان رکھتا ہے۔" (ہفت روزہ لاہور ۷ دسمبر ۱۹۹۶ء)

ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ

جماعت احمدیہ تنزانیہ نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اعزاز میں وسیع پیمانے پر ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اعلیٰ شخصیات، وزراء، ڈاکٹرز، وکلاء، اعلیٰ حکام، دانشوروں اور مختلف ملکوں کے سفراء نے شرکت کی۔ اس اہم تقریب کا آغاز خاکسار کی صدارت

میں تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔ نظم کے بعد جماعت احمدیہ کی طرف سے اپنے روحانی بھائی اور عظیم سائنس دان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کے ساتھ تنزانیہ کی بنی ہوئی ایک خاص طرز کی ٹوپی تحفہ پیار کے طور پر پیش کی گئی جسے ڈاکٹر صاحب نے قبول فرماتے ہوئے اسی وقت پہن کر پیار کا جواب پیار سے دیا اور سپاسنامے کے جوابی خطاب میں بھی اسے پہنے رکھا۔ آپ نے اپنے خطاب میں نوجوانوں کو خاص طور پر علم و عمل کے میدان میں مثالی کردار پیش کرنے کی نصیحت فرمائی۔

امام وقت سے عشق و محبت

تنزانیہ میں عرصہ قیام کے دوران ڈاکٹر سلام صاحب کی امام وقت سے جو بے پناہ محبت و عشق تھا اس کی جھلکیاں بھی منصہ شہود میں آئیں اور لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈالا۔

حکومت تنزانیہ اور ادارہ جات کی خواہش ہوتی تھی کہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے اعزاز میں منعقد ہونے والی سب تقاریب میں میں شامل ہوں اور پاکستان کے سفیر کا تو از حد اصرار تھا کہ میں ضرور ہر تقریب میں شریک ہوں کیوں کہ اس ملک میں جماعت احمدیہ کے امیر ہونے کے لحاظ سے مجھے جو پروٹوکول ملتا ہے اس سے ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ان کے شایان شان Dealing میں مدد ملتی اور تمام امور متعلقہ کی انجام دہی آسان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خاکسار تقریباً سبھی تقاریب میں شریک ہوا اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ جب بھی میں کسی تقریب میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب خواہ کتنی ہی اعلیٰ شخصیات سے محو گفتگو ہوتے انہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور لپک کر عاجز کو خوش آمدید کہتے اور پھر شرکاء محفل سے مخاطب ہو کر فرماتے کہ یہ اس ملک کے لئے میرے پیارے امام کے نمائندہ ہیں اسی لئے مجھے سب سے زیادہ پیارے اور قابل احترام شخصیت ہیں۔ اللہ اللہ کتنا پیار اور عشق ہے امام وقت سے کہ ان کے ایک ادنیٰ و احقر خادم سے اپنے ارفع مقام کو خیال میں نہ لاتے ہوئے اور بڑی بڑی اعلیٰ شخصیات کی پرواہ کئے بغیر نہایت ہی عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔

عالمِ اسلام اور ملک وقوم کا سچا ہمدرد ــــ عاشقِ قرآن

عجب تھا عشق اس دل میں

شعبہ فزکس پنجاب یونیورسٹی کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران صاحب کا خراجِ تحسین

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی اور ۱۹۷۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں تحقیقی کاوشوں پر آپ کو عبدالسلام پرائز ملا۔ آپ ICTP میں ایسوسی ایٹ اور سینئر ایسوسی ایٹ بھی رہے۔ ۸۹۔۱۹۸۸ء میں امریکہ کی جارجیا یونیورسٹی میں فل برائٹ سکالر کی حیثیت سے تحقیقی کام کیا۔ مختلف غیر ملکی جرائد میں آپ کے ۶۰ سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ آپ ۲۵ کے قریب غیر ملکی کانفرنسوں میں ملک کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے جامعہ پنجاب شعبہ فزکس سے وابستہ ہیں اور ۱۹۹۵ء سے شعبہ کے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ فزکس سے متعلق کئی کتب کے مصنف بھی ہیں۔ رسالہ خالد کے ڈاکٹر عبدالسلام نمبر کیلئے جو انہوں نے انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔

(انٹرویو مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے آپ کا رابطہ کس طرح ہوا؟

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلی دفعہ میں نے ایڈنبرا یونیورسٹی میں پروفیسر کیمر کی ریٹائرمنٹ کی تقریب میں دیکھا تھا میں ان دنوں وہاں پر طالبعلم تھا۔ یہ ڈاکٹر کیمر وہی تھے جو ڈاکٹر سلام کے Ph.D. کے سپروائزر تھے۔ یہ ۱۹۵۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایڈنبرا آگئے اور انہی کی جگہ ڈاکٹر عبدالسلام کو تعینات کیا گیا تھا۔ لیکن میرا تفصیلی رابطہ ڈاکٹر صاحب سے ۱۹۸۲ء کے شروع میں ہوا جب میں اٹلی گیا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر سلام صاحب کو میں نے اپنے مضمون کی کاپی دی جو میں نے پاکستان میں سائنسی ترقی نہ ہونے کی وجوہات پر لکھا تھا۔ میں نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ پاکستان میں سائنسی ترقی نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان سائنس کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر سیاستدان نااہل بھی ہیں تو بھی بیوروکریسی اگر ٹھیک ہوتی تب بھی سائنسی ترقی ہو سکتی تھے۔ پھر تیسری بات اگر بیوروکریسی میں بھی کرپشن ہے تو جامعات کے وائس چانسلرز ہی ٹھیک ہوتے تب بھی سائنسی ترقی ممکن تھی۔ لیکن پاکستان میں بدقسمتی سے تینوں جگہوں پر نااہلی ہے۔ ڈاکٹر سلام صاحب نے جب یہ مضمون پڑھا تو مجھے کہنے لگے آپ کو اس مضمون سے پاکستان میں نوکری سے نکال کیوں نہیں دیا گیا۔ نیز فرمانے لگے سیاستدانوں اور بیوروکریسی کی نااہلی کا تو مجھے علم تھا لیکن جامعات کے وائس چانسلرز کے پہلو کی طرف میری توجہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس مضمون کا بعض جگہوں پر حوالہ بھی دیا ہے۔ پھر اس کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

سوال:۔ دنیا بھر کے سائنسدانوں میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا سب سے نمایاں مقام تھا۔ وہ کونسی خصوصیات تھیں جو ڈاکٹر صاحب کو دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

جواب:۔ ڈاکٹر سلام صاحب میں سب سے نمایاں بات جو انہیں دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ تھی کہ آپ نے پسماندہ

ممالک میں سائنسی ترقی کے فروغ کیلئے بہت کام کیا ہے۔ کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ پسماندہ ممالک اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے جب تک وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہ کریں اور ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ پسماندہ ممالک میں بھی بے پناہ صلاحیتوں والے لوگ موجود ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایسے مواقع نہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ کیونکہ سائنسی ترقی کیلئے ضروری ہے کہ آپ وہاں جائیں۔ جہاں اعلیٰ پائے کی سائنسی تحقیق ہو رہی ہے۔ لیکن پسماندہ ممالک کے پاس وسائل اور مواقع نہیں کہ اعلیٰ پائے کے تحقیقی سینٹرز میں جا سکیں۔ ان مشکلات کا چونکہ ڈاکٹر صاحب کو بھی سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے انہوں نے پسماندہ ممالک کے آئندہ آنے والے سائنسدانوں کیلئے ان مشکلات کو دور کرنے میں بڑی جدوجہد کی اور اپنی انتھک کوششوں سے ان کو ایسے ادارے مہیا کر دیئے جن میں وہ اعلیٰ درجے کے سائنس دانوں کے ساتھ بہترین ماحول میں تحقیق کر سکتے تھے۔ بہت سے اور بھی سائنسدان ہیں مگر انہوں نے سائنس کے فروغ کی پرواہ نہیں کی۔ نہ اپنے ملک کیلئے اور نہ ہی دوسرے ممالک کیلئے جب کہ ڈاکٹر سلام صاحب نے اپنے ملک اور دیگر پسماندہ ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے بہت کام کیا اور یہ وہ بات ہے جسے دوسرے لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ہندو سائنس دان مجھے کہا کرتا تھا کہ پروفیسر چندرا شیکھر بھی تو ہیں وہ بھی نوبل انعام یافتہ ہیں مگر انہوں نے ہمارے لئے کیا کیا۔ دوسرے سائنسدانوں کی نسبت ڈاکٹر صاحب میں یہ سب سے بڑا فرق تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سلام صاحب کا قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں بڑا گہرا اور وسیع نقطۂ نظر تھا۔ جس کا اظہار وہ اپنے مضامین میں جابجا کیا کرتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص وہ پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب کا تحقیقی اور تخلیقی عرصہ بڑا وسیع ہے آپ کے تحقیقی کیریئر کا آغاز 50-1949ء میں ہوا اور آپ 1993ء تک مستقل تحقیقی کاوشیں کرتے رہے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کی تحقیق کا عرصہ اتنا طویل ہو۔ عموماً سائنسدان ۵ سے ۱۵ برس تک منظر عام پر رہتے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

سوال:۔ کیا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر سب سے گہرا اثر مذہب کا تھا اس بارے میں آپ کا ذاتی مشاہدہ کیا ہے۔

جواب:۔ مجھے مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر مذہب کا بہت گہرا اثر تھا۔ ڈاکٹر سلام صاحب کی تحریر میں ہمیں قرآن کریم اور تاریخ اسلام کے بہت سے حوالے ملتے ہیں اور اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نے بہت لکھا ہے۔ قرآن کریم سے بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت لگاؤ تھا اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ آپ کو بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب جس وقت امپیریل کالج میں پروفیسر ہوئے تو ان کی عمر صرف ۳۱ سال تھی۔ اس وقت وہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک لیکچر دیا۔ جس کے آخر پر قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ کر آپ نے استدلال کیا اور وہ چیز لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ وہاں موجود ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ میں نے باقاعدہ گھڑی سے وقت نوٹ کیا تقریباً پانچ منٹ تک لوگ تالیاں بجاتے رہے۔ پھر ICTP میں بھی میں نے ان کو دیکھا ہے ان کے دفتر کے ساتھ آرام اور کھانے وغیرہ کیلئے ایک کمرہ ہوتا تھا۔ وہ دوپہر ایک بجے کے قریب وقفے میں وہاں چلے جاتے اور قرآن کریم پڑھتے رہتے مجھے انہوں نے خود بتایا ہے کہ میں وقفہ میں قرآن کریم کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔

سوال:۔ سائنس کے فروغ کے سلسلہ میں ترقی پذیر ممالک اور بالخصوص عالم اسلام کیلئے ڈاکٹر صاحب نے جو خصوصی طور پر کام کیا اس بارے میں آپ ہمیں کچھ بتائیں۔

جواب:۔ انہوں نے عالم اسلام کا کوئی لیڈر نہیں چھوڑا جس کو خطوط نہ لکھے ہوں اور اس کو اپروچ نہ کیا ہو کہ خدا کیلئے آپ علم اور سائنس کے فروغ کیلئے اقدامات کریں۔ پاکستان کو خط لکھے، کویت، اور سعودی

عرب کو خط لکھے۔ کبھی خود بھی گئے۔ انہوں نے کوئی اسلامی ملک نہیں چھوڑا جس کو نہ لکھا ہو۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے کہا کہ یار! یہ جو میں خطوط لکھتا رہتا ہوں اس کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ آپ نے سائنسی ترقی کے متعلق بنیادی نکات واضح کر دیئے ہیں۔ اب جس نے بھی اقدامات کرنے ہیں اسکو آپ کی چیزیں ضرور سامنے رکھنی پڑیں گی۔ اور یہ جو انہوں نے ٹریسٹ میں ICTP قائم کیا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے یہاں دنیا بھر سے سائنسدان آتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ روس سے بھی آتے تھے اور امریکہ سے بھی۔ منگولیا، برازیل، لاطینی امریکہ، افریقہ، نیپال، بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان غرض ہر جگہ سے لوگ آتے تھے۔ ہماری وہاں پر دوسرے مسلمان ممالک کے سائنسدانوں سے ملاقات ہوتی تھی اور تب پتہ چلتا تھا کہ ان ممالک میں سائنسی حوالے سے یہ یہ کام ہو رہا ہے۔ اس سنٹر کا بہت وسیع دائرہ اور وسیع اثر تھا۔ اور بین الاقوامی سائنسی تعاون جتنے وسیع پیمانے پر یہاں ہوا ہے پوری سائنسی تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔

سوال:۔ سائنس کی ترقی اور فروغ کے ساتھ ساتھ کیا ڈاکٹر صاحب عام انسانیت سے بھی محبت کرتے تھے اور عام لوگوں کی مدد کرتے تھے۔

جواب:۔ ڈاکٹر سلام صاحب میں بہت بڑا وصف جو میں بہت عرصہ تک مشاہدہ کرتا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام لوگوں کی مدد کرنے میں ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتے تھے۔ ان کو کسی نے اپنا مسئلہ بتا دیا۔ ڈاکٹر صاحب فوراً جو کر سکتے تھے کرتے تھے اور ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ مجھے کسی نے واقعہ سنایا کہ ۱۹۶۸ء میں کسی پاکستانی لڑکے کو امریکہ میں مزید تعلیم کیلئے داخلہ اور ایویی ایشن شپ مل گئی مگر اس کے پاس امریکہ جانے کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نے ڈاکٹر سلام صاحب کو لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس کو امریکہ کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ڈاکٹر سلام صاحب نے بہت سے لوگوں کے کیریئر بنائے ہیں۔ لوگوں کی زندگیاں سنواری ہیں۔ ان ممالک میں بہت سے لوگوں کی تقرریاں اور ترقیاں ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر ہوئی ہیں۔ یا اس لئے ہوئی ہیں کہ وہ لوگ ڈاکٹر سلام صاحب کے ادارے ICTP سے وابستہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت لوگوں کی مدد کی ہے اور لوگوں کی مدد کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی رنگ و نسل یا مذہب و ملت کا واہمہ تک بھی دل میں لاتے۔

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو اپنے وطن پاکستان سے بھی شدید محبت تھی اس بارے میں آپ کے ذاتی مشاہدات کیا ہیں۔

جواب:۔ مجھے جو ڈاکٹر سلام صاحب کو دیکھنے کا موقعہ ملا خصوصاً آخری دنوں میں تو ڈاکٹر سلام صاحب پاکستان کے نام پر وفور محبت سے اکثر رو پڑتے تھے۔ اور میں نے ذاتی طور پر بہت دفعہ پاکستان کے نام پر ڈاکٹر سلام صاحب کی آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ جس کا مجھے بہت دکھ ہوتا تھا انہوں نے ایک دفعہ مجھے کہا کہ ٹھیک ہے یہ ہمیں اپنے خیال میں بے شک کافر ہی سمجھیں لیکن پاکستانی تو سمجھیں اور پاکستان کا علمی پسماندگی کا بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت دکھ ہوتا تھا اور پاکستان میں مذہبی تعصبات اور فرقہ وارانہ فسادات جو بہت بڑھ گئے ہیں اس پر بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ یہاں ہندو مجھے طنزاً کہتے ہیں کہ پاکستان میں شیعہ سنی ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں آپ ہمیں کیا کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے زیادتی کرتے ہیں۔

سوال:۔ پاکستان میں سائنس کے فروغ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی نمایاں خدمات کیا تھیں۔

جواب:۔ ڈاکٹر سلام صاحب نے پاکستان کی مختلف حکومتوں کو بار بار لکھا انہوں نے کوئی حکومت نہیں چھوڑی جسے نہ لکھا ہو کہ پاکستان میں سائنس کو فروغ دیں۔ پاکستان میں جتنے بھی سائنسی ادارے بنے ہیں ان میں ڈاکٹر صاحب کا نمایاں کردار ہے وہ صدر پاکستان کے

سائنسی مشیر بھی رہے۔

سوال:۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے پاکستان میں سائنس کے فروغ کیلئے نمایاں کام کیا۔ کیا پاکستان کی طرف سے ان کے ان اقدامات کی مناسب قدر کی گئی یا نہیں۔

جواب:۔ ہاں ایک وقت تک جب تک وہ صدر کے سائنسی مشیر رہے اس وقت تک ان کی قدر کی گئی۔ بعد میں کسی رنگ میں قدر نہیں کی گئی۔ پریس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ عام لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں ان کے نام سے کوئی وظیفہ نہیں جاری کیا گیا فی الحال کوئی ادارہ نہیں کھولا گیا یہ بے قدری کی انتہاء ہے۔

سوال:۔ آپ کیا سمجھتے ہیں اس ناقدری کے پیچھے صرف اور صرف مذہبی تعصب تھا یا ہمارے ارباب حل و عقد کی سائنس سے عدم دلچسپی۔

جواب:۔ (اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر مجاہد کامران بے ساختہ بولے کہ) سو فیصد مذہبی تعصب' مذہبی تعصب اگر آپ سو فیصد نہ بھی کہیں تو نوے فیصد مذہبی تعصب تھا اور دس فیصد سیاستدانوں ارباب اقتدار اور نوکر شاہی کی کمزوری ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جو صحیح بات ہے وہ کرنی چاہئے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ مسلمانوں میں تو مذہبی تعصب ہونا ہی نہیں چاہئے۔ سمجھ نہیں آتا مسلمانوں میں مذہبی تعصب آ کہاں سے گیا۔

آخر پر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ

ڈاکٹر عبدالسلام ایک بہت ہی عظیم سائنسدان تھے جن کے دل میں انسانیت اور وطن کی محبت اور پسماندہ ممالک میں سائنسی ترقی کے بارے میں بہت درد پایا جاتا تھا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میرا وطن پاکستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک بھی سائنسی میدان میں ترقی کریں۔

اس کے بعد ہم The conecpt اپریل 94ء کے شمارے میں چھپنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران کے مضمون

Abdus Salam The soldier of science

میں سے چند باتیں جو انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر کیں وہ پیش کرتے ہیں۔

مجاہد کامران صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے عمر کے لحاظ سے دنیا بھر میں سب سے بااثر سائنسدان تصور کئے جاتے تھے۔ آپ کے شاگرد اور پرستار دنیا بھر میں موجود تھے۔ جو آپ کو اپنے ممالک کے حالات سے باخبر رکھتے۔ افریقہ' ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی سیاست اور وہاں کے حالات پر انکی گہری نظر تھی۔ کئی ممالک کے سربراہان اور وزراء سے ڈاکٹر عبدالسلام کا براہ راست رابطہ تھا۔ پروفیسر رزمی نے ایک بار کہا کہ "پاور فل عالمی شخصیت پر ڈاکٹر عبدالسلام کے اتنے زیادہ اثر کو دیکھتے ہوئے مجھے حضرت سلیمان کا خیال آجاتا ہے جن کے قبضہ میں جن بھی تھے۔

مجھے ICTP کی طرز پر ایک اور سینٹر بنانے کیلئے فنڈز دے دیں یہی میرا انعام ہے

مجاہد کامران اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ سائنس کے فروغ کا تو ڈاکٹر عبدالسلام کو جنون تھا۔ انہوں نے اٹلی کی حکومت کے تعاون سے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کا ادارہ تو قائم کیا ہی تھا اٹلی کی حکومت نے دو مزید سائنسی سینٹرز کیلئے بھی ڈاکٹر صاحب کو فنڈز دیئے تھے جو اب بااحسن طریق پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو سائنس کے فروغ میں اس قدر دلچسپی تھی کہ ایک بار کسی کو کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ایسے ۲۰ ادارے بناؤں۔ اٹلی کی حکومت نے سائنس کے فروغ میں آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ سے پوچھا کہ ہم آپ کو انعام دینا چاہتے ہیں آپ بتائیں آپ کو کس چیز کی خواہش ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے جواب دیا کہ مجھے ICTP کی طرز پر ایک ادارہ اور بنانے کیلئے فنڈز دے دیں یہی میرا انعام ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ڈاکٹر سلام ہر قسم کے کمپلیکس سے پاک تھے۔ جب چاہیں آسانی سے ان کے ساتھ ملاقات ہو سکتی تھی۔ آپ ان کے دفتر جائیں اگر وہ میٹنگ میں نہ ہوں تو سیدھے اندر چلے جائیں۔ اکثر ان کے کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ایک روسی سائنسدان وی اے کوف نے ایک دفعہ انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ

I found him very nice and very open. People who are not as big as he is, will be busy when You go to them. But Salam is different.

یعنی میں نے انہیں بہت ہی عمدہ اور فراخ دل والا انسان پایا۔ وہ لوگ جو ڈاکٹر عبدالسلام کی طرح عظیم نہیں ہوتے جب آپ انہیں ملنے جائیں تو وہ اکثر مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر سلام بالکل مختلف تھے۔"

"اوہ! تمہارے پاس عبدالسلام ہے"

ڈاکٹر مجاہد کامران تحریر کرتے ہیں کہ بیرونی دنیا میں ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کی پرجوش نمائندگی کرنے والے سمجھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کروشیا میں ایک عظیم سائنس دان پروفیسر میانی (Maiani) سے میری ملاقات ہوئی میں نے انہیں اپنا ایک مضمون دیا جو میں نے ڈیراک (Dirac) کی زندگی پر لکھا تھا۔ انہوں نے مضمون پسند کیا اور مجھے پوچھا کہ تمہیں یہ لکھنے کا خیال کیسے آیا میں نے کہا کہ میں اس لئے اس طرح کے مضمون لکھتا ہوں کہ نئی نسل کو سائنس میں دلچسپی پیدا ہو۔ کیونکہ عملاً پاکستان سائنسی لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ اس پر پروفیسر میانی نے فوراً حیرت سے کہا

Oh! but you have Abdus Salam.

اوہ تمہارے پاس عبدالسلام تو ہے۔

لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والا۔ عبدالسلام

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ٹریسٹ میں ڈاکٹر عبدالسلام کو ملنے والے ایک بات کا ہمیشہ اظہار کرتے کہ سلام لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور عقیدت بھی رکھتے ہیں اور اپنی مشکلات کے حل کیلئے ہمیشہ عبدالسلام کی راہنمائی اور مدد کے متمنی رہتے ہیں۔ ICTP میں آنے والا ہر سائنسدان فزکس میں ڈاکٹر عبدالسلام کی عظیم خدمات کا بھی معترف ہوتا اور اس بات پر بھی اس کو یقین ہوتا کہ یہی واحد وہ شخص ہے جو ہمارے مشکلات کو حقیقی طور پر سمجھتا ہے اور حل کرنے کیلئے سنجیدہ کوششیں بھی کرتا ہے اور باوجود بیماری کے اس ادارے کو چلانے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ جب کبھی تھک جاتا ہے تو اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں کچھ ستا لیتا ہے اور دن کے اختتام پر اپنے چھوٹے سے گھر میں چلا جاتا ہے جہاں وہ تنہا ہے ہاں کبھی کبھی چھٹیوں میں اس کے اہل خانہ بھی ساتھ ہوتے ہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پروفیسر عبدالسلام کو خراجِ عقیدت

پروفیسر ڈاکٹر اختر حسین آفتاب صاحب۔ پٹنہ (بہار) انڈیا

انسان جسمانی موت مرجاتا ہے لیکن اس کی خوبیاں اسے زندہ رکھتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم انسان کو اس کے جسم خاکی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی نیکیوں کی وجہ سے یاد رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علم، قلم، فکر، کردار، خلوص اور قربانی کا جذبہ موت کے بعد ہی زیادہ پرکشش، دلکش اور زندہ انسان کو جنم دیتے ہیں۔ ارسطو، بوعلی سینا، البیرونی، گیلیلو، نیوٹن اور آئن سٹائن مرنے کے بعد صحیح معنوں میں زندہ ہیں۔ کیونکہ ان کے مشاہدات اور ان کی تحقیقات سے آج کا انسان زیادہ مستفید ہو رہا ہے۔ جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں وہی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام جو ۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو انگلینڈ میں موت کی آغوش میں ہمیشہ کیلئے سو گئے مگر ہم ان کو معنوی طور پر اب اپنے درمیان زندہ پائیں گے۔

پروفیسر عبدالسلام ۱۹۵۵ء سے ۱۹۸۱ء تک اقوام متحدہ کے سائنس سے تعلق رکھنے والے کئی عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں وہ تھرڈ ورلڈ نٹ ورک آف سائنٹیفک آرگنائزیشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

بہت کچھ دیا

پروفیسر عبدالسلام نے فزکس کی دنیا کو بہت کچھ دیا جس کے اعزاز میں انہیں کیمبرج یونیورسٹی، فزیکل سوسائٹی لندن، کلکتہ یونیورسٹی، امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس، رائل سوسائٹی لندن اور یونیسکو پیرس سے مختلف ایوارڈ ملے۔ ۱۹۷۹ء میں انہیں آئن سٹائن میڈل اور دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی فزکس میں نوبیل پرائز (Nobel Prize) ملا۔ بنارس یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دے کر اپنا وقار بلند کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی اہم یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جس نے انہیں کوئی اعزازی ڈگری نہ دے کر اپنی اہمیت گھٹائی ہو۔

پروفیسر عبدالسلام ایٹم کا استعمال برائے امن چاہتے تھے۔ امن عالم کی اس خدمت کے لئے انہیں چارلس یونیورسٹی (پراگ) سے پیس میڈل (Peace Medal) ملا۔ کئی بین الاقوامی اداروں نے بھی ان کی امن کی مہم کو کافی سراہا اور انہیں مختلف تنظیموں کی رکنیت بھی عطا کی گئی۔ پروفیسر عبدالسلام نے سائنس کی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے امپیریل کالج لندن میں تھیوریٹیکل فزکس کا محکمہ قائم کیا۔ تھیوریٹیکل فزکس میں انگلینڈ کے بہت سارے لوگوں نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برازیل، گھانا، نائیجیریا، لبنان، ایران، عراق، یونان وغیرہ تیسری دنیا کے تقریباً پچاس لوگوں کو پی ایچ ڈی کرایا وہ اقوام متحدہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مشاورتی کمیٹی کے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ممبر رہے۔ وہ یو۔ این۔ او فاؤنڈنگ کمیٹی برائے یو ان او یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔

فاؤنڈر ڈائریکٹر

پروفیسر عبدالسلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے فاؤنڈر ڈائریکٹر تھے۔ یو این او کا یہ ادارہ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے سے اب تک ۳۶۰۰۰ فزکس کے پروفیسروں کو ریسرچ کی ٹریننگ ملی ہے۔ اس ادارہ سے

فزکس کی تازہ ترین ریسرچ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام نے تھرڈ ورلڈ اکاڈمی آف سائنس قائم کی اور اس کے فاؤنڈر پریذیڈنٹ تھے۔ اس اکاڈمی کو چلانے کے لئے انہوں نے سالانہ تقریباً دو ملین ڈالر کا انتظام کیا۔ پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت کے دو پہلو بہت اہم تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ سائنس اور مذہب میں اختلاف ہے۔ سائنس تو فطرت کے رازہائے سربستہ کو سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ کافی مذہبی ہوتے ہوئے بھی سائنس کی دنیا کو آخری دم تک گلے لگائے رہے۔

پروفیسر عبدالسلام تیسری دنیا سے بہت گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغرب، مشرق پر اس لئے غالب ہے کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا لیا ہے۔ مشرق اس لئے پیچھے ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنے دامن میں اب تک سمیٹ نہ سکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایشیا اور افریقہ اپنے دامن کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھرے۔ پھر وہ ضرور خوشحالی کی طرف گامزن ہو گا اور اسے یورپ پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔

پروفیسر عبدالسلام کے خطوط میرے پاس برابر آیا کرتے تھے۔ وہ ہمیں تاکید کیا کرتے تھے کہ میں عوام کے ذہن کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے زیادہ سے زیادہ آمادہ کروں۔ ۱۹۹۱ء میں انہوں نے مجھے (Ideals & Realities) کا تیسرا ایڈیشن بھیجا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے بہت سے لیکچرز کی کاپیاں بھی مجھے بھیجیں جو وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دسویں صدی سے لیکر گیارہویں صدی تک یورپ نے سائنس کے میدان میں مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔

ان کے خطوط میں اکثر عمر خیام کی رباعی اور علامہ اقبال کے اشعار ہوا کرتے جس سے ان کے ادبی ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے۔

پروفیسر عبدالسلام برابر کہا کرتے تھے۔

"انسانی برادری کی بنیاد دو ستون پر قائم ہے ایک علم اور دوسرا رواداری۔ علم کے بغیر رواداری بے اثر ہے اور رواداری کے بغیر علم بیکار ہے۔"

ایک عظیم تحقیقی پروفیسر عبدالسلام ایک عظیم انسان، ایک عظیم سائنس داں اور ایک عظیم محقق تھے۔ ان کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ نوبل پرائز ملنے کے بعد وہ کلکتہ آئے اور اپنے استاد سے ملے جنہوں نے انہیں لاہور میں پڑھایا تھا۔ ان کے استاد جو مذہبی اعتبار سے برہمن تھے بہت خوش ہوئے اور انہیں دعائیں دیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی خدمت میں سب سے بڑا خراج عقیدت ہو گا کہ ہم اپنے دل اور دماغ کو علم اور عقل کی روشنی سے پوری طرح منور کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ٹھوس قدم آگے بڑھائیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق اور کردار پیدا کریں۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی دولت علم ہے اور علم کا صحیح مقصد بنی نوع انسان کی خدمت ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تہذیب الاخلاق علی گڑھ مارچ ۹۷ء صفحہ ۷۸ بحوالہ لاہور ۷ جون ۱۹۹۷ء صفحہ ۱۱)

ایک نابغۂ روزگار وجود

مکرم عطاء المجیب راشد صاحب۔ امام بیت الفضل لندن)

آسمان احمدیت اور دنیائے سائنس کے ایک روشن ستارے محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم و مغفور کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی خدمات اور کامیابیوں پر کوئی تبصرہ کرنا تو میرے بس کی بات نہیں لیکن قارئین کو اس لطف میں شریک کرنا چاہتا ہوں جو گذشتہ دنوں ایک مضمون پڑھتے ہوئے اس عاجز کے حصہ میں آیا۔ مشہور سائنسی رسالہ Current Science جلد ۷۲ نمبر۱۱ مجریہ ۱۰ جون ۱۹۹۷ء میں شعبہ طبیعات 'گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر (انڈیا) میں H.S.Virk کے قلم سے ایک جامع مضمون شائع ہوا جس میں سائنس دان مذکور نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی گرانقدر بے لوث خدمات اور تحقیقات پر شاندار خراج تحسین پیش کرنے کے بعد آخر میں بطور خلاصہ یہ فقرہ لکھا اور اس پر اپنے مضمون کا اختتام کیا۔

If Trieste has become a Mecca for Third World Scientiss over the years since its creation in 1964. Abdus Salam, Nobel Laureate and a genius from Punjab was destined to play the role of a prophet of Third World scientist. May the mercy of Allah be on His servant!

امید ہے قارئین کرام نے بھی اس جامع تبصرہ سے خوب حظ اٹھایا ہوگا۔ سائنسی دنیا سے ہٹ کر' پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ایک بہت ہی عاجز بے ریا اور دنیاوی وجاہتوں سے بے نیاز موحد انسان تھے۔ مجھے لندن میں ان سے کئی بار "بیت" الفضل لندن میں یا دیگر مقامات پر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار میرا یہ تاثر پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا گیا اور دل میں اس عظیم انسان کی عظمت بڑھتی چلی گئی۔

۱۹۷۰ء۔۱۹۷۳ء کے قیام لندن میں ان سے ابتدائی تعارف ہوا۔ کئی بار حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ساتھ اکٹھے بیٹھنے کا موقع ملا۔ ایسے مواقع پر ان بزرگوں کی علمی دینی گفتگو بہت پر لطف اور مفید ہوتی تھی۔

غالباً ۱۹۸۲ء کی بات ہے نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد جب کہ آپ کی شہرت عروج پر تھی آپ جاپان تشریف لائے۔ میں بطور مربی وہاں مقیم تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ نے پروفیسر عبدالسلام صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ مجھے بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خواہش کا بھی بہت دخل تھا) بہرحال میں ناگویا سے ٹوکیو حاضر ہو کر اس تقریب میں شامل ہوا۔ پاکستانی کمیونٹی کے سرکردہ احباب سے ہال بھرا ہوا تھا۔ اکثر احمدیت کے حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو سفیر پاکستان نے ایک ایک کر کے سب لوگوں کا تعارف کروانا شروع کیا۔ میری باری آئی تو سفیر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ان کے تعارف کی تو ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس عاجز کو معانقہ کا شرف بخشا اور پھر سارا وقت اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے اس انداز سے محبت و شفقت کے علاوہ ان کی جرات اور عظمت کا بھی خوب پتہ چلتا ہے جو لوگ مجھ سے پہلے واقف نہ بھی تھے وہ بھی خوب واقف بن گئے اور یہ سب احمدیت کی برکت سے ہوا۔

باتیں تو اور بھی ہیں لیکن ایک آخری بات لکھ کر اس نوٹ کو ختم کرتا ہوں۔ یہ بات ایک تاریخی امانت بھی ہے جس کا غالباً ہمارے

بقیہ صفحہ 151 پر

ع اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

ڈاکٹر عبدالسلام کی رحلت ــ ایک قومی المیہ

(جناب ڈاکٹر منیر احمد خان صاحب سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)

"ڈاکٹر عبدالسلام کے اپنے ملک نے ان کے ساتھ بے انصافی اور تعصب کا برتاؤ کیا لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے شدید محبت کرتے تھے۔"

بہت کم پاکستانیوں نے پروفیسر عبدالسلام کی طرح پاکستان کا وقار بڑھایا ہے۔ وہ نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے سائنس دان تھے بلکہ شاید اس صدی کے دوران مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے عظیم ترین سائنسدان بھی تھے۔

جب وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھے تو ان کی صحت جواب دے گئی اور وہ اپنی مسلسل محنت اور انہماک کے ثمرات سے لطف اندوز نہ ہوسکے۔ وہ نئے سائنسی مفروضوں پر کام کر رہے تھے اور انہیں دوسری مرتبہ نوبل پرائز ملنے کے امکانات تھے۔

عالمی شہرت کے حامل سائنسدان ہونے کے علاوہ وہ ایک تخیل پرست، محب وطن، اپنی سرزمین کے خادم اور سب سے بڑھ کر ایک منکسرالمزاج انسان تھے۔ سائنس کی سرحدوں میں وسعت پیدا کرنے میں ان کی کامیابی نے ان کی منکسرالمزاجی میں مزید اضافہ کیا اور ہم وطنوں کے ساتھ ان کا رشتہ مزید گہرا ہوگیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان میں ہزاروں اعلیٰ تربیت یافتہ سائنس دان چھوڑے ہیں جو اکیسویں صدی میں ان کے مشن کو جاری رکھیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ہمارے لئے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کے لئے بہت کچھ کیا لیکن ہمارے پاس ان کا قرض چکانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

عبدالسلام سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں کالج میں ہوئی۔ ہم ایک ہی کالج کے طالب علم تھے۔ پھر ہم پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے عمومی جدوجہد میں شامل ہوگئے اور دوست بن گئے۔ وہ یونیورسٹی امتحانات میں ہندوؤں کے قائم کردہ تمام ریکارڈ توڑ کر پہلے ہی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ انہوں نے نہ صرف امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی بلکہ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ بیک وقت گورنمنٹ کالج یونین کے صدر اور کالج مجلہ "راوی" کے مدیر بھی تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں کیمبرج چلے گئے اور ان کے واپس آنے سے پہلے میں ۱۹۵۱ء میں امریکہ چلا گیا لیکن ہمارا رابطہ بحال رہا خصوصی طور پر جب ۱۹۵۸ء میں میری انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن میں شمولیت کے بعد ان سے رابطہ مضبوط ہوگیا۔

۱۹۶۰ء میں ایک دن وہ ویانا میں میرے دفتر میں آئے اور کہا کہ کیوں نہ "آئی اے ای اے" کے تحت تھیوریٹیکل فزکس کا ایک سنٹر قائم کیا جائے۔ اس کے اخراجات نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ صرف سٹیشنری کا خرچہ آئے گا اور فائدہ یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب کے سائنس دان اپنی تنہائی چھوڑ کر ایک دوسرے سے مل بیٹھیں گے۔

خصوصی طور پر ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان جو سائنس کی دنیا کے ساتھ اپنے رابطے ختم کرتے جا رہے ہیں۔ جب میں نے "آئی اے ای اے" کے شعبہ تحقیق کے سربراہ سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لئے وقت مانگا تو ان کا کہنا تھا "یہ ڈاکٹر عبدالسلام کون ہیں؟" جب انہیں بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب رائل سوسائٹی کے کم عمر ترین رکن ہیں تو ان کا لہجہ بدل گیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر سلیگ مان دوست بن گئے لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر سلیگ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔

انہوں نے "آئی اے ای اے" کے عام اجلاس میں "انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس" قائم کرنے کی تجویز پیش کی لیکن ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے اس کی بہت مخالفت کی گئی۔ "آئی اے ای اے" کی سائنسی مشاورت کمیٹی جس میں نوبل انعام یافتہ ربی اور ھومی بھابا شامل تھے، نے اس کی شدید مخالفت کی۔ نجی طور پر بھابا یہ سنٹر بمبئی میں بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے عبدالسلام سے مدد کی درخواست بھی کی۔ عبدالسلام نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ انہوں نے تمام دنیا کے سائنس دانوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں نوبل انعام یافتہ ہانس بیتھ بھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ ڈاکٹر عبدالسلام کی بہت قدر کرتے تھے۔ آخرکار "آئی اے ای اے" نے اپنی مشاورتی کمیٹی کی مخالفت کو رد کرتے ہوئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی۔ ڈاکٹر عبدالسلام چاہتے تھے کہ یہ منصوبہ پاکستان میں شروع ہو۔ اس کے لئے عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کے لئے انہوں نے ایوب خان سے ۱۰ لاکھ ڈالر کا مطالبہ کیا لیکن انہیں یہ منصوبہ پسند نہیں آیا اور پاکستانی حکومت نے اسے رد کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اٹلی کی پیشکش قبول کر لی لیکن انہوں نے اس کی ایک شاخ اسلام آباد میں کھولنے کی کوشش ترک نہ کی کیونکہ وہ پاکستان واپس آکر نوجوان پاکستانیوں کو تربیت دینا چاہتے تھے لیکن ان کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔

تیسری دنیا کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے سائنس سے مدد لینے کا ان کا خواب مفروضوں کی سطح سے آگے تھا۔ انہوں نے اپنے ادارے میں محض نظریاتی تحقیق نہیں کی بلکہ کمپیوٹر، الیکٹرانک، کیمسٹری، انرجی کے موضوعات پر اجلاس منعقد کئے بلکہ ان کے لئے متعلقہ ادارے بھی قائم کئے۔ انہوں نے ترقی پذیر ممالک کو اکیسویں صدی میں سائنس کے کردار کا احساس دلایا۔ انہوں نے لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے کئی صدور اور وزرائے اعظم کو سائنس کو پہلی ترجیح دینے پر قائل کیا لیکن پاکستان کے ضمن میں وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ وہ اعلیٰ تکنیکی ادارے، ایم آئی ٹی قسم کی یونیورسٹیاں اور سائنس کے لئے دوسرے عمومی ڈھانچے تعمیر کرنے کے لئے پاکستان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ناکامی سے دوچار ہوتے رہے۔ یہ ایک عظیم المیہ اور ہمارے منصوبہ سازوں اور سیاست دانوں کی ناکامی ہے کہ ہم اپنی بقا اور مستقبل کے لئے سائنس کی اہمیت کا ادراک نہیں کر سکے۔

سائنس کی دنیا کے لئے عبدالسلام ہمارا دریچہ تھا کیونکہ تمام دنیا کے عظیم ترین سائنس دان ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے اعلیٰ ترین تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تیسری دنیا کے سیاست دانوں کو مواقع مہیا کئے۔ تھیوریٹیکل فزکس میں ان کی نمایاں خدمات کے علاوہ جس کے لئے انہیں نوبل انعام ملا، ان کا سب سے بڑا ورثہ یہ ہے کہ انہوں نے تیسری دنیا کے لئے سائنس دانوں کی ایک کثیر تعداد کو تربیت دی۔

پروفیسر عبدالسلام نے پاکستان میں سائنس کی ترقی کے لئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اور ۱۴ سال تک "پی اے ای سی" کے رکن رہے۔ وہ اس کے قیام ہی سے اس کی راہنمائی کرتے رہے۔ انہوں نے ہی اس کے لئے عمارت تعمیر کرنے کے مقام کا تعین کیا اور حکومت کو قائل کیا کہ وہ سائنس دانوں کو تربیت دے، انہیں بیرون ملک بھیجے۔ انہوں نے نئے سائنس دانوں کو یونیورسٹیوں اور

لیبارٹریوں میں جگہ دلوائی۔ انہوں نے پاکستان میں سیم و تھور کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے ایوب خان کو امریکہ سے مدد لینے کا مشورہ دیا جس کے بعد ریوے مشن قائم ہوا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مجھے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ نیوکلیئر فیول پروسیسنگ کے قیام کے لئے تجاویز تیار کرنے کا موقع ملا۔ ایوب خان نے معاشی بنیادوں پر اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ اس طرح تیس برس قبل پاکستان نے اس اہم ترین ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔ جب وہ انتہائی سستی قیمت پر بلا روک وٹوک حاصل ہو سکتی تھی۔

جب ۱۹۷۹ء میں انہوں نے نوبل انعام وصول کیا تو اس کے فوراً بعد اندرا گاندھی نے انہیں بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سب سے پہلے پاکستان جانا چاہتے ہیں اور انہوں نے ریاست کے مہمان کی حیثیت سے پاکستان کا دورہ کیا۔ کئی ممالک کے سربراہان کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات تھے اور وہ سب ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چین کے دورہ کے دوران مجھے بتایا گیا کہ چینی اکیڈمی نے ان کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا ہے۔ جس میں وزیر اعظم شریک ہوں گے لیکن تمام تر پروٹوکول کو توڑتے ہوئے چین کے صدر نے بھی اس ڈنر میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام سے میری آخری ملاقات محض تین ماہ پہلے ہوئی۔ ان کی بیماری اپنا کام دکھا چکی تھی اور وہ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ لیکن وہ میری باتوں کو سمجھتے تھے۔ میں نے ان کی سترویں سالگرہ کی پاکستان میں ہونے والی تقریبات کے متعلق انہیں بتایا۔ وہ مجھے دیکھتے رہے۔ وہ توصیف سے بالاتر ہو چکے تھے۔ جب میں جانے کے لئے اٹھا تو انہوں نے میرا ہاتھ نرمی سے دبا کر اپنی کیفیات کا اظہار کیا جیسے کہ وہ ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہوں جنہوں نے ان کے متعلق کلمات ادا کئے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے اپنے ملک نے ان کے ساتھ بے انصافی اور تعصب کا برتاؤ کیا لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے شدید محبت کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے پاکستان آنا مشکل سے مشکل تر ہو تا گیا۔ اب وہ پاکستان آ چکے ہیں اور اس مٹی میں دفن ہو چکے ہیں جس سے انہوں نے ہمیشہ انتہائی محبت کی۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم اس قابل ہو جائیں کہ تعصب سے بالاتر ہو کر انہیں تسلیم کریں اور ان کی موت کے بعد انہیں وہ کچھ دے سکیں جو ان کی زندگی میں ان کا حق تھا۔" (روزنامہ "آجکل" لاہور ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء)

بقیہ از صفحہ 147

لٹریچر میں اس سے قبل ذکر نہیں آسکا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء کا دن تاریخ احمدیت کا ایک اہم دن ہے۔ اس روز حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز پاکستان سے ہجرت فرما کر لندن ورود فرما ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو حضور انور نے "بیت" فضل لندن میں ملحقہ محمود ہال میں ایک تاریخی اور جلالی خطاب فرمایا تھا۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام صاحب حضور انور کے سامنے صف اول میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور انور نے خطاب کے آخر میں فرمایا کہ چونکہ بہت زیادہ کام کرنے والے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ پوری یکسوئی سے ساری طاقتوں کو ان کاموں کے لئے وقف کر دوں اس لئے کوئی دوست مجھ سے ملاقات کی درخواست یا خواہش نہ کریں جس کی مجھے ضرورت ہو گی اس شخص کو میں خود ملاقات کے لئے بلاؤں گا۔ پر سوز دعا پر تقریب کا اختتام ہوا۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو یہ تاریخی اعزاز نصیب ہوا کہ جس شخص کو حضور انور نے از خود ملاقات کے لئے سب سے پہلے دعوت دی وہ یہی فرزند احمدیت تھا۔ حضور انور نے تقریر کے بعد اٹھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ڈاکٹر صاحب آپ ملاقات کے لئے میرے دفتر میں تشریف لے آئیں"

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات بلند فرمائے اور علمی میدانوں میں برتری کا جو علم آپ نے بڑی شان سے اٹھائے رکھا اللہ تعالیٰ فرزندان احمدیت کو توفیق دیتا چلا جائے۔ کہ وہ اسے ہمیشہ سربلند رکھیں۔ آمین

نوبل انعام یافتہ سائنسدان و مظہرِ الہام
حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے لئے
دُعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ کے درجات
کو بلند فرمائے اور آپ کو اعلیٰ و ارفع
مقام عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ ڈرگ روڈ کراچی

"میرے فرقہ کے لوگ علم و معرفت
میں کمال حاصل کریں گے۔"
ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام کی یاد میں
جن کی وفات نہ صرف طبعیات بلکہ دُنیا اور
بالخصوص تیسری دُنیا کے لئے ایک
ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ ملیر کراچی

ع تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

میرا دوست — میرا حبیب

(سابق چیف آف ایئر سٹاف ایئر مارشل (ر) مکرم ظفر چوہدری صاحب — لاہور)

اعلیٰ سائنس کی سنگلاخ زمین میں ڈاکٹر سلام کے کارہائے نمایاں سے متعلق کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ میں چند مختصر باتیں ان کی شخصیت متعلق عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

میری ان سے شناسائی ۱۹۴۲ء میں ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر میں داخل ہوئے۔ اس سے قبل وہ پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور ایف۔ اے کے امتحانوں میں نئے ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ اس وقت کا عبدالسلام ایک شرمیلا سا لڑکا تھا جو اپنے کام سے کام رکھتا۔ کبھی کبھی وہ یہ انتظام کرلیتا کہ جب وہ پڑھائی میں مصروف ہو تو ہاسٹل کے کمرے کو باہر سے تالا یا کنڈی لگادی جائے تاکہ یار دوست بلاوجہ اس کا وقت ضائع نہ کریں۔ اس کی تفریح فقط شطرنج کی دو ایک بازیاں ہوتیں جو وہ کامن روم کے مارکر خوشیا سے کھیلتا۔ اس زمانے میں نیو ہاسٹل میں باورچی محمد دین دونوں وقت نہایت لذیذ آلو گوشت پکایا کرتے تھے جو کہ عبدالسلام کو بہت مرغوب تھا اور وہ خوب سیر ہو کر کھاتے۔ ان کے بے تکلف دوست ان کی پرخوری پر انہیں مذاق بھی کرتے لیکن وہ کبھی برا نہ مانتے۔

۱۹۴۶ء میں عبدالسلام ریاضی میں Tripos حاصل کرنے کیلئے کیمبرج چلے گئے۔ کبھی کبھار وہ لندن آتے تو میری ان سے ملاقات ہوتی۔ ان کا لباس حد درجہ سادہ ہوتا اور وہ اکثر ایک بڑی سی روسی ٹوپی اور rain coat پہنے رہتے۔ فارغ وقت کھیل تماشے کی بجائے لندن میں مختلف Museums میں گزارتے اور ہم کھلنڈروں کو بھی ساتھ گھسیٹ لیتے۔ ان کی طبیعت بہت سادہ اور ہر قسم کے تکلفات سے مبرا تھی۔ ایک مرتبہ ہم بس میں سفر کر رہے تھے اور انہوں نے کچھ لکھنے کیلئے قلم جیب سے نکالا جس کی سیاہی کچھ Leak کر گئی تھی۔ انہوں نے فالتو سیاہی بلا تکلف اپنے سر کے بالوں سے پونچھ دی۔ میں نے جب کچھ حیرانی کا اظہار کیا تو کہا "بھئی اس میں کیا حرج ہے۔ سیاہی بھی کالی ہے اور سر کے بال بھی کالے ہیں۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

کیمبرج سے واپسی پر وہ گورنمنٹ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ میں ایک مرتبہ کالج آیا تو ان سے سٹاف روم میں ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ میرا بہت سا وقت محکمہ تعلیم کے فضول اعتراضات کا جواب دینے میں گزر جاتا ہے اور ساتھ ہی مجھ نابلد کو زبردستی کالج کی فٹ بال ٹیم کا نگران مقرر کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں میں کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکتا۔ سوچتا ہوں کہ دوبارہ کیمبرج جاکر کچھ تحقیق کا کام کروں۔ چنانچہ وہ کیمبرج چلے گئے اور وہ کام صرف چند ماہ میں مکمل کر لیا جو دوسرے برسوں میں کرپاتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں مجھے Mr. Ian Stephens نے کیمبرج مدعو کیا جہاں وہ Kings College میں Dean تھے۔ وہ ہندوستان میں Statesman اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور ایک کتاب پاکستان کے متعلق بھی لکھ چکے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ پاکستان سے ایک شخص یہاں آیا ہوا ہے جس کے متعلق کیمبرج کے اساتذہ سمجھتے ہیں کہ وہ سائنس کی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کرے گا۔ اس کا نام عبدالسلام ہے اور وہ تمام وقت اپنی دھن میں مگن رہتا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کیمبرج کے اساتذہ کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو ۱۹۵۷ء میں

Imperial College of Science and Technology

میں فزکس کے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ برس تھی اور اتنی کم عمر میں آج تک کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوا تھا۔ اس طرح انہوں نے لندن کے Putney نامی علاقے میں ایک مکان میں رہائش اختیار کرلی اور آخر دم تک اسی گھر میں مقیم رہے۔ ۱۹۵۸ء میں میری بیوی کو چھوٹے بچے کے علاج کے سلسلہ میں چند ہفتے لندن میں رہنا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے ہاں قیام کر سکتے ہیں۔ ان کا جواب تھا "یار اے وی کوئی پچھن والی گل اے۔

"They would be most welcome"

ایک مرتبہ میرا چھوٹا بھائی اور میں صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب کے گھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی قدر پریشانی میں بتایا کہ انہیں کالج پہنچنا ہے اور ان کی کار بیٹری کمزور ہونے کی وجہ سے سٹارٹ نہیں ہو رہی میرے بھائی نے کہا کہ اگر صرف یہ بات ہے تو غالباً دھکا لگانے سے کار سٹارٹ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر عبدالسلام بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ کیا واقعی اس طرح کار سٹارٹ کی جا سکتی ہے۔ میرا بھائی کار میں بیٹھا اور ڈاکٹر سلام اور میں نے کار کو دھکا دیا اور یوں کار سٹارٹ ہو گئی اور یہ مشکل حل ہو گئی۔ اس طرح ہم پر یہ کھلا کہ ضروری نہیں کہ ایک عظیم سائنسدان روز مرہ کے معمولی ٹوٹکوں سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

ڈاکٹر سلام کا رہن سہن بہت سادہ ہوتا اور گھر میں بیوی بچوں سے ٹھیٹھ پنجابی بولتے۔ ان کے کمرے میں ایک سادہ سا بستر بچھا ہوتا اور ہر طرف کتابیں بکھری ہوتیں۔ سائنس کے علاوہ انہیں انگریزی' فارسی' اردو اور پنجابی ادب سے بھی گہری واقفیت تھی۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور موسیقی کے رموز سے بھی آشنا تھے۔ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کا گہرا مطالعہ تھا اور وہ یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے کہ قرآن حکیم قوانین اور عبادات کی نسبت تحصیل علم، تفکر اور تحقیق پر کہیں زیادہ زور دیتا ہے۔ گویا کہ کہا جا سکتا ہے کہ اس انتہائی ذہین و فطین شخص کا مزاج فلسفی درویشوں جیسا' دل حساس ادیبوں اور شاعروں جیسا اور دماغ ایک بلند نگاہ اور مہم جو سائنسدان کا سا تھا۔

وہ ہر قسم کے تعصب سے آزاد تھے اور تنگ نظری کی ہر شکل کو غلط قرار دیتے۔ ہر معاملہ میں بنی نوع انسان کی بہتری ان کے پیش نظر ہوتی۔ بایں ہمہ ان کے دل میں اسلامی دنیا اور خاص طور پر اپنے وطن پاکستان کے لئے سچی تڑپ تھی اور یہی وجہ تھی کہ باوجود کثیر العیال ہونے اور محدود وسائل رکھنے کے انہوں نے لاکھوں ڈالر کے ملنے والے انعامات میں سے کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا اور ان تمام رقوم سے ایسے ٹرسٹ بنا دیئے جن سے خاص طور پر پاکستانی طلباء اور سائنسدان استفادہ کر سکیں۔ ایسی قربانی اور بے لوث حب الوطنی کی مثالیں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ مختلف ترقی یافتہ ممالک نے انہیں اپنی شہریت پیش کی اور امداد کا وعدہ کیا جب کہ ان کے اپنے بدنصیب ملک نے ان سے اکثر و بیشتر سرد مہری اور سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ اس جاہلانہ تنگ نظری کی ایک مثال یہ ہے کہ نوبل پرائز ملنے کے موقع پر جو تقریر انہوں نے کی پاکستانی ٹیلی ویژن اور اخبارات نے اسے رپورٹ کرتے ہوئے وہ حصے کاٹ دیئے جن میں کہ قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا تھا۔ لیکن اس خدا کے بندے نے تمام غیر ملکی پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے آخر دم تک پاکستان کے سبز رنگے پاسپورٹ کو سینے سے لگائے رکھا۔ سچ ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔

ڈاکٹر سلام تیسری دنیا کی اور خاص طور پر اسلامی دنیا کی پسماندگی پر بہت رنجیدہ ہوتے تھے حتی کہ وہ پسماندگی اور غربت کو کفر کی ایک قسم قرار دیتے اور اس کا ذمہ دار کسی دوسرے کو ٹھہرانے کی بجائے یہ سمجھتے تھے کہ اس کی اصل وجہ ہمارا علم اور سائنس کو نظرانداز کرنا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ سائنس اور تحقیق سے نہ صرف ذہن آزاد ہوتا ہے اور علم و دانش ترقی کرتے ہیں بلکہ ان کا صنعت و حرفت اور رہن سہن پر فوری خوشگوار اثر پڑتا ہے اور غربت اور پسماندگی کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی تمام عمر اس کوشش میں صرف ہوئی کہ ہم سائنس کی اہمیت کو سمجھیں اور اسے قومی ترجیحات میں صحیح درجہ دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سائنس کے لئے زیادہ وسائل مہیا کیے جائیں اور سائنسدانوں کو معاشرے میں مناسب مقام حاصل ہو۔ ایک مرتبہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام اسلامی ممالک' جن میں کچھ بہت امیر بھی ہیں اپنی پیداوار کا ایک فیصد سائنس اور تحقیق کیلئے مختص کر دیں تاکہ اعلیٰ تحقیقی ادارے قائم ہو سکیں اور کچھ علمی کام ہو۔ انہوں نے یقین دلایا کہ اس طرح اسلامی دنیا کا نقشہ بدل جائے گا اور

ایک دفعہ پھر وہ علم و فن کا گہوارہ بن جائے گی اور دوسرے اس سے استفادہ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ تمام ممالک نے اتفاق کیا اور مقررہ شرح کے مطابق وسائل مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن الا ماشاء اللہ کسی نے بھی وعدہ پورا کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ افسوس کہ ڈاکٹر سلام کی دردمندانہ اور حق آشنا اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی اور مسلمان ملکوں کی حالت میں کوئی قابل قدر بہتری نہ ہو سکی۔ حتی کہ ان کا وجود اور ان کی بقا بھی دوسروں کے رحم و کرم پر موقوف چلے آتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر سلام چاہتے تھے کہ وہ بین الاقوامی ادارہ جو بالاخر اٹلی میں قائم ہوا پاکستان میں قائم کیا جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش بھی ہماری حکومتوں کے بے اعتنائی کی نظر ہو گئی اور آج جو ناگفتہ بہ حالت سائنس اور علم کی ہمارے ملک میں نظر آتی ہے وہ یقیناً ہم سب کے لئے دکھ اور شرمندگی کا باعث ہے۔

چند برس ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام گرمیوں کے موسم میں دہلی جاتے ہوئے لاہور ٹھہرے۔ روانگی کے لئے تیار ہو کر آئے تو کوٹ پتلون کے اوپر rain coat پہنا ہوا تھا۔ میں نے ازراہ تفنن پوچھا کہ کیا دہلی میں برف باری ہو رہی ہے جو اس کی تیاری کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنا مخصوص قہقہ بلند کیا اور کہا

"بھئی بات یہ ہے کہ اس کوٹ نے ایک طویل عرصہ میرے ساتھ وفا کی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ سفر میں یہ کہیں کھو جائے۔ اس لئے میں اسکی حفاظت کے لئے اسے گرمی سردی میں پہن ہی لیتا ہوں۔"

یہ انتہائی سادہ سوچ اس شخص کی تھی کہ جب اس نے کیمبرج میں اپنے استاد سے اپنے کام کے متعلق سرٹیفکیٹ مانگا تو استاد نے کہا کہ بہتر ہو گا کہ تم مجھے سند دو کہ تم نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام سے میری آخری ملاقات کوئی تین سال قبل ان کے بیٹے کے نکاح کے موقع پر ہوئی۔ وہ اپنی Wheel Chair میں بیٹھے کھوئے کھوئے نظر آ رہے تھے۔ میں قریب آکر بیٹھا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کالج کا زمانہ یاد کرنے لگے۔ ان کی بات بڑی مشکل سے سمجھ آتی اور میں اندازے سے جواب دیتا رہا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ شخص جو اپنے لطیف نکات اور زور خطابت سے دنیا کے ممتاز دانشوروں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اب کل من علیہا فان کی منزل کی طرف محو سفر تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس نے حکومت پاکستان کے علاج کیلئے پیش کش کا یہ جواب دیا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ اپنے ملک کے غریب لوگوں کی کمائی سے جمع شدہ پیسے کو اپنی ذات پر خرچ کروں اور اب وہ نابغہ روزگار شخص اسی چٹیل اور شور زمین میں ابدی نیند سو رہا ہے جس نے کہ اسے جنم دیا تھا۔ سچ ہے باقی رہے نام اللہ کا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے!
کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بھری بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر خدا سے دعا

جمعرات 21 نومبر 1996ء کو سائنس کی دنیا سے وہ شخص رحلت کر گیا جس نے نظریۂ اضافیت کے خالق آئن سٹائن کی فزکس کی دریافتوں میں توسیع کی اور "یونی فیکیشن آف فورسز" کا نظریہ پیش کر کے 1979ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ یہ ڈاکٹر عبدالسلام تھے جو پاکستان کے معروف لیکن دورافتادہ شہر جھنگ میں ایک اقلیتی فرقے میں پیدا ہوئے لیکن سائنس کی دنیا میں اتنے معروف ہوئے کہ اب ان کا نام نیوٹن، آئن سٹائن، سٹیون وائن برگ، سڈنی گلاسگو جیسے مغربی سائنس دانوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہیں تیسری دنیا کے ان معدودے چند طبقات کے ماہرین میں بلند مقام دیا گیا جن کی دریافتوں سے نہ صرف انسانی زندگی کو ارتقاء کا اگلا قدم اٹھانے کا موقع ملا بلکہ کائنات کی تشکیل اور زندگی کو برقرار رکھنے والی قوتوں کی بازیافت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ڈاکٹر عبدالسلام 29 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد جھنگ میں ایک معمولی کلرک تھے۔ اس دور میں بجلی کے قمقمے صرف لاہور جیسے بڑے شہروں کو منور کرتے تھے۔ عبدالسلام مٹی کے تیل کے چراغ پر اپنی نصابی کتب پڑھتے۔ لیکن اس غریب طالبعلم کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے میٹرک سے لے کر ایم اے تک جو امتحان بھی دیا اس میں نہ صرف کامیابی حاصل کی بلکہ سابقہ ریکارڈ توڑ کر نئے ریکارڈ قائم کئے۔ ان کی کامیابیوں کا گوشوارہ کچھ یوں ہے۔

ایف اے: 600 نمبروں میں سے 555 نمبر حاصل کئے۔

بی اے: 500 نمبروں میں سے 451 نمبر حاصل کئے۔

ایم اے (ریاضی): 600 میں سے 573 نمبر پائے۔

وہ کیمبرج یونیورسٹی لندن میں گئے تو ریاضی کی ڈگری تین سال کے بجائے دو سال میں اور فزکس کی ڈگری تین سال کے بجائے ایک سال میں حاصل کی۔ فزکس کی گتھی جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی، صرف 5 ماہ میں سلجھائی۔ اس کیلئے بالعموم پانچ برس صرف کئے جاتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام فزکس میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالبعلموں کو فزکس کی تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ان کی تدریسی خدمات سے استفادہ کرنے کے بجائے کالج حکام نے انہیں ضابطے کی کارروائیوں میں الجھا دیا۔ ایک فرض انہیں یہ بھی تفویض کیا گیا کہ شام کو کھیلوں کی نگرانی کریں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب طلبہ کو "نظریۂ اضافیت"

گفتنی

انور سدید
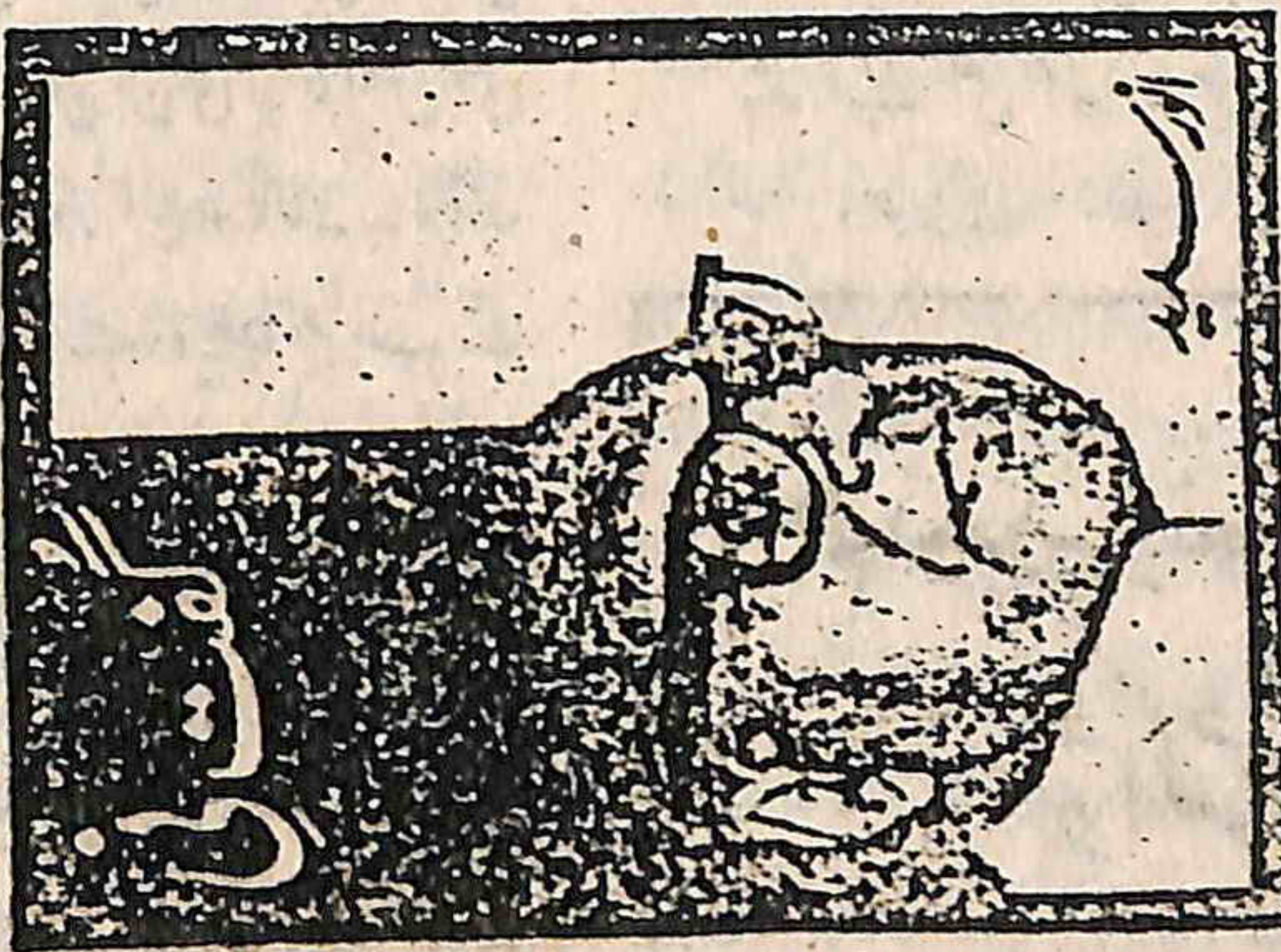
(Theory of Relativity) پڑھانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شام کی "مفت کلاسوں" کا اجراء کیا۔ ابتداء میں خاصی بڑی تعداد میں طالبعلم آئے لیکن آخر میں جب صرف دو رہ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اصل حقیقت کو پالیا کہ اس ملک کی فضا جدید علوم کیلئے سازگار نہیں، چنانچہ وہ کیمبرج واپس چلے گئے۔

10 دسمبر 1979ء کو جب انہیں نوبل انعام دیا گیا تو انہیں ایک عالمی شہرت کے پاکستانی سائنس دان کی حیثیت مل چکی تھی لیکن ان کے اندر کا انسان مطمئن نہیں تھا۔ انہیں یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ ان کا ملک تیسری دنیا کا ایک پسماندہ ملک تھا۔ چنانچہ جب صدر ایوب نے 1960ء میں انہیں اپنا سائنسی مشیر مقرر کیا تو انہوں نے اس سے انکار نہ کیا اور پاکستان کے اٹامک انرجی کمیشن کراچی، نیوکلیئر پلانٹ اور اپلائیڈ فزکس کے متعدد اداروں کی تعمیر و تشکیل میں معاونت کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ٹریسٹی کے مقام پر انٹرنیشنل سنٹر آف تھیوریٹیکل فزکس کا قیام تھا۔ یہ سائنسی مرکز تیسری دنیا کے سائنس دانوں اور طلبہ کو عالمی سطح کے سائنس دانوں سے تعلیم حاصل کرنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کا موقع فراہم کرتا ہے۔ 1964ء سے لے کر اب تک چالیس ہزار سے زیادہ سائنس دان اس سنٹر سے استفادہ کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد بھی جاری رہے گا۔ بلاشبہ ٹریسٹی سنٹر نے اور خود ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان میں سائنسی فروغ کیلئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی دریافتوں سے سائنسی دنیا کے نقشے میں پاکستان کا نام منور ہوا ہے، اسے سربلندی ملی ہے۔ میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ایک طرف پاکستان کرپشن کی افراط کی وجہ سے پوری دنیا میں ذلت اور رسوائی کا شکار ہے اور اب ہمارے سیاستدان اور بیوروکریٹ احتساب کا سامنا کرنے والے ہیں، لیکن دوسری طرف ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان کو اپنی سائنسی دریافتوں سے باعزت اور باوقار بنا دیا۔ جب یہاں لوگ محل بنانے میں مصروف تھے تو ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے عالمی ایوارڈوں سے حاصل ہونے والی ساری دولت عوام کیلئے وقف کر دی اور عالمی سطح کے سائنسی ادارے قائم کئے۔

ڈاکٹر عبدالسلام سادہ مزاج انسان تھے۔ علم و ادب سے انہیں گہری وابستگی تھی۔ حافظؔ اور اقبالؒ ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ تنہائی کے لمحوں میں وہ اقبالؒ پڑھتے تو ان کے فلسفۂ حرکت و حرارت کو فزکس کے مطالعے سے اثبات فراہم کرتے اور ان سے مزید جستجوئے علم کا جذبہ حاصل کرتے۔ حافظؔ انہیں اس تجربے سے گزارتے جو قلب پر وارد ہوتا ہے تو کسی اور کائنات کی خبر دیتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک کتاب "آئیڈیل اور ریئلٹی" کے عنوان سے لکھی تھی۔ پاکستان میں اس کتاب کا ترجمہ شہزاد احمد نے کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو مجھے علامہ اقبالؒ کے فلسفہ کے استاد میکٹیگارٹ یاد آئے۔ اقبالؒ اس عیسائی فلسفہ دان کو ایسا صوفی قرار دیتے تھے جسے بشارت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق قادیانی فرقے سے تھا جس سے پاکستان کے عامۃ الناس کو اختلاف ہے۔ وہ اپنے عقیدے پر تا دمِ آخر تک قائم رہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ اللہ کے ایک بڑے انعام سے محروم رہے۔ حکومت نے انہیں حسنِ کارکردگی کا تمغہ، نشانِ امتیاز اور ستارۂ پاکستان کے اعزازات پیش کئے۔ ایک عالم نے ان کو تحسین سے نوازا۔ خدا نے ان پر سائنس کی بشارتیں اتاریں۔ ان بشارتوں کی صداقت تجربے سے ثابت ہوئی۔ سائنسی صداقتوں کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر میرے دل سے دعا نکل رہی ہے کہ:

"اے خدا! سائنسی علوم کے چند زاویے ہم جیسے گنہگار مسلمانوں پر بھی منکشف فرما۔

اے خدا! ہمیں جہالت کے سمندر سے نکال۔

اے خدا! اپنا ابرِ کرم ہم پر بھی برسا۔ اس شوریدہ زمین سے کوئی ایسا عبقری پیدا کر... اے خدا! اے خدا!!"

(بشکریہ روزنامہ "خبریں" 27 نومبر 1996ء)

ع ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ہیرو کی موت

"ہم انسانی تاریخ کے اس تاریک دور سے ابھی باہر نہیں نکل سکے"

(روزنامہ "پاکستان" لاہور کی ایک تحریر)

ڈاکٹر عبدالسلام سے زیادہ کسی اور ایشیائی شخصیت کو جدید سائنس کی دنیا میں اتنا احترام حاصل نہیں ہوا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ ۱۹۷۹ء میں ملنے والے طبیعات کے نوبل پرائز سے زیادہ اس امر سے لگانا چاہئے کہ پارٹیکل فزکس میں گزشتہ نصف صدی کے دوران جتنی بھی ترقی ہوئی ہے وہ کسی نہ کسی طور ڈاکٹر صاحب کی مرہون منت ہے۔ یوں ستر برس کی عمر میں لندن میں ڈاکٹر صاحب کی وفات سے ان کے ہم وطنوں کو نہ سہی، سائنس کے عالمی حلقوں کو ضرور نقصان پہنچا ہے اور وہ اپنی ممتاز ترین غیر سفید فام شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یوں کہنا چاہئے کہ ترقی پذیر قوموں کے مفاد کو ضعف پہنچا ہے۔

نظری طبیعات بلاشبہ ڈاکٹر عبدالسلام کی پہلی محبت تھی لیکن گزشتہ تیس پینتیس برسوں سے وہ سائنس دان کے ساتھ عالمی مدبر کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر دلچسپی سائنس کو مغربی حدود سے نکال کر ترقی پذیر ملکوں تک لانے میں تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے دن رات کام کیا ہے اور وہ اس طویل جدوجہد کی یادگار اٹلی میں ٹرائیسٹ کے مقام پر نظری طبیعات کے بین الاقوامی مرکز کی صورت میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ مرکز ۱۹۶۴ء میں یونیسکو اور اطالوی حکومت کی امداد سے بنایا گیا تھا۔ تب سے یہ مرکز ترقی پذیر ملکوں کے سائنس دانوں کو بڑی تعداد میں تربیت اور تحقیق کی سہولتیں باقاعدگی سے بہم پہنچا رہا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہے اور غریب ملکوں کا شاید ہی کوئی قابل ذکر سائنس دان ہو گا کہ جس نے اس مرکز سے فائدہ نہ اٹھایا ہو چنانچہ اعداد و شمار یہ ہیں کہ اب تک اس مرکز سے چالیس ہزار سے زیادہ سائنس دان مستفید ہو چکے ہیں۔

ٹرائیسٹ کا یہ مرکز ترقی پذیر ملکوں میں سائنس کے فروغ کے معاملے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی کومٹمنٹ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی خاص خواہش اور کوشش تھی کہ پاکستان اور اسلامی دنیا میں سائنس کی تحقیق و ترقی کا وہ سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے جو ان کے خیال میں چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں ٹوٹ گیا تھا اور جس کے سبب مسلم دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملے میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

اپنی اس دلچسپی کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اقوام متحدہ کے ایک یونیورسٹی سمپوزیم میں یوں کیا تھا کہ "میں آپ سے پرزور طریقے پر یہ استدعا کرنے آیا ہوں کہ عرب اور اسلامی دنیا کی ایک سائنسی دولت مشترکہ بنائی جائے۔ جس میں تخلیقی علم کو اعلیٰ ترین فوقیت حاصل ہو۔ میں یہ عرض کروں گا کہ ایسا کرنے کے لئے کن اقدام کی ضرورت ہے۔ اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمیں قوموں کی برادری میں ایسا مقام ملے جو ہمارے لئے مناسب بھی ہو اور ہماری عزت نفس کے بھی مطابق ہو"۔

ایک اور موقعہ پر پاکستان پلاننگ کمیشن کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کی تھی

"کہ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے، مسلم امت سائنس کے شاندار ماضی کی حامل ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ حال سائنس کے سلسلے میں اس قدر شاندار نہیں ہے۔ اس کرہ ارض پر جس قدر بھی تمدن ہیں ان میں سے اسلامی ممالک میں یہ سائنس کمزور ترین ہے۔ اس حوالے سے کسی کو بھی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ برصغیر ہندوپاک میں علم قومیت تاریخ کے کسی بھی عہد میں سائنس کے معاملے میں مضبوط

نہیں تھی چنانچہ اس سلسلے میں ایک بھی نام ایسا نہیں ہے جو ہم ساری افغان اور مغل تاریخ میں بطور عالمی سطح کے سائنس دان کے لے سکتے ہوں۔ صرف البیرونی ہی ایک استثناء ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب ہندوستان آیا تھا۔ ہمارے حکمران اور ان کی فوجی حکومتیں اس معاملے میں دلچسپی رکھتی ہی نہیں ہیں کہ علوم اور سائنس کے کوئی ادارے قائم کئے جائیں۔ ان کی دلچسپی محض اس قدر تھی کہ وہ اپنے لئے شاندار مقبرے بنائیں تاکہ وہ ان کی عظیم مملکتوں کی یادگار بن جائیں۔ یہ مقام افسوس ہے کہ اسی روایت کو آگے بڑھایا جارہا ہے۔"

میں یہاں ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی کامیابیوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ مجھے ان کے (UNIFYING THEORY) کے فلسفیانہ پہلوؤں سے دلچسپی رہی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے خالص سائنسی حاصلات کی وضاحت کا حق تو ڈاکٹر پرویز ہود بھائی ہی ادا کرسکتے ہیں یا پھر ڈاکٹر انیس عالم' البتہ میں یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں کون کون سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مندرجہ ذیل تین عوامل کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

(1) "ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ سائنسی علم کو ترقی دیں گے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی نہیں ہے کہ سائنس کا اطلاق قومی اقتصادی اور دوسرے مسائل پر ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۷۰ء میں جاپان کے شہنشاہ نے نئے منشور کے تحت پانچ حلف اٹھائے تھے۔ تو ان میں سے ایک حلف یہ تھا کہ "علم جہاں سے بھی ملے گا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے لئے سب ذرائع جو ہمارے پاس ہیں استعمال کئے جائیں گے تاکہ جاپان کو عظمت حاصل ہو سکے" ہم نے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس دانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے اور یہی حال ان مصارف کا ہے جو سائنس پر کئے جارہے ہیں۔

(2) ہمارے ملک میں نوجوان سائنس دانوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی مناسب انتظام نہیں۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ دوسرے ادارے بھی اس معاملے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پاکستان اصل میں کاغذی تحقیقی اداروں کی جنت ہے۔ کوئی ٹھوس کام کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔

(3) کسی پاکستانی حکومت نے قومی سطح پر ٹیکنالوجی کے معاملے میں خود کفیل بننے کی کوشش نہیں کی حتی کہ دفاعی ٹیکنالوجی کو بھی ہم نے نظرانداز کر رکھا ہے۔"

خیر چھوڑئے اس قصے کو کہ یہ بہت طویل ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے ذکر کو آگے بڑھاتے ہوئے میں آپ کی خدمت میں ڈاکٹر صاحب کی وہ تقریر پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء کو نوبل انعام ملنے کی تقریب میں کی تھی۔ سویڈن کے بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"اپنے رفقاء پروفیسر گلاشو اور وائن برگ کی طرف سے میں نوبل فاؤنڈیشن اور رائل اکیڈمی آف سائنسز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری عزت افزائی کی اور ہم پر بعض نوازشات کیں جن میں یہ نوازش بھی شامل ہے کہ مجھے میری قومی زبان میں مخاطب ہونے کی اجازت دیں اس کیلئے پاکستان ممنون ہے"۔

"طبیعات کی تحقیق تمام انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ مشرق اور مغرب' شمال اور جنوب سب نے اس میں مساوی حصہ لیا ہے۔ اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہیں پاؤگے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کہ تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی"۔

"فی الحقیقت تمام ماہرین طبیعات کا یہی ایمان ہے۔ جتنی گہرائی تک ہم تلاش کریں اتنی ہی ہماری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور اسی تناسب سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ میں یہ بات صرف اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں آج شام آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ بات میں خاص طور پر تیسری دنیا کو مخاطب کرکے بھی کہہ رہا ہوں۔ تیسری دنیا والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ سائنسی علم کی جستجو کی بازی ہار چکے ہیں کیونکہ ان کے پاس مواقع اور ذرائع موجود نہیں ہیں۔ (نوبل انعام کا اجراء کرنے والے) الفرڈ نوبل نے یہ پیمان باندھا تھا کہ رنگ و نسل کا کوئی بھی امتیاز اس کی فیاضی کے حصول کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ اس موقع پر میں ان سے مخاطب ہو کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن کو خدا نے یہ عطیہ عطا کیا ہے۔ آیئے ہم سب کو

ایک جیسے مواقع فراہم کرنے کے لئے جدوجہد کریں تاکہ وہ طبیعات اور سائنسی تخلیق میں شامل ہو کر ساری انسانیت کے لئے نئے فوائد حاصل کریں۔ یہ سب کچھ الفرڈ نوبل کی آرزو اور ان خیالات کے مطابق ہوگا جو اس کی زندگی میں نفوذ کر گئے تھے...... اللہ آپ کو نوازے"۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام جب نوبل انعام وصول کرنے گئے تھے تو انہوں نے مکمل پنجابی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شلوار کرتا، شیروانی، پاؤں میں کھسہ اور سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ نوبل انعام کے ساتھ ان کو ساٹھ ہزار ڈالر نقد بھی ملے تھے جو انہوں نے فوراً ہی غریب ملکوں کے سائنس دانوں کی تربیت کے ادارے کو عطیہ کے طور پر دے دیئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اپیل بھی جاری کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ "میں بڑے انکسار کے ساتھ اسلامی ملکوں سے اپیل کرتا ہوں کہ تم میں سے بعض کو اللہ نے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ آپ کی آمدن تقریباً ۶۰ ارب ڈالر کے قریب ہے۔ بین الاقوامی رواج کے مطابق ان ملکوں کو لگ بھگ ایک ارب ڈالر ہر سال سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر خرچ کرنے چاہئیں۔ یہ ان کے آباء و اجداد ہی تھے جنہوں نے آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں صدیوں میں بین الاقوامی سائنسی تحقیق کی شمع روشن رکھی تھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیت الحکمت قائم کئے تھے جو سائنس کے اعلیٰ ادارے تھے۔ ان کے ہاں عرب، ایران، ہندوستان، ترکی، بازنطینی عالموں کا ہجوم تھا۔ ایک بار پھر فیاضانہ رویہ اختیار کیجئے۔ آپ سائنس پر سالانہ ایک ارب ڈالر خرچ کیجئے خواہ دوسرے نہ کریں۔ ایک باصلاحیت فنڈ قائم کیجئے جو سب مسلمان ملکوں کے لئے ہو۔ عرب اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں کے لئے تاکہ کوئی اعلیٰ صلاحیت والا سائنس دان ضائع نہ ہو جائے"۔

یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے ملک سے جو گہری محبت تھی وہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہی حالانکہ ان کے ملک نے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی قدر نہ کی تھی بلکہ ان کے ساتھ اچھوتوں سے بھی برا سلوک کیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹر صاحب کی سائنسی کامیابیوں کے اعتراف میں ان کو اعلیٰ ترین ڈگریوں سے نوازا تھا لیکن پنجاب یونیورسٹی نے ان کی کوئی پذیرائی نہ کی۔ ۲۳ مختلف ملکوں کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹر آف سائنس کی ۳۶ اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے والے ڈاکٹر عبدالسلام نے اسی قدر ناشناس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں استاد بھی رہے تھے۔ پاکستان کی کسی اور یونیورسٹی کو بھی ڈاکٹر صاحب کو بلانے اور ان کی تشریف آوری سے اپنا اعزاز بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ قرون وسطیٰ میں مذہبی اختلاف کے باعث کبھی کبھار کسی جینئس کے ساتھ اس قسم کی بدسلوکی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ ہمارے اس سلوک سے پتہ چلتا ہے کہ ہم انسانی تاریخ کے اس تاریک دور سے ابھی باہر نہیں نکل سکے۔ (روزنامہ "پاکستان" یکم دسمبر ۱۹۹۶ء)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں

ملے تھے اعزاز دنیا بھر سے سلام تجھ کو نگر نگر سے
امام رابع کی شفقتوں کا بڑا تھا اعزاز اپنے گھر سے

رہا سدا تجھ پہ رب کا سایہ، کبھی نہ کبر و غرور آیا
ملے جو تجھ کو مقام عالی نہ چھپ سکیں گے کسی نظر سے

زمانے بھر کی حدوں سے آگے گیا تھا فکر و خیال تیرا
کہ برق و جوہر کی طاقتوں کا ہے ایک کرنا کمال تیرا

یہ ایک نوبل کی بات کیا ہے ابھی تو اور اعتراف ہوں گے
بھلا سکے گی نہ تجھ کو دنیا کبھی نہ ہوگا زوال تیرا

(مکرم ظہور الدین بابر صاحب۔ ایم۔ اے)

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ.....

مکرمہ ڈاکٹر فہمیدہ منیر صاحبہ ربوہ

دور حاضر میں ڈاکٹر عبد السلام کے بارہ میں معلوماتی مواد ڈھیروں کی صورت میں موجود ہے۔ ان کے بارہ میں وہی باتیں بار بار لکھنا وہی معلومات فراہم کرنا جو سب کی لکھی ہوئی ہوں۔ بعض جدت پسند طبائع پر بار بن جاتا ہے اور وہ پڑھنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کے لئے اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے بھی قاصر ہوں کہ میری اس عظیم شخصیت سے ملاقات ہی نہ ہو سکی!!!! میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہوں۔ مگر یہاں میں کیا اور میرے خیالات کیا۔ اس لئے میں نے سوچا ہے ایک حقیقت ایک واقعہ آپ کی نذر کروں کہ کس طرح عظیم شخصیات تعصب کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہی لوگ وقت پڑنے پر کیسی کیسی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ جنہوں نے پہلے کسی ہستی کی حیثیت کو پامال کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام کو ایوارڈ ملنے کے بعد کی بات ہے۔ نہ اخبارات میں اس کا خاطر خواہ چرچا کیا گیا نہ پذیرائی دی گئی نہ پاکستان ٹی وی پر اسبارہ میں کوئی تفصیلی خبر آئی۔ نہ پروگرام ہوا۔ میرے ایک عزیز کزن پی ٹی وی میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان سے اور ان کی اہلیہ سے اسبارہ میں میں نے گلہ شکوہ کیا۔ وہاں کیا اثر ہوا نہیں جانتی۔ کچھ عرصہ خاموشی سے گذر گیا۔ پھر ایک دن ان کا فون آیا کہ

"ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے آپ سے۔ ضرور کر دیجئے۔ ہماری عزت کا سوال ہے۔ مشکل آن پڑی ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے"

بولیں: "ڈاکٹر عبد السلام کی ایک تصویر چاہئے۔ ہم نے کل پروگرام کرنا ہے اور ہمیں ان کی کوئی تصویر مہیا نہیں ہو رہی"

اف ری بے سروسامانی۔ مجھے یہ سوال کرنے والے مجھے بونے لگے اور ڈاکٹر عبد السلام صاحب کا قد میری نظر میں اور بلند اور بلند ہو گیا۔

خیر میں نے وعدہ کر لیا۔ پھر میں تھی اور میری کوشش۔ میں نے رات تک یہ تصویر انہیں مہیا کر دی۔

"یہ ایک نایاب تصویر تھی بندہ بھیج کر انہوں نے منگوائی۔ پروگرام دیکھا اچھا تھا اب تاریخ مجھے یاد نہیں۔ انسانوں کی بے حسی پر رونا آگیا۔ کہ انسانوں کی قدر کرنا بھول گئے ہیں۔

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

لوگوں کا اس طرح انہیں نظر انداز کرنا ان کی قیمت کو کم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کی توقیر کو بڑھاتا ہے۔ اے خدا ہمیں ایسے ہزاروں ہزار عبد السلام عطا فرما۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہوں جو ان کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے کامیابی کی اعلیٰ ترین منازل طے کر جائیں۔ میں ان کی عظمت کی دل کی باریک ترین گہرائیوں سے قائل ہوں۔ خدا کرے ان کے لئے کی گئی دعاؤں کے خزانہ میں ہر آن اضافہ ہوتا رہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میں نے ان کی خاطر ایک چھوٹا سا کام سرانجام دیا اور یہ سارے احساس احمدیت کے رشتہ تلے جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔

شجر سے جو رہے وابستہ وہ پھل دار ہو جائے

ع مسکراتا ہوا چہرہ، تری روشن آنکھیں

چند حسین و دلکش یادیں

(مکرم بشیر احمد خان صاحب رفیق - لندن)

فروری ۱۹۵۹ء میں خاکسار پہلی مرتبہ انگلستان پہنچا۔ محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ان دنوں پٹنی کے علاقہ میں جو بیت الفضل لندن سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے مستقل رہائش پذیر تھے اور امپیریل کالج لندن میں پروفیسر تھے۔ بیت الفضل لندن میں نماز کے لئے آپ تشریف لاتے تو خاکسار کو بھی شرف ملاقات حاصل ہو جاتا۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ اور علمی مقام کے لحاظ سے خاکسار کی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ تھی لیکن محترم ڈاکٹر صاحب بحیثیت مربی جماعت احمدیہ کے خاکسار سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور گاہے گاہے اپنے دولت کدہ پر خاکسار کو مدعو بھی فرماتے تھے۔ عام طور پر آپ اپنے دوستوں کو اتوار کے روز ناشتہ کے لئے دعوت دیتے تھے۔ کھانے کی میز انواع و اقسام کی ڈشز سے بھری ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست اور مداح نہ صرف ناشتہ سے لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ ان کی علمی گفتگو' حالات حاضرہ پر تبصرے اور شعر و شاعری میں ان کے اعلیٰ مذاق سے بھی حظ اٹھاتے بعد میں جب حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کی تو ڈاکٹر صاحب کا معمول ہو گیا کہ جب بھی لندن میں ہوتے اتوار کے ناشتہ پر حضرت چوہدری صاحب کو ضرور بلاتے۔ خاکسار بھی اکثر ان مجالس میں شامل ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے سائنسی علوم کی نعمت سے تو مالامال کیا ہی تھا اس کے ساتھ ہی آپ کو شعر و شاعری' اردو اور انگریزی ادب اور تاریخ کے علم سے بھی وافر حصہ دیا تھا۔ فارسی شعراء میں حافظ آپ کے پسندیدہ شاعر تھے اور حافظ کے سینکڑوں اشعار آپ کو ازبر تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے حافظ کے اشعار سنانا آپ کو لطف دیتا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منظوم کلام کا بھی آپ نے بلاستیعاب مطالعہ کیا ہوا تھا اور اکثر حضور علیہ السلام کے فارسی اور اردو اشعار موقع کی مناسبت سے سناتے تھے۔ حضرت چوہدری صاحب کو بھی فارسی شعراء میں سے حافظ کے ساتھ عشق تھا۔ اس لحاظ سے مکرم ڈاکٹر صاحب اور حضرت چوہدری صاحب کی طبیعتیں آپس میں بہت ملتی تھیں۔ صوفی شعراء میں دونوں بزرگوں کو مولانا روم سے عشق کی حد تک عقیدت تھی اور ان کے سینکڑوں اشعار دونوں کو یاد تھے۔ اس طرح بعض اوقات تو پوری محفل پر حافظ و رومی چھائے رہتے تھے۔ حضرت چوہدری صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فارسی کلام سے بڑا لگاؤ تھا اور اگر میں یہ کہدوں کہ انہیں قریباً حضور علیہ السلام کا فارسی منظوم کلام سارا حفظ تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو حضرت چوہدری صاحب سے بے حد محبت تھی۔ اکثر اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور حضرت چوہدری صاحب جو بھی مشورہ دیتے اس پر عمل پیرا ہوتے۔

خاکسار کے آنے کے کچھ عرصہ بعد محترم ڈاکٹر صاحب کے والد محترم حضرت چوہدر محمد حسین صاحب مرحوم بھی لندن تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنے والدین سے عشق تھا۔ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جو بھی بڑے بڑے لوگ سیاستدان' سائنس دان ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ملنے آتے انہیں اپنے والد صاحب سے ضرور ملاتے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات ڈیوک آف ایڈنبرا سے طے ہوئی تو وہاں بھی اپنے والد صاحب مرحوم کو ساتھ لے گئے اور انہیں ڈیوک سے ملایا۔

ایک دن محترم ڈاکٹر صاحب خاکسار کے پاس مشن ہاؤس

تشریف لائے اور فرمایا کہ ان کے والد صاحب گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہے کہ وہ انہیں صبح میرے پاس مشن ہاؤس میں چھوڑ جایا کریں اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے لے جایا کریں۔ اس طرح مشن ہاؤس میں ان کا دل لگا رہے گا۔ احمدی دوستوں سے ملاقات کا بھی موقع ملتا رہے گا۔ خاکسار نے عرض کیا بڑی خوشی سے انہیں لے آیا کریں۔ جماعت کی تربیت کے سلسلہ میں ہم ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنالیں گے۔ اس طرح ایک تو ان کا دل لگا رہے گا دوسرے جماعت کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ محترم چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم روزانہ مشن ہاؤس میں تشریف لانے لگے اور اکثر میرے دفتر میں میرے ساتھ بیٹھ کر علمی و تربیتی امور پر گفتگو رہتی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دفعہ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے مجھے کہا کہ دعا کرو سلام کو نوبل پرائز مل جائے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود بزرگ ہیں۔ دعا کریں میں بھی دعا کروں گا اور چند اور بزرگ دوستوں کو بھی دعا کے لئے کہوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے ایک رات خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ سلام کو نوبل پرائز ضرور ملے گا لیکن ابھی ان کی عمر چھوٹی ہے جبکہ بڑی عمر کے سائنسدانوں کی قطار لگی ہے۔ پہلے انہیں یہ پرائز دیا جائے گا اور پھر باری آنے پر ڈاکٹر صاحب کو بھی ضرور یہ انعام ملے گا۔ میں نے اگلے دن حضرت چوہدری صاحب سے اپنے اس خواب کا ذکر کیا۔ دوسرے دن مکرم ڈاکٹر صاحب مشن ہاؤس آئے تو مجھ سے خواب سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خاکسار نے خواب سنائی تو فرمانے لگے عجیب بات ہے ابھی چند روز ہوئے مجھے یہی بات ایک نوبل پرائز کمیٹی کے قریبی شخص نے بھی بتائی ہے۔

مکرم ڈاکٹر صاحب جمعہ کے روز اول وقت بیت الفضل لندن میں تشریف لاتے اور عموماً پہلی صف میں امام کے عین پیچھے بیٹھا کرتے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو احمدیت سے عشق تھا اور جماعت کے لئے بہت غیرت رکھنے والے انسان تھے۔ جنرل ضیاء نے جب اپنا رسوائے زمانہ آرڈیننس جاری کیا جس میں جماعت کو بہت سے شعائر اسلام کے استعمال سے روکا گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بہت صدمہ پہنچا۔ کچھ عرصہ بعد جب خاکسار مکرم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا تو خاکسار نے ان سے پوچھا کہ کیا اس آرڈیننس کے جاری ہونے کے بعد بھی ان کی ملاقات جرنیل صاحب سے ہوئی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہاں ملاقات ہوئی تھی اور اس کی روداد یوں سنائی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جنرل ضیاء کی طرف سے مجھے ٹریسٹ میں کئی فون آئے کہ میں پاکستان جاکر ان سے ملوں لیکن میں ٹالتا رہا۔ بالآخر مجھے پاکستان جانا پڑ گیا۔ جنرل ضیاء الحق کو اطلاع ہوئی تو ملاقات کے لئے مصر ہوئے۔ چنانچہ میں ملاقات کے لئے پریذیڈنٹ ہاؤس میں گیا۔ وہاں اور بھی بعض سائنسدان موجود تھے۔ جنرل صاحب نے باہر آکر میری کار کا دروازہ کھولا اور مجھ سے معانقہ کرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے کمرہ میں لے گئے۔ جہاں اور سائنس دان بھی موجود تھے۔ دوران گفتگو میں نے آرڈیننس کا ذکر کرکے اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ جنرل صاحب نے فوراً میرا ہاتھ پکڑا اور کہا آئیے دوسرے کمرہ میں چل کر بات کرتے ہیں اور مجھے دوسرے کمرہ میں لے گئے۔ میرے ساتھ اس وقت کے سائنسی امور کے وزیر بھی کمرہ میں چلے گئے۔ جرنیل صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ میرے پاس علماء کا ایک وفد آیا تھا انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ احمدی قرآن مجید میں تحریف کرتے ہیں اس لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جرنیل صاحب کو کہا کہ قرآن کی حفاظت کا تو خود اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا اور قرآن کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیا ہوا ہے اس لئے احمدی اس میں تحریف کیسے کرسکتے ہیں۔ اس پر جرنیل صاحب اٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف گئے اور تفسیر صغیر اٹھا لائے اور کہ علماء نے ان آیات کی نشاندہی کردی ہے جہاں آپ نے تحریف سے کام لیا ہے اور ایک نشان زدہ صفحہ کھول کر میرے سامنے کردیا۔ یہ آیت خاتم النبیین تھی۔ میں نے جرنیل صاحب سے کہا کہ آیت تو مکمل درج ہے۔ تحریف کہاں ہوئی ہے۔ جرنیل صاحب نے کہا کہ آپ نے آیت کے معنوں میں تحریف کی ہے اور بجائے نبیوں کو ختم کرنے والے کے "نبیوں کی مہر" ترجمہ کیا ہے اور یہ ناقابل برداشت ہے۔ میں نے جرنیل صاحب سے عرض کیا کہ ختم کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے وہ پنجابی زبان کا نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے عربی میں مہر ہیں لیکن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کیا آپ کے پاس اور کسی عالم کا ترجمہ شدہ قرآن بھی ہے۔۔ جرنیل صاحب اٹھے اور علامہ اسد کا ترجمہ قرآن اٹھا لائے جو مکہ معظمہ سے شائع ہوا تھا۔ میں

نے قرآن مجید کھولا۔ آیت خاتم النبیین نکالی تو وہاں بھی ترجمہ Seal of Prophet لکھا تھا۔ جرنیل صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ علامہ اسد تو احمدی نہ تھے پھر ان کا ترجمہ سعودی حکومت کا شائع کردہ ہے۔ کیا انہیں بھی آپ تحریف کا مجرم قرار دیں گے؟ اس پر جرنیل صاحب کچھ کھسیانے ہو کر کہنے لگے بھئی میں تو ان پڑھ جرنیل ہوں جو علماء نے مجھے کہا میں نے اسے تسلیم کیا۔ میں نے عرض کیا جناب بات صرف جرنیلی کی نہیں آپ اس ملک کے صدر بھی ہیں اور بحیثیت صدر مملکت پاکستان کی تمام رعایا کے حقوق کی حفاظت آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ یہیں اسلام آباد میں جماعت احمدیہ کے مربی موجود ہیں۔ جماعت کے افراد موجود ہیں۔ آپ کو جو علماء نے بتایا تھا آپ کا فرض تھا کہ احمدی علماء کو بھی بلا کر اپنی تسلی کر لیتے اور پھر فیصلہ کرتے۔ اس پر جرنیل صاحب نے زور سے کلمہ شہادت پڑھا اور مجھے بھی کلمہ شہادت پڑھنے کا کہا۔ میں نے بھی کلمہ شہادت پڑھا تو فرمانے لگے سلام! خدا کی قسم میں آپ کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں علماء سے میں مجبور ہو گیا تھا اور یہ کہہ کر بات کا رخ اور طرف موڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان سے شدید محبت تھی۔ میں نے جب برٹش پاسپورٹ حاصل کیا تو ایک دن ناشتہ کی میز پر میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ بھی برٹش پاسپورٹ بنوالیں۔ اس طرح سفر میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر وہ چاہیں تو میں برٹش پاسپورٹ کے حصول کے لئے ضروری فارم و کاغذات ان کو لا کر دے دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا امام صاحب!

میں ہرگز پاکستانی قومیت والا پاسپورٹ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے امید ہے کہ مجھے بہت جلد نوبل پرائز مل جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ یہ اعزاز کسی اور ملک کے کھاتے میں جائے۔ میں پاکستانی رہوں گا خواہ مجھے سفر میں کبھی پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ اپنی وفات تک انہوں نے برطانوی شہریت حاصل نہ کی جس کا کہ انہیں حق بھی حاصل تھا۔

اپنے والدین سے مکرم ڈاکٹر صاحب کی عقیدت و محبت مثالی تھی اور یوں لگتا تھا گویا انہیں اپنے والدین سے والہانہ عشق ہے۔ جب ان کے والد صاحب کی وفات ہوئی تو مکرم ڈاکٹر صاحب غم سے نڈھال ہو گئے اور لندن میں اپنے مکان کے کمرہ میں غم سے نڈھال تنہائی میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد محترمہ مسز سلام کا حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کو فون آیا کہ آ کر ڈاکٹر صاحب کو سمجھائیں۔ حضرت چوہدری صاحب مجھے ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا غم سے برا حال تھا۔ حضرت چوہدری صاحب نے انہیں نصیحت کی اور فرمایا کہ اس قدر غم بھی بعض اوقات شرک کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ پھر اپنی مثال دی کہ والدہ صاحب مرحومہ سے عشق ہونے کے باوجود ان کی وفات پر صبر اختیار کیا اور اللہ کی رضا پر راضی ہو گیا۔ بہت دیر تک نصیحت فرماتے رہے پھر اٹھ کر مکرم ڈاکٹر صاحب کو گلے لگایا۔ ڈاکٹر صاحب خوب روئے اور یوں ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا اپنے والدین سے عشق اس وجہ سے بھی تھا کہ دونوں اولیاء اللہ میں سے تھے۔ صاحب رویا و کشوف تھے۔ ان کی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب والد بزرگوار مکرم ڈاکٹر صاحب ساری ساری رات عبادت میں گزار دیا کرتے تھے اور دعاؤں میں خاص شغف رکھتے تھے۔

محترمہ مسز سلام صاحبہ ایک لمبے عرصہ تک برطانیہ کی لجنہ اماء اللہ کی صدر رہیں جب کہ خاکسار کو بحیثیت امام و مشنری انچارج برطانیہ ان کا تعاون حاصل رہا۔ مسز سلام دن رات سلسلہ کے کاموں میں اور لجنہ اماء اللہ برطانیہ کی تعلیم تربیت میں مگن رہتی تھیں۔ اس کام میں انہیں مکرم ڈاکٹر صاحب کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ مسز سلام ایک طرف دن رات سلسلہ کی خدمت میں لگی رہتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مکرم ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجنوں مہمانوں کی بیک وقت مہمانوازی میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں آنے دیتی تھیں۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے دونوں میاں بیوی کا آپس میں تعاون ضروری تھا۔ جو خدا تعالیٰ کے فضل سے انہیں میسر تھا۔

محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کی اعلیٰ تربیت اور ان کے مرحوم بزرگ والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کے سب بچے دین کے خادم، مخلص، خلافت کے اطاعت گزار اور کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے فرزند اکبر عزیز احمد سلام جلسہ ہائے برطانیہ اور دیگر تقاریب پر کچن میں دن رات ڈیوٹی

میں مگن ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک غیر از جماعت معزز مہمان ہمارے سالانہ جلسہ پر تشریف لائے تو جلسہ کے اعلیٰ اور وسیع انتظامات سے بے حد متاثر ہو کر فرمانے لگے کہ ان تمام کارکنوں کو آپ کی جماعت اتنے بڑے کام کے لئے بہت معاوضہ دیتی ہوگی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہ سارے کا سارا کام رضاکارانہ طور پر ہوتا ہے تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ وہ لنگر خانہ کے پاس کھڑے تھے۔ ان کا تعارف کارکنان کچن سے کرایا گیا۔ عزیز احمد سلام کچن کے بڑے دیگچے مانجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ جب ان کا تعارف معزز مہمان سے کرایا گیا تو بہت حیران ہوئے کہ اتنے بڑے آدمی کا بیٹا کچن میں برتن مانجھ رہا ہے اور اس پر فخر محسوس کرتا ہے کہ اس کو خدمت دین کی توفیق مل رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو دین حق سے کس قدر عشق تھا اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتا ہے۔ کئی سال ہوئے سعودی حکومت کے تعاون سے حج کے بارہ میں ایک فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں ارکان حج کے علاوہ مقدس مقامات کی زیارت بھی کرائی گئی تھی۔ خاکسار نے اس فلم کو مشن ہاؤس میں دکھانے کا اہتمام کیا اور محترم ڈاکٹر صاحب کو بھی فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ میرا ارادہ عمرہ کرنے کا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جو لطف مجھے خود ان مقامات پر حاضر ہونے کا نصیب ہو گا فلم دیکھنے سے اس میں کمی آجائے۔

خوش الحان قاریوں کی تلاوت کے بے شمار کیسٹ ڈاکٹر صاحب منگواتے رہتے تھے اور انہیں بڑی عقیدت سے سنا کرتے تھے اور اکثر قاریوں کے بارہ میں خاکسار کو بتایا بھی کرتے تھے کہ فلاں قاری کی آواز بڑی متاثر کن ہے تو فلاں قاری کی قرات اور الفاظ کی ادائیگی بہت اعلیٰ ہے۔ قاری عبدالباسط سے بے حد متاثر تھے اور ان کی تلاوت میں پورا قرآن کریم بطور خاص مصر سے منگوایا تھا اور اسے سنا کرتے تھے اور کئی مرتبہ مکرم حضرت چوہدری صاحب کو بھی سنایا کرتے تھے۔

محترم ڈاکٹر صاحب مخفی طور پر درجنوں بیواؤں اور یتیموں اور غریب طالب علموں کی مالی امداد بھی فرماتے تھے۔ جس کا خاکسار کو بھی علم تھا۔ کیونکہ کئی دفعہ خاکسار کے ذریعہ بھی یہ مدد مستحق لوگوں کو جاتی تھی۔ چندوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اعلیٰ وصف یہ تھا کہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ اکثر اپنے ہاتھ سے اور کبھی کبھی اپنے سیکرٹری سے ٹائپ کروا کر دستخطوں سے جواب بھجواتے تھے۔

غرض مکرم ڈاکٹر صاحب مرحوم اخلاق حسنہ کے ایک خوبصورت گلدستہ تھے۔ جس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی اور جن کا نام نامی ابدالاباد تک زندہ اور تابندہ رہے گا۔

بقیہ از صفحہ 198

میں پروتی ہے۔ اقوام اسلام اس کے ذریعے اپنے مقصد کی طرف بڑھ سکتی ہیں۔ عالم اسلام بین الاقوامی سائنس کا قرض دار ہے۔ یہ ادھار چکانا ہے۔

میں آج کل اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں۔ اس کی کل آبادی ڈھائی لاکھ ہے اور لوگ زیادہ امیر نہیں۔ یہاں کے ایک بینک نے ۱۹۶۳ء میں ہمارے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کی عمارت بنانے کیلئے پندرہ لاکھ ڈالر کا گرانقدر عطیہ دیا تھا۔ شہر کے لوگوں نے اب وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں کے بائیو ٹیکنالوجی کے مرکز کیلئے چار کروڑ ڈالر پیش کریں گے۔ ان کے سائنس سے اس لگاؤ اور دور اندیشی پر مجھے سخت حیرت ہے۔ یہ ہمارے شہروں اور بینکوں کے لئے ایک سبق ہے۔ صدیوں قبل ایسی روایات ہمارے ہاں بھی تھیں۔ عالم اسلام سائنس پر رقم خرچ کرے۔ سائنسی اوقاف بنائے جن کا انتظام سائنس دان خود کریں۔ عالمی تعلیمی ادارے بنائے جن میں اعلیٰ درجہ کے سائنس دان تیار ہوں۔ اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ معیار کی سائنسی تخلیق کیلئے سامان مہیا کرے۔ عالم اسلام کا اسلام پر یہ قرض ہے۔ سائنس اور اسلام میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن کریم کے احکامات اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق علم کی تخلیق اور تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے۔ آخر میں میں قرآن مجید کے ان کلمات پر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں۔

"تو انہیں کہہ (کہ) اگر (ہر ایک) سمندر میرے رب کی باتوں کے (لکھنے) کے لئے روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے (ہر ایک) سمندر (کا پانی) ختم ہو جاتا گو (اسے) زیادہ کرنے کے لئے ہم اتنا (ہی) پانی سمندر میں لا ڈالتے۔ (الکہف ۱۱۰)

ڈاکٹر عبدالسلام کی جلاوطنی آخر ختم ہوئی

ایک کڑوا سچ

ڈاکٹر عبدالسلام کون ہے؟ یا تھا؟ پنجاب کے بچوں کیلئے مشکل سوال ہے، مگر جواب بڑا ضروری ہے۔ ایک سوال اور بھی ہے، نوبل انعام یافتہ کون ہوتا ہے؟ اشارہ...... نوبل پرائز..... اب تم اشارے کی مدد سے بوجھ سکتے ہو۔ نوبل پرائز جیتنے والے کو نوبل انعام یافتہ کہتے ہیں۔ اگلا سوال بھی اسی سلسلے کا ہے، لیکن جواب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ کبھی کسی پنجابی نے نوبل پرائز جیتا؟ یہ دنیا کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ہے اور صرف دنیا کے اعلیٰ ترین دماغ والوں کو ہی مل سکتا ہے۔ اس انعام کا جیتنے والا اپنے ملک، علاقے اور اپنے عوام کیلئے بڑی عزت حاصل کرتا ہے کیونکہ یہ انعام تخلیق اور تحقیق کے کاموں میں ارفع ترین مقابلے میں ہی جیتا جاتا ہے اور انعام دیتے وقت اس ملک کا نام بھی پکارا جاتا ہے جس نے اس عالیشان ذہن کو پیدا کیا۔ سوال سمجھ میں نہیں آیا؟ چلو لفظ بدل دیتے ہیں کیا پنجاب نے کبھی کوئی بڑا سائنسدان پیدا کیا؟ یہ بھی آسان نہیں ہوگا، کیونکہ تمہاری کتابوں میں تو سائنس کا ذکر بہت ہی کم ملتا ہے اور پنجاب نے سائنس میں ترقی بالکل نہیں کی..... پھر؟ فزکس کا نوبل انعام یافتہ؟؟

مگر یہ حقیقت ہے کہ پنجابی گھرانے کا ایک سیدھا سادھا آدمی دنیائے فزکس کا اعلیٰ ترین ذہن ۱۹۷۹ء کا نوبل لارئیٹ مانا گیا تھا۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی انتہائی ترقی یافتہ سائنس فزکس ہی ہے۔ یہی سائنس انسان کو سپیس ایج (Spaceage) میں لے گئی۔ اسی کی مدد سے آدمی چاند پر اتر کر چاندنی کی چادر پر اپنے پیروں کے نشان چھوڑ آیا۔ یہی وہ علم ہے جس نے انسان کو تسخیر کائنات کا سب سے اونچا پرچم تھمایا۔ یہی سائنس کائنات کی اصل ابتدا اور ایٹم کی بے پناہ طاقت کا کھوج لگا سکی۔ اس عالیشان کھوج کا ایک ہاتھ بہت سارے ہاتھوں میں سے ایک پنجابی ہاتھ بھی ہے۔ بہت سارے جرمن، امریکی، برطانوی، اطالوی، روسی اور سویڈش ہاتھوں کے درمیان ایک گندمی رنگ کا ہاتھ۔

اب بتاؤ تم اس پنجابی کا نام جاننا چاہو گے؟ ڈاکٹر عبدالسلام۔ یہی نام ہے اس یکتائے روزگار کا، لیکن پنجاب کے بچے اس نام سے کیوں واقف نہیں؟ پھر ایک سوال، فکر کی بات نہیں۔ ہماری تاریخ سوالوں سے بھری پڑی ہے۔ پنجاب کی تاریخ اور ہے کیا، سوال ہی سوال۔ پنجاب تقسیم کیوں ہوا؟ پنجاب میں قتل عام کیوں ہوتے رہے؟ پنجاب کی عورت بے عزت کیوں کی گئی؟ پنجاب سے امرتا پریتم کیوں چلی گئی؟ کرشن چندر کو وہاں سے کیوں نکالا گیا؟ پنجابی زبان ترقی میں کیوں پیچھے رہ گئی؟ پنجاب اپنے شاعروں کی زبان کیوں نہیں گاتا؟ پنجاب میں سائنس کا مستقبل اندھیر کیوں ہے؟ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے دیس واپس کیوں نہ آسکے؟ ان کا عظیم خواب...... سائنس کی ترقی کا خواب پنجاب کی زمین پر کیوں نہ اتر سکا؟ وہ عالیشان اوارہ جو فزکس جیسی سائنس کی ترقی کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام نے اٹلی میں قائم کیا، پنجاب میں کیوں نہ بن سکا؟ یہ سوال نہیں ایک بدصورت حقیقت ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو قادیانی ہونیکی وجہ سے فزکس کی ترقی کیلئے کام نہیں کرنے

دیا گیا۔ نوبل پرائز جیتنے والا یہ سائنسدان اپنے انعام اور اعزاز لا کر اسی زمین پہ سجا دینا چاہتا تھا۔ پوری دنیا سے اسے جو عزت اپنے علم کیلئے ملی تھی وہ اپنے وطن لے کر آنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس حیثیت میں ہے کہ دنیائے سائنس کے خزانوں سے جتنی امداد اپنے وطن کیلئے مانگے گا وہ اسے ملے گی۔ اس کا خواب تھا کہ یہاں دنیا کی بڑی سائنس کی بنیاد استوار ہو جائے مگر افسوس! یہ سب کچھ ہونے نہیں دیا گیا۔ کس نے نہیں ہونے دیا؟ یہ سوچ جس نے پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ کو سائنسی علم کی برکت اور شہرہ آفاق شہرت لیکر وطن لوٹنے نہیں دیا، اس رویے سے کس قدر نقصان ہوا؟ علم کی دولت کو ٹھکرا کر اپنے وطن کو محروم کیا۔ ایک ایسی ہستی کا دل توڑا جس پر انسانیت کو فخر ہے۔ اس پر بھی ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے انعام کی رقم سے پاکستانی طالبعلموں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔

آج ان کا انتقال پردیس میں ہوا ہے۔ دیس آکر رہنے اور کام کرنے کی تمنا کا انت ہو گیا آخر۔ وہ ہستی آج دنیا سے اٹھ گئی، جس کے لئے علم کی دنیا آنکھیں بچھاتی رہی۔ مگر اس نے یورپ کی شہریت نہیں لی اور تن تنہا فزکس کی سٹڈی کا بہت شاندار مرکز اٹلی میں قائم کیا۔ یہ سنٹر انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کہلاتا ہے۔ یہاں دنیا بھر سے فزکس میں اعلیٰ ریسرچ کیلئے سکالرز آتے ہیں اور سائنسی علم کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر سلام کی زندگی کے دو بڑے مقاصد تھے۔ اول کائنات کی فزیکل اہمیت کو Mathematical آلات کی مدد سے سمجھ لینا۔ دوسرے سائنس کی مدد سے پاکستان کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنا۔ ان کی پہلی خواہش پوری ہوئی لیکن دوسری تشنہ کام رہ گئی۔ آخر کیوں؟ دنیائے فزکس کا یہ عظیم ریسرچ سنٹر پاکستان میں کیوں نہ بننے دیا گیا؟ آج یہ سرچشمہ پچاس سے زیادہ پس ماندہ ممالک کو فیضان دے سکتا تھا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے ایک وزیر اعظم نے گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک فنکشن میں وہاں (تحصیل علم کے بعد) نکلنے والے بڑے آدمیوں کے نام گنوائے اس فہرست میں سب سے بڑے آدمی کا نام نہیں تھا۔ وزیر اعظم کو فزکس کے نوبل انعام یافتہ کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔ مگر اس طرح کے رویے سے ڈاکٹر عبدالسلام کے علم کی اہمیت کو فرق نہیں پڑتا۔ تاہم ان کے دل کو ضرور فرق پڑ گیا تھا۔ اپنی چالیس سالہ شاندار علمی کاوش کے نتیجے میں اس سائنسدان نے ۲۰ (سے زائد) عالمی ایوارڈز حاصل کئے۔ ان میں کیمبرج کا وہ ایوارڈ بھی شامل ہے جو فزکس میں سب سے زیادہ کام کرنے والے کی حیثیت سے انہیں ۱۹۵۷ء میں ملا تھا۔ پاکستان سے تعلق اور تعلق خاطر رکھنے والے ڈاکٹر عبدالسلام کا کام دنیائے فزکس میں ایک انقلاب ہے کہ جو ہر آن آگے بڑھ رہا ہے۔ ان کی تحقیق نے حقیقت کائنات کے فرق روشن کئے ہیں اس لئے مہذب دنیا میں ان کی بے پناہ عزت و توقیر ہے، مگر خود ان کا دل آخر تک ایک جلاوطن کا دل تھا جو اہل وطن کی توجہ کیلئے پھڑکتا رہا۔ (اور دھڑکتا رہا)

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے جب ان کی ریٹائرمنٹ کے اعزاز میں ایک جشن ہوا۔ اس سلسلے میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کا اعلیٰ درجے کا اجلاس بھی ہوا یہ کوئی معمولی اجلاس نہیں تھا۔ دنیا کے عظیم سائنسدانوں اور دانشوروں کا اجتماع تھا کہ جس میں فزکس کے تین اور نوبل انعام یافتہ بھی شریک تھے۔ اس اعلیٰ سطحی اجتماع میں کائنات و حیات کے آغاز بگ بینگ کے وقت مادے کی حالت اور زمین کی گہرائیوں کے بعید اور سپر کنڈکیٹویٹی کے متعلق حیرت انگیز انکشافات پر غور کیا گیا۔ یہ جشن سائنسی فتوحات کا جشن تھا۔ اصل میں ڈاکٹر سلام کی دریافتوں کا جشن تھا۔ عجب بات ہے کہ عین اس وقت جب فزکس کی دنیا کے چمکدار ستارے ایک کے بعد ایک ڈاکٹر سلام کو تعظیم پیش کر رہے تھے وہ اپنے اندر ایک افسردہ دل لئے بیٹھے تھے۔ کس طرح سے؟ ذرا سنئے "نیوز لائن" نے کس طرح اس منظر کو بیان کیا؟

> "اس شاندار جشن کی تقریبات کے اختتام پر ایک ناقابل فراموش منظر اس طرح سے بنا کہ وہ سب یعنی بین الاقوامی سائنس برادری کے معتبر انسان سینکڑوں کی تعداد میں منظم قطاریں باندھ کر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو مبارکباد پیش کرنے کیلئے آگے بڑھے اور اپنی باری کیلئے صبر سے کھڑے ہو گئے۔
> تب ایک پریشان حال سا نوجوان اپنی باری آنے پر عظیم سائنسدان کے آگے جھکا اور کہنے لگا "جناب! میں ایک پاکستانی طالبعلم ہوں...... ہمیں آپ پر بڑا فخر ہے"...... ڈاکٹر عبدالسلام کے کندھے ہلے اور آنسوؤں کے دو دھارے ان کے چہرے پر بہنے

بقیہ صفحہ 185 پر

عالم پہ اپنی دھاک بٹھا کر چلا گیا

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی عظیم سائنسی خدمات

(مکرم پروفیسر راجا نصر اللہ خاں صاحب۔ ربوہ)

اللہ کے کچھ ایسے بندے ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خاص صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرماتا ہے جن کو بروئے کار لا کر وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں اور ان کی کامیابیوں اور خدمتوں سے ایک عالم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی ایک ایسے عبد منیب تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قابلیت اور علم و فضل سے نوازا تھا۔

آپ کی ذہانت، قابلیت، آپ کی انسان دوست شخصیت اور آپ کی دنیا کی خدمت اور ہمدردی کے جذبہ کا دنیا نے برملا اظہار کیا۔ چنانچہ بطور نمونہ بعض اخبارات کے اس اعتراف کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ انگریزی روزنامہ "ڈان" کراچی مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے صفحہ اول کی ایک نمایاں خبر کی سرخی۔

پروفیسر سلام اور دو امریکنوں نے نوبیل پرائز حاصل کیا۔

سٹاک ہوم۔ ۱۵ اکتوبر۔ پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام اور دو امریکنوں نے آج ۱۹۷۹ء کا طبیعات کا نوبیل پرائز اپنے اس کارنامے کے نتیجہ میں جیت لیا جس کا تعلق ایسے میدان سے تھا جو آئن سٹائن کیلئے پریشان کن بنا رہا۔ یعنی ایک مشترکہ قوت کی تلاش جس کے متعلق اسے گمان تھا کہ وہ ساری کائنات کو یکجا باندھے ہوئے ہے۔

ڈان کراچی ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء کا اداریہ بعنوان "پاکستان کیلئے ایک اعزاز" لکھا ہے۔

یہ کوئی معمولی اتفاق نہیں کہ البرٹ آئن سٹائن کی سوویں سالگرہ کے برس طبیعات کے تین سائنس دانوں کو تمام عالمی انعامات میں سے سب سے زیادہ قابل رشک نوبیل پرائز دیا گیا ہے جو ان کی ایسے میدان میں تحقیق کا نتیجہ ہے جس نے ان کے شہرہ آفاق پیشرو (آئن سٹائن۔ ناقل) کو پریشان کئے رکھا اور یہ بات کہ انعام جیتنے والوں میں سے ایک پروفیسر عبدالسلام ہیں۔ اس ملک پاکستان کیلئے زبردست افتخار اور عزت کا باعث ہے۔

روزنامہ مشرق مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۳ م۔ش کا کالم "نوبیل پرائز یافتہ عبدالسلام کا گھریلو ماحول"

"نظریاتی طبیعات میں ریسرچ پر نوبیل پرائز حاصل کرنے والے پاکستانی سپوت ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق جھنگ کے ایک متوسط درجے کے خاندان سے ہے ان کے والد ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں "ہیڈ ورنیکلر کلرک" تھے۔ دنیاوی لحاظ سے یہ ایک معمولی منصب تھا۔ لیکن وہ ایک بلند اخلاق انسان تھے۔ جنہوں نے اپنی پاکیزگی اخلاق سے اپنے ماحول کو عموماً اور اپنے اہل خاندان اور اہل و عیال کو خصوصاً متاثر کیا۔

پروفیسر عبدالسلام اپنے مرحوم والد کے عملی درس اخلاق کے بہترین متعلم اور یادگار متصور ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ گھر اور دفتر میں ایک مثالی کردار کے انسان تھے۔ ان پر یہ قول لفظ بلفظ صادق آتا تھا کہ ایک ٹن وعظ پر ایک اونس کا حسن عمل بھاری ہوتا ہے۔ انہوں نے رزق حلال کو اپنا ماٹو قرار دیا تھا۔ ان کے حسن کردار نے ننھے عبدالسلام کے دل و دماغ کو بچپن سے ہی متاثر کیا اور انہوں نے شروع دن ہی سے اپنی زندگی کو منظم کرنا شروع کیا۔ اگر عبدالسلام صاحب کے والد کی طرح پاکستان میں لوگوں نے اپنی اولاد کی طرف توجہ دی ہوتی تو پاکستان میں آج ایک ایسی نسل معرض وجود میں آچکی ہوتی جو حقیقی معنوں میں اقبال کے شاہین کہلانے کی سزاوار ہوتی۔"

روزنامہ "جنگ" راولپنڈی مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء کا اداریہ "پاکستانی سائنس دان کا اعزاز"

"ہر پاکستانی کیلئے یہ باعث صد فخرو اعزاز ہے کہ ان کے ایک ہم وطن ڈاکٹر عبدالسلام نے علم طبیعات میں اس سال نوبیل پرائز حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو جو ان دنوں لندن میں ہیں جب اس اعزاز کی خبر ملی تو وہ سجدہ شکر میں گر گئے اور گرنا بھی چاہئے تھا کیونکہ وہ ایک سائنسدان ہیں اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انسان کو قدرت کے رازوں تک رسائی کی توفیق بخشنے والی اسی کی ذات پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ ڈاکٹر عبدالسلام کی قوت فکر و ذہانت میں مزید اضافہ کرے اور انہیں ملک و قوم کی خدمت کرنے کا طویل موقع بھی عطا کرے۔ ہم انہیں اور اپنے تمام ہم وطنوں کو اس موقع پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔"

اپنی نوجوان نسل اور لکھے پڑھے طبقے کی معلومات میں مزید دلچسپ اضافہ کرنے کی غرض سے ہم پاکستان کے اس عظیم و فطین فرزند پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب "ڈاکٹر عبدالسلام" کے مستند حوالوں سے کچھ مزید تفصیلات درج کرتے ہیں جن سے یہ بھی واضح ہو گا کہ اس محب وطن سائنسدان نے اپنے وطن عزیز کیلئے کیا کیا خدمات انجام دیں اور سائنس کے عالمی افق پر اس کا کیا مرتبہ ہے۔

یہاں ڈاکٹر عبدالغنی کے متعلق یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہو گا کہ وہ خود بھی طبیعات کے پی ایچ ڈی ہیں وہ برصغیر پاک و ہند کے پہلے سائنسدان ہیں جو ۱۹۶۱ء میں سرن (جینوا) میں بطور مہمان سائنسدان مامور ہوئے۔ وہ ۱۹۶۶ء میں "پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی" کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ پھر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے چیئرمین رہے۔

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" سلام پر پوری طرح صادق آتا ہے ان کی غیر معمولی اٹھان اور تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی ان کے تابندہ مستقبل کی ضمانت بن گئی تھی۔ ڈاکٹر عبدالغنی ان کے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

"جس معیار پر بھی پرکھا جائے۔ سلام نے اپنے آپ کو میٹرک سے لے کر ایم اے تک یونیورسٹی کے تمام امتحانات میں اول رہ کر ایک انتہائی غیر معمولی اوصاف اور قابلیت کے حامل طالبعلم کی حیثیت سے منوایا۔ میٹرک اور بی۔ اے کے امتحانات میں تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں جو اعلیٰ ترین نمبر حاصل کئے وہ ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بی۔ اے میں انہوں نے ہر مضمون میں الگ الگ ٹاپ کیا۔ یہ مضامین تھے انگلش، انگلش لٹریچر (برائے آنرز) اور عملی ریاضی۔" (ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ ۲۹)

کیمبرج میں داخلہ:۔ کیمبرج جو کہ دنیا بھر کی اعلیٰ ترین درس گاہوں میں سے ایک ہے صرف انہی طلبہ پر اپنے دروازے کھولتی ہے جو غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کا ثبوت دے چکے ہوں۔ سلام ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے کیمبرج روانہ ہو گئے ڈاکٹر عبدالغنی تحریر فرماتے ہیں۔

"سلام کیمبرج میں روزانہ چودہ تا سولہ گھنٹے لگاتار کام کیا کرتے تھے ان کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا۔ وہ نہ صرف علوم ریاضی و طبیعات کا مطالعہ کرتے تھے بلکہ تاریخی کتب بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ خصوصاً تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت تاریخ ہند اور تاریخ اقوام عالم، یہاں انہوں نے دنیا کے تمام مذہب کی الہامی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنا تین سالہ Tripos (کیمبرج میں آنرز ڈگری کا امتحان) دو ہی سالوں میں مکمل کر لیا اور بغیر کسی مشکل کے Wrangler (کیمبرج کا فرسٹ ڈویژن میں کامیاب آنرز گریجویٹ) بن گئے۔" (صفحہ ۳۸۔۳۹)

شاگرد سے استاد بننا

کیمبرج سے ہی محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری نہایت ہی ممتاز اور شاندار کامیابی سے حاصل کی اور اس دوران ہی طبیعات میں اعلیٰ تحقیقی کام کے نتیجہ میں کیمبرج کے زمانہ تعلیم میں ہی انہیں سمتھ پرائز (Smith Prze) دیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں اٹھائیس سال کی عمر میں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے لیکچرر شپ کی پیشکش قبول کر کے ایک اور منفرد کامیابی حاصل کی۔ اس کے صرف تین سال بعد جب کہ ان کی عمر صرف اکتیس سال تھی انہیں لندن کے شہرہ آفاق امپیریل کالج کی فل پروفیسر شپ کی پیشکش ہوئی اور اس

طرح وہ ۱۹۵۷ء میں امپیریل کالج لندن کے فل پروفیسر بن گئے۔

وطن عزیز کی بے مثال خدمات

ڈاکٹر عبدالسلام کا اتنی کم عمری میں طبیعات کے میدان میں ایک عبقری کی حیثیت سے ابھرنا اتنی شاندار کامیابی تھی کہ وطن عزیز کی نظریں بھی ان کی طرف اٹھنے لگیں اور صدر پاکستان محمد ایوب خان نے ان کی بہت قدر دانی کی جس کے نتیجہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے ملک و قوم کی بے لوث اور بے مثال خدمات کا موقع میسر آیا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبدالسلام کو "ایجوکیشن کمیشن" کا مشیر اور پاکستان سائنٹیفک کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انیس عالم کے ایک مضمون "ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں" مطبوعہ دی نیشن لاہور مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۶ء سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں آپ کو تعلیمی کمیشن کا ایڈوائزر مقرر کیا گیا یہ کمیشن اس وقت کی پاکستان حکومت نے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن کا کام یہ تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کی ضروریات کے مطابق تعلیمی سسٹم کو اوورہال کرنے کے متعلق مشورے دے جو کہ ملک کو کامیاب جدید صنعتی ملک بنانے کیلئے اشد ضروری تھا۔ اس کمیشن نے بڑے زور سے یہ سفارش کی کہ سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کو مضبوط کیا جائے۔ اس کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں کم از کم سات ہزار ہنر مند ہر سال تیار کئے جا سکیں۔ ایجوکیشن کمیشن کی ان سفارشات کے نتیجہ میں کئی ٹیکنیکل تعلیم اور انجینئرنگ کی تعلیم کے ادارے کھول دیئے گئے۔ اسی طرح پوسٹ سکول لیول کے طلباء کے لئے سپیشل کالج کھولے گئے جن میں سائنس کی بہتر تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی سال ان کو نئے قائم شدہ سائنس کمیشن کا بھی ممبر مقرر کر دیا گیا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کئی نئے ادارے کھولے جائیں جن میں پاکستان میں سائنس کی ریسرچ کے کام کو منظم کیا جائے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کے صدر کا سائنٹیفک ایڈوائزر (سائنسی مشیر) مقرر کیا گیا۔ اس عہدے کی وجہ سے وہ اس قابل ہو سکے کہ پاکستان میں سائنسی اداروں کا ایک جال بچھا سکیں۔ وہ اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ سائنس اور سائنسی ریسرچ کے لئے بنیادی انفراسٹرکچر پاکستان میں قائم کر سکیں۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن

ڈاکٹر منیر احمد خان سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ "آجکل" مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں تحریر کرتے ہیں۔

"پروفیسر عبدالسلام نے پاکستان میں سائنس کی ترقی کیلئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اور چودہ سال تک PAEC کے رکن رہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مجھے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ نیوکلیئر فیول پروسیسنگ کے قیام کیلئے تجاویز تیار کرنے کا موقعہ ملا۔ ایوب خان نے معاشی بنیاد پر اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ اس طرح تیس برس قبل پاکستان نے اس اہم ترین ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا جب وہ انتہائی سستی قیمت پر بلا روک ٹوک حاصل ہو سکتی تھی۔"

سائنسی مشیر اعلیٰ کا منصب

صدر محمد ایوب خان پاکستان کے عظیم سپوت اور نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کی قابلیت اور خلوص کے جذبہ سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالسلام کو وطن عزیز کی خدمات کا بھرپور موقع ملا۔ آپ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۴ء تک تیرہ برس اعزازی طور پر اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ آیئے ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب "ڈاکٹر عبدالسلام" کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام کی کچھ بے لوث اور نمایاں خدمات کا تذکرہ کریں۔

سائنسدانوں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم:۔ ڈاکٹر عبدالغنی کا کہنا ہے کہ

"پروفیسر سلام نے پاکستان میں جس کام کو اولیت دی وہ سائنس دانوں کی تربیت تھی۔ وہ اس وقت کی وزارت تعلیم کے فیڈرل سیکرٹری ایس ایم شریف کو اس امر پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ طبیعات میں پوسٹ گریجویٹ سٹڈیز کیلئے چھ سالہ وظائف دینے کیلئے فنڈز قائم کئے جائیں اس سکیم پر تین سال تک عملدر آمد ہوتا رہا اور اس کی بدولت ہونہار طالبعلموں نے برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی

TRIBUTE BY DR AFTAB AHMED

Many salaams to Dr Salam

The world adored him for his genius, his friends admired his humanity and love of country. No one protested when he was virtually exiled from his homeland

Professor Dr. Abdus Salam's passing away has been widely mourned by most thinking people, and especially by the scientific community of Pakistan. His services to the cause of science, his achievements as a great scientist and, the only Nobel Laureate from Pakistan have been duly eulogised with reverence.

I write this to remember him as a friend. This takes me to the days when we were both students at the Government College, Lahore, in the mid-forties. Actually, we came to know each other fairly well through some common friends at the time when I was seeking admission to the M.A. English class, and Salam was still in the process of deciding whether he should study English or mathematics. And there hangs a tale.

Those were the days of Hindu-Muslim rivalry in all spheres of life including the academic. Salam had stood first in the Punjab university's B.A. exam, with English Honours and had broken all previous records. He had become a legendary figure among the students. Prof. Sirajuddin of the English Department wanted Salam to join the M.A. English course because he thought he would easily secure a first class first — a laurel which had not been won by a Muslim student in a long time. Salam toyed with the idea but, in spite of Prof. Sirajuddin's persuasion to the contrary, he finally decided to join the M.A. course in Mathematics. His decision at that moment in time did indeed set him on the road to glory that finally led to his achieving the most prestigious prize in his chosen field.

After his M.A. in which he secured a first as expected, Salam won a scholarship and went to Cambridge to pursue further studies. He took his doctorate from there with a singular distinction, came back home to become professor of Mathematics at the Government College, Lahore. A few years later, Salam decided to go back to Cambridge and joined his old college, St. Johns, as a fellow. It was during my stay at the London School of Economics in 1955 that I met Salam at Cambridge in his room at St. Johns After a while we came out, and he took me to the backs of the colleges for which Cambridge is famous the world over. It was a lovely, sunny afternoon. We spent quite some time walking around and talking of cabbages and kings. He told me that he would be moving to London next year as a professor at the Imperial Science College. We continued to meet off and on but the one occasion when we spent a few days together was at the Nathiagali Seminar on Physics organised by the Pakistan Atomic Energy Commission in June 1977. I was at that time Member (Administration) of the Commission. Salam did not know about it and I wanted to give him a surprise. So, when he saw me sitting in the front row at the inaugural session, where he was to deliver the keynote address, he burst out: "What are you

POINT OF VIEW BY INTIZAR HUSAIN

DAWN 13 December 1996

doing here?" He then came up to me, we met, and I explained to him how I happened to be there.

He began his address as he always did, with a recitation from the Holy Quran and then in his preliminary remarks he said: "My lecture is going to be in two parts. The first part will be theoretical and the second technical which may be too tough for people like my friend Dr Aftab Ahmed. So they may feel free to leave after the tea break". There was a ripple of laughter among the audience at this show of teasing familiarity with a friend in public.

After the first part of the lecture, he asked me: "Have you followed anything?" I replied: "I don't know but it seems to me that you are trying to prove the theory of *Wahdat ul Wajud* in Physics". He tapped my shoulder in excitement as was his wont and exclaimed: "But you have got it — that is what it is, essentially." Needless to say that I stayed on during the second part of his lecture also, but it was all Greek to me.

During the seminar we were all staying at the Pines Hotel, Nathiagali. I used to go for a walk in the morning and coming back I would find Salam sitting in the garden in front of his room listening to a cassette of Abdul Wahab's recitation of the Quran. We used to have our morning cup of tea together and chatted until it was time to get ready to go to the main hall of the hotel for the seminar session. It was during these days that Salam told me the story of his resignation in 1974 as Scientific Adviser to the Prime Minister of Pakistan. When Zulfiqar Ali Bhutto's government decided to declare Ahmedis as non-Muslims, Salam immediately sent his resignation to the Prime Minister saying that he was known all over the world as a Muslim scientist. It would, therefore, be most improper that he should continue as Scientific Adviser to the Prime Minister of his country where he was considered a non-Muslim. Soon after he had dispatched his resignation, he received a letter from Prime Minister Bhutto indicating that notwithstanding the declaration about the Ahmedis, he would like him to continue as his Scientific Adviser. Salam's and the Prime Minister's letters had apparently crossed each other. So he did not consider it necessary to send a reply. He had already made his point.

Dr Salam started talking about Lahore, and I tried to point towards his achievements. He got excited and said: "You say this because you can't feel the way I do. You live in your country and among your people!"[He didn't]

I do not claim to have had a very close association with Salam but it was close enough to make us look up one another whenever we could, in Pakistan or abroad. Once, when he was visiting Islamabad, I went to see him at the appointed hour but in the meanwhile, he had been called by the President for a meeting. So I met him only for a few minutes. I later received a note from him with the following couplet: Salam was a scientist — but he was interested in literature and could, on occasion, quote from Urdu and Persian poetry.

The most memorable meeting I had with Salam was in his office

at the Imperial Science College, London, in October 1989. He had been affected by his ailment but was still much the same Salam one knew; tall and burly, with a hearty laugh and a warm and firm handshake. He was able to talk in his usual manner, and could also walk around a little. In fact, he led me to the College cafeteria, taking a lift and passing through a maze of corridors. I remember when we had selected a table and were about to make a move to get our coffee, the girl at the counter motioned us to keep sitting. She was going to bring our coffee to the table. This was out of respect for Prof. Salam.

While we were waiting, I looked around and spotted his picture on a wall along with other great scientists of the world. Meanwhile, some young scholars from the College came to Salam with their autograph books. He obliged them all with a smile and a handshake.

Soon after, he started talking to me about the old days at Lahore, and how he missed his country and his people. I could see that he was getting a bit excited. I tried to change the subject by referring to his achievements during his stay abroad, the high esteem in which he was held and pointed to his picture on the wall. He got even more excited and said: "You say this because you can't feel the way I do. You live in your country and among your people!" As soon as Salam had uttered these words, his eyes became wet and tears started rolling down his face. I just held his hand and did not know what to say.

But the Salam I met in his Oxford home in July, 1994, was not the same Salam. I was meeting him after nearly five years. As I entered has sitting room, I saw his shrunken figure slumped into a sofa chair with his sweater and trousers hanging around him loosely. No more was the hearty laugh, just a faint smile, and no more the firm handshake. As I sat down, he just fixed his gaze on me and kept listening to what I was saying. He murmured a few words but could not converse with me. His ailment had taken its toll. Only his eyes had some of the old shine.

Just before leaving Oxford when I went to say goodbye to Salam, his son Umar asked me to write something in the visitors' book. Keeping in mind Salam's curiosity about the nature of the Universe as a scientist, and his interest in Ghalib which he had evinced when I presented my book on the poet to him during our meeting in October 1989, I added, to the few words in English, the following from Ghalib:

Salam looked at what I had written, gave me a smile with a nod and extended his hand to me — a gesture I will never forget.

A genius called Abdus Salam

A deeply religious man, Salam's belief in God was strengthened by his conviction that the 'unifying force' underlying the weak and strong electromagnetic forces was the Deity. For him, there was no contradiction between science and religion.

By Irfan Husain

The Herald, December 1996

ڈگریاں حاصل کیں۔"

میزائل ریسرچ

"میزائل ریسرچ اور اس کے ملحقہ میدانوں میں ترقی کیلئے سلام نے خلاء اور بالائی فضا کی تحقیقی کمیٹی "سپارکو" کی بنیاد رکھی اور کچھ عرصہ تک اس کے چیئرمین بھی رہے۔"

سوشل سائنسز کا میدان

پروفیسر سلام پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کتنا فروغ دینا چاہتے تھے اور اپنے ملک کی معاشرتی اور معاشی مسائل کے حل کیلئے اپنے دل میں کیا جذبہ اور کیا تڑپ پاتے تھے اس کی عکاسی ان کے اس خطبے سے ہوتی ہے جو انہوں نے جنوری ۱۹۶۱ء میں ڈھاکہ "انجمن ترقی سائنس پاکستان" کے موقع پر دیا تھا ان کی تقریر کا موضوع تھا۔ "ٹیکنالوجی اور پاکستان کی غربت کے خلاف جنگ" ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب "ڈاکٹر عبدالسلام" کے صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۲ سے ڈاکٹر سلام کی متذکرہ تقریر کے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

"ہم پاکستانی غریب قوم ہیں۔ نسل انسانی کی غالب اکثریت کی مانند غربت ہمارا سب سے بڑا اور گھمبیر مسئلہ ہے۔"

"پہلے تو ایک معاشرہ کو مطلوبہ ٹیکنالوجیکل مہارت و لیاقت حاصل کرنی چاہئے دوسرے اسے قومی آمدنی کا پانچ فی صد حصہ بچانا چاہئے اور اسے پیداواری منصوبوں میں انویسٹ کرنا چاہئے"

ہمارا افلاس صرف مادی نقطہ و نظر سے ہی نہیں بلکہ روحانی نقطہ نظر سے بھی ایک اہم مسئلہ ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"یہ ناممکن نہیں کہ غربت اور کفر ہم معنی بن جائیں" مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے پورے زور کے ساتھ کہوں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان پاکستان کی ہر مذہبی درس گاہ کے دروازہ پر روشن حروف سے لکھدیا جائے۔ کفر کو پرکھنے کے اور بھی بہت سے پیمانے ہوں گے۔ لیکن اس صدی میں میرے ناچیز خیال میں کفر کا معیاری پیمانہ' غربت کو بغیر قومی سطح پر جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کے خاموشی سے سہتے چلے جانا ہے۔

Pinstech کا قیام

سلام نے صدر پاکستان (ایوب خان) کو مجبور لیا کہ وہ "پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی" کی منظوری اور ہدایت دے دیں۔ جو ایک تخلیقی سائنسی یادگار ہوگا جس کی بدولت پاکستان میں سائنسی تعلیمات کا احیاء ہوگا۔ سلام کی باتیں ایوب خان کے دل لگیں۔ چنانچہ جلد ہی اسلام آباد میں نیلور کے مقام پر Pinstech کا قیام عمل میں آگیا۔

سیدو شریف کی سوات کانفرنس:

یہ کانفرنس ڈاکٹر عبدالسلام کے مشورہ پر اگست ۱۹۶۵ء میں سیدو شریف کے مقام پر منعقد ہوئی۔ اس میں ملک کے چوٹی کے سائنسدان شامل ہوئے۔ خود صدر ایوب خان بھی اس موقع پر موجود تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے کانفرنس سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے اس کانفرنس کیلئے "خاص الخاص سائنس کانفرنس" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

"اپنے اس خطاب میں سلام نے ریسرچ کیلئے مجموعی قومی پیداوار کے ایک فیصد کیلئے درخواست کی تھی اور یہ کہ ریسرچ کے معاملات روائتی بیوروکریسی کے کنٹرول میں نہ ہوں۔ سائنسی کاموں کے سلسلہ میں سلام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کیں۔"

سیم اور تھور:۔ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب رقمطراز ہیں۔

سلام نے سیم اور تھور (شور) پر بھی چند مضامین لکھے ہیں انہیں اس پریشان کن مسئلہ کے حل کی اتنی فکر تھی کہ انہوں نے حکومت کو مجبور کیا تھا کہ اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے امریکی ماہرین کی ٹیم پاکستان بلوائی جائے۔ چنانچہ صدر کینیڈی کے سائنسی مشیر جیروم ویسنر کی درخواست اور صدر کینیڈی کی ہدایت پر ایک اعلیٰ سطح کا سائنسی مشن ۱۹۶۱ء میں بھیجا گیا۔"

اسلامک سائنس فاؤنڈیشن

جیسا کہ آپ جانتے ہیں مسلم ممالک اپنی نفری اور دولت کے باوجود وقت کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے مغربی ممالک سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں مسلم اقوام کی عظمت اور شوکت کا راز اس بات میں پنہاں ہے

کہ اپنا دینی تشخص قائم رکھتے ہوئے وہ سائنسی اور ٹکنیکی میدان میں بھی آگے بڑھنے کی بھرپور کوشش کریں۔ تاکہ مسلم معاشرے سے جہالت، افلاس، بے انصافی اور کاہلی کا خاتمہ کرنے میں مدد مل سکے۔

لاہور میں منعقدہ اسلامی کانفرنس ۱۹۷۴ء کے موقع پر ڈاکٹر عبدالسلام نے "اسلامک سائنس فاؤنڈیشن" کے قیام کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر عبدالغنی رقمطراز ہیں۔

"سلام نے یہ تجویز پیش کی کہ اس فاؤنڈیشن کا قیام اعلیٰ سطح پر ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کو اپنا ہدف بناتے ہوئے اسلامی ملکوں کی مدد سے عمل میں لایا جائے فاؤنڈیشن کی سرپرستی اسلامی ممالک کریں۔ فاؤنڈیشن قطعی طور پر غیر سیاسی ہو اور خالصتاً سائنسی ہو۔ اسے مسلم ممالک کے چوٹی کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین چلائیں۔"

دنیا بھر کی خدمت

ڈاکٹر عبدالسلام کامیابیوں کے زینے متواتر طے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ۱۹۶۴ء میں جب کہ وہ سائنس کی دنیا میں ایک عبقری کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ انہوں ٹریسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس طرح کے سنٹر کی تجویز دراصل ڈاکٹر سلام کے ذہن میں بہت پہلے سے موجود تھی۔ اور ان کی شدید خواہش تھی کہ یہ سنٹر پاکستان میں کھولا جائے ڈاکٹر عبدالغنی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

۱۹۶۳ء میں سلام نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ حکومت پاکستان میں اس سنٹر کے قیام کی منظوری دیدے۔ سلام کی موجودگی میں صدر ایواب نے ٹیلیفون پر اپنے وزیر خزانہ سے اس سلسلہ میں مشورہ مانگا تو انہوں نے جواب دیا کہ "جناب پروفیسر دنیا بھر کی سائنسی کمیونٹی کیلئے ایک بین الاقوامی ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ پاکستان میں کوئی نظریاتی طبیعات کا سکول۔

درست ہی فرمایا تھا مرزا اسد اللہ غالب نے کہ

ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطے نے محرم سے مجرم کر دیا۔

لیکن پروفیسر عبدالسلام کا یہ جذبہ صادق ضائع نہ گیا اور اطالوی حکومت نے یہ فراخدلانہ پیش کش کر دی کہ پروفیسر سلام کا مجوزہ سنٹر ٹریسٹ شہر میں کھولا جائے اس طرح اس مرکز نے ۱۹۶۴ء میں اپنا کام شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کی انتظامی صلاحیتوں اور کوششوں کو ڈاکٹر عبدالغنی یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

"سلام نے بے حد محنت، جذبہ صادق اور سچی لگن کے ساتھ اس مرکز کو چلایا ہے۔ انہوں نے اپنی منفرد شخصیت وسیع اور گہری سائنسی دلچسپی، تبحر علمی ہر موضوع کو گرفت میں لینے کی بے پناہ صلاحیتوں، علمی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی امور پر گرفت (جن پر انہوں نے بڑی آسانی اور اتھارٹی سے لکھا ہے) اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں دنیاؤں کے لوگوں کے بارے میں گہری اور صحیح واقفیت کی بدولت اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا ہر طرح سے اہل ثابت کر دیا ہے۔ اور وہ آج دنیائے سائنس کے متفقہ لیڈر ہیں۔"

یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے اس عظیم کارنامے کی وجہ سے آپ کو ۱۹۶۸ء میں "ایٹم برائے امن" انعام دیا گیا اور اس موقع پر پڑھے جانے والے مضمون میں اعتراف کیا گیا کہ

"آپ نے ایک بڑی انتظامی ذمہ داری سنبھال کر اقوام عالم کی کوششوں اور خیالات کی راہنمائی کرنے اور انہیں ایک خاص نصب العین پر مرتکز کرنے میں مدد دی ہے۔"

صدی کی سب سے بڑی سائنسی کامیابی

اٹلی کا بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعات ICTP کا قیام ڈاکٹر عبدالسلام کی کتنی بڑی کاوش اور کامیابی ہے اس کے متعلق معروف علمی اور سائنسی شخصیت ڈاکٹر انیس عالم کے مضمون "ڈاکٹر سلام کی یاد میں" مطبوعہ دی نیشن ۲۹ نومبر ۱۹۹۶ء کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"سلام نے سائنس کی دنیا میں جو کام کیا اس کو بے شمار لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ پچھلی جنوری میں جب ان کی ۷۰ ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر یورپین فزیکل سوسائٹی کے صدر پروفیسر ہروگ شوپر نے ڈاکٹر سلام کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ "فزکس کیلئے آپ کی عظیم خدمات کو وسیع پیمانے پر

تسلیم کیا جا چکا ہے اور انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یقیناً آپ کی سائنسی کامیابیوں کے علاوہ انٹرنیشنل سنٹر برائے تھیوریٹکل فزکس ICTP کا قیام اس صدی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

"قائداعظم یونیورسٹی میں طبیعات کے معروف اور علم دوست پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق ایک مضمون لکھا جو انگریزی اخبار نیوز کے ۲۹ جنوری ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں صفحہ ۶ پر شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر ہود بھائی لکھتے ہیں۔

"سلام اٹلی کے شہر Trieste میں بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعات ICTP قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اٹلی کی بجائے پاکستان میں کیوں نہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے۔ پاکستان نے کوئی دلچسپی نہ ظاہر کی۔ لیکن اٹلی اس مرکز کا خواہشمند تھا اور اس کے لئے خطیر رقم خرچ کرنے پر تیار تھا۔ آج آئی سی ٹی پی عمارتوں کا ایک پھیلتا ہوا سلسلہ ہے جہاں پر پچاس سے زائد ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان تحقیقی کام کیلئے باقاعدگی سے حاضر ہوتے ہیں۔ پاکستانی سائنسدان ایک ہزار سے زائد مرتبہ قیام کر چکے ہیں۔"

اعداد و شمار کا ذکر۔ دنیا بھر کی خدمت

انگریزی روزنامہ ڈان نے اپنی ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر جو اداریہ لکھا اس میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے علم و فضل اور ٹریسٹ مرکز کے ذکر میں یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

"درحقیقت ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۰ء سے ذراتی طبیعات کے میدان میں ہونے والی تقریباً ہر پیش رفت میں ان کا حصہ ہے ان کو دنیا بھر سے ایوارڈ اور اعزازی ڈگریاں ملیں لیکن غالباً ڈاکٹر عبدالسلام کو سب سے زیادہ تکمیل خواہش ٹریسٹ میں تھیوریٹکل فزکس کے بین الاقوامی مرکز کی تخلیق میں حاصل ہوئی جو انہوں نے ایک ادارہ کی شکل میں قائم کیا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان ترقی یافتہ ممالک کے سائنسدانوں کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔ ۱۹۶۴ء میں اس کے آغاز سے لے کر گزشتہ برس تک اس مرکز نے یہاں پر آنے والے چالیس ہزار سے زائد سائنسدانوں کو تحقیق کے میدان میں تربیت دی ہے۔ جو چیز انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کا انسانیت کیلئے گہرا احساس تھا۔"

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

انگریزی اخبار "دی نیوز" مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء میں ایک مضمون بعنوان "ڈاکٹر عبدالسلام۔ پاکستان کا ایک عبقری اور سرمایہ افتخار" شائع ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے کام کے معمول اور جذبہ کا یوں ذکر ہے۔

"ٹریسٹ (اٹلی) میں وہ اپنے کام کا آغاز صبح ساڑھے آٹھ بجے کرتے اور دوپہر کے کھانے کیلئے معمولی سے وقفہ کو چھوڑ کر گیارہ بارہ گھنٹے کے بعد اپنے کام کو اختتام کرتے۔ ان کے دوست کہا کرتے تھے کہ ان کے باتھ روم میں بھی ایک میز کتابوں سے لدی پڑی رہتی ہے۔ انہیں کام کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔"

تیسری دنیا کی خصوصی خدمت

نظریاتی طبیعات کے بین الاقوامی مرکز واقع (ٹریسٹ اٹلی) کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک اور زبردست کارنامہ سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی درماندگی پر عبدالسلام کے کرب اور ان کی تڑپ کا اظہار صرف ان کی سربراہی میں قائم نظریاتی طبیعات کے بین الاقوامی مرکز۔ اس کی روز افزوں ترقی اور اس کے تیسری دنیا میں سائنس کے مختلف النوع منصوبوں کی شکل میں ہی نہیں ہوا۔ ان کا دردمند دل انہیں یہ مستقل باور کراتا رہا کہ دنیا کی دو تہائی آبادی کیلئے یہ مرکز اپنے کارکنوں کے بے مثال جانفشانی اور خلوص کے باوجود بھی ناکافی ہے۔ سلام کو اپنی منزل مقصود ۱۹۸۳ء میں "سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا" کی شکل میں ملی۔"

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں۔

"سائنس اکیڈیمی برائے تیسری دنیا" نظریاتی طبیعات کے مرکز کے بعد تیسری دنیا پر سلام کی دوسری بڑی عنایت ہے اس اکیڈمی نے تیسری دنیا میں سائنسی انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی ہے اور سلام کی اس سے جذباتی وابستگی اس بات کی ضامن ہے کہ یہ لہر ہر آن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

روزنامہ دی نیشن کا اداریہ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۹۶ء متذکرہ اداریہ کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔

"نہ صرف پاکستان بلکہ تیسری دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی سائنسی ترقی سے متعلق ان کی فکر مندی اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے "سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا" کی بنیاد رکھی۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کئی بار پاکستان آکر یہاں پر لمبا قیام کیا اور مختلف حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ سائنس کی اہمیت کا ادراک کریں اور ملک میں سائنسی تحقیق کے ادارے قائم کرنے کیلئے زیادہ رقم مختص کریں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معروضات پر کان نہیں دھرا گیا اور زبانی یقین دہانیوں کے باوجود کبھی بھی کوئی ٹھوس پروگرام نہیں کیا گیا۔"

برطانوی اخبار گارڈین کا خراج تحسین

بحوالہ جنگ مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۹۶ء پاکستان "نوبیل" انعام یافتہ سائنسدان پروفیسر عبدالسلام شمال اور جنوب کے درمیان پل بنے ہوئے تھے۔ برطانوی اخبار گارڈین نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے کام کیا۔"

ہم سخن فہم ہیں.......

خاکسار کو حال ہی میں میرے ایک نہایت ہی محترم اور مہربان دوست نے لندن سے گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے جناب ایچ' ایس ورک کے ایک نہایت ہی قیمتی اور مفصل مضمون کی فوٹو کاپی ارسال کی ہے جس کا عنوان ہے "عبدالسلام نامی عبقری" یہ مضمون ایک وسیع انگریزی میگزین "کرنٹ سائنس" میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ترجمہ:۔ تھرڈ ورلڈ اکیڈمی (سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا) کی بنیاد چالیس عالمی شہرت یافتہ سائنسدانوں کے ایک گروپ نے جس میں تیسری دنیا کے نو نوبیل لاریٹ شامل تھے۔ ۱۹۸۳ء میں ٹریسٹ کے مقام پر رکھی۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء کے دوران ڈاکٹر عبدالسلام خود تیسری دنیا کے بہت سے ممالک میں گئے اور مختلف سربراہان سے ملاقات کی جنہوں نے مدد کا وعدہ کیا۔

جناب ایچ ایس ورک متذکرہ بلند پایہ مضمون کو ان عقیدت بھرے الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

اگر ٹریسٹ اپنے سن آغاز ۱۹۶۴ء سے لے کر سال ہا سال سے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کی امید و آرزو کی آماجگاہ بن گیا ہے تو پنجاب کے ذہین وفطین فرزند اور نوبیل لاریٹ عبدالسلام کیلئے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کیلئے "اوتار" کا کردار ادا کرنا مقدر ہو چکا تھا۔ اللہ اپنے بندے پر رحمت نازل فرمائے۔)

ہم نے ہر حال میں تیرا افسانہ کہا

ڈاکٹر عبدالسلام وطن عزیز پاکستان اور پاکستان کے مسلم برادر ممالک کی ترقی اور وقار کیلئے کتنے کوشاں اور آرزومند رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں کچھ حوالے مختصراً پیش کئے جاتے ہیں۔

سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن ڈاکٹر منیر احمد خان کا ڈاکٹر سلام کے متعلق ایک مضمون روزنامہ آج کل مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے آغاز میں آپ لکھتے ہیں۔

بہت کم پاکستانیوں نے پروفیسر عبدالسلام کی طرح پاکستان کا وقار بڑھایا ہے۔ وہ نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے سائنسدان تھے بلکہ شائد اس صدی کے دوران مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے عظیم ترین سائنس دان بھی تھے۔"

روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ (انگریزی) نے ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق اپنی ۲۳ نومبر ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں ایک اداریہ لکھا۔ جس میں ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ اخبار لکھتا ہے۔

ان کی وفات سے پاکستانی سائنس بلکہ درحقیقت مسلم دنیا کی سائنس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے کیونکہ وہ واحد سائنسدان ہے

جن کی طبیعات میں خدمات کیلئے ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔

وطن عزیز کے معروف ماہر تعلیم اور ادیب پروفیسر خواجہ مسعود کا ایک مضمون ڈاکٹر عبدالسلام کے بارہ میں دی نیوز مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر موصوف رقمطراز ہیں۔

"اسلامی ممالک کیلئے انہوں نے ایک کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا خیال پیش کیا۔ انہوں نے مسلم ممالک کے بڑے بڑے حکمرانوں سے اپیل کی کہ یہ کوئی بے فائدہ خواب نہیں ہے۔ لیکن ان کی یہ اپیل صدا بصحراء ثابت ہوئی۔ جب سلام کا دماغ ریاضی کی مساوات حل کرنے میں مشغول ہوتا تھا تو اس وقت ان کا دل تیسری دنیا کے لوگوں کی غربت کا سوچ کر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔"

روزنامہ پاکستان مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۹۶ء میں جناب عبدالعزیز خالد کے مطبوعہ مضمون "وطن میں اجنبی" کا کچھ حصہ پڑھتے ہیں۔

"علامہ مشرقی کے بعد یہ غالباً دوسرے نابغہ روزگار سائنس دان ہیں جن کا قرآن سے شغف عشق کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ان کے مضامین کا مجموعہ ارمان اور حقیقت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اپنے مضامین میں بار بار یہ صاحب دل شخص عالم اسلام اور خصوصاً ارض پاکستان کی سائنسی علوم و معارف سے بے اعتنائی و محرومی پر رنجیدہ و دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ وہ بار بار مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی پر آنسو بہاتا ہے۔ انہیں ان کے اسلاف کے عملی کارناموں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے یورپ کو اس کی گہری نیند سے جگایا اور احیائے علوم کے دور کا آغاز کیا مگر تاسف سے کہتا ہے کہ بیداد بخت دوسروں کو جگا کر خود خواب غفلت میں کھو گئے اور ایسے کھوئے کہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں ہیں۔"

شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

الفت الفت' بیر بیر' کعبہ کعبہ' دیر دیر
ہم سے نفرت ہوش کر' اپنا اپنا غیر غیر

اور لعل و جواہر کیا ہیں!!!

ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی خداداد ذہانت قابلیت اور محنت کی بدولت بے شمار گرانقدر اور عالمی نوعیت کے انعامات حاصل کئے لیکن ان کا استعمال کس طرح کیا اس کے لئے ممتاز علمی و ادبی شخصیت پروفیسر خواجہ مسعود کے مضمون "سلام۔ دو دنیاؤں کا انسان" مطبوعہ دی نیوز ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء سے یہ اقتباس پڑھئے۔

"بیسویں صدی نے جو عظیم ترین سائنسدان پیدا کئے وہ ان میں سے ایک تھے لیکن وہ ایک بہت عظیم انسان بھی تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ "نوبیل پرائز" جیسے انعامات صرف اللہ تعالیٰ کی عنائت ہیں اور خدا کے نام پر ہی ان کو صرف کیا جانا چاہئے۔ وہ جس بات پر ایمان رکھتے تھے۔ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے اس فلسفہ پر تمام عمر عمل کیا اور اپنے تمام بڑے بڑے انعامات کو اسی طرح خرچ کیا۔ ان انعامات میں ایٹم برائے امن ایوارڈ مالیتی تیس ہزار ڈالر' نوبیل پرائز مالیتی چھیاسٹھ ہزار ڈالر' بارسلونا پرائز مالیتی ایک لاکھ ڈالر اور ایڈنبرا پرائز مالیتی پانچ ہزار ڈالر شامل تھے اور ان تمام رقومات کو اسی طرح خدمت کے طور پر دے دیا گیا۔ اقبال کا یہ مجسم استغناء یقیناً ایک خدارسیدہ انسان تھا۔"

تیری گلیوں کے نثار میرے وطن

ڈاکٹر عبدالسلام کے سارے عالم کی غم خواری اور خدمت کے سچے جذبہ کا اعتراف مشرق و مغرب میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ روزنامہ "ڈان" نے اپنے ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء کے اداریے میں واضح طور پر تحریر کیا:۔

"جو چیز انہیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کا انسانیت کے لئے گہرا احساس تھا..... وہ ایک بہتر نئی دنیا کی تخلیق میں دلچسپی رکھتے تھے"۔

یا جیسا کہ پروفیسر خواجہ مسعود صاحب اپنے مضمون مطبوعہ "دی نیوز" (۹۷-۱۲-۲۳) کے آخر پر لکھتے ہیں:۔

"سلام کے کئی خواب تھے اور وہ سب کے سب مظلوم انسانیت کی بھلائی کے لئے تھے"۔

لیکن پاکستان سے تو جیسے ڈاکٹر عبدالسلام کو عشق تھا۔ جنون تھا۔ وہ وطن عزیز پر نثار ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس حقیقت کی جھلک زیر نظر مضمون میں درج مستند اور وقیع حوالوں میں صاف موجود ہے جو ہمارے معزز قارئین گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

اب دو تین مزید بین حوالے درج کئے جاتے ہیں:۔

(الف) قائد اعظم یونیورسٹی (اسلام آباد) کے معروف پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی اپنے مضمون "عبدالسلام۔ ماضی اور حال" مطبوعہ "دی نیوز" (۹۶۔۱۔۲۹) صفحہ ۶ پر تحریر کرتے ہیں:۔

"سلام نے برطانیہ اور اٹلی کی پیشکش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی پاکستانی شہریت قائم رکھی۔ ان کے ٹرسٹ کے مرکز میں تمام پاکستانی جن میں کٹر مخالفین احمدیت شامل تھے ترجیحی سلوک کا مورد بنتے اور ڈائریکٹر (عبدالسلام) تک نسبتاً آسانی سے رسائی حاصل کر لیتے۔ بعض دفعہ دوسرے ممالک کے زائرین کو یہ بات ناگوار گزرتی پھر بھی اصولی لحاظ سے سلام کی اس طرفداری کو غلط سمجھا جاتا تھا لیکن یہ ان کی اپنے پیدائشی ملک (جنم بھومی) سے گہری وابستگی کی واضح علامت ہے"۔

پروفیسر خواجہ مسعود ڈاکٹر سلام کے متعلق اپنے مضمون مطبوعہ دی نیوز مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء میں تحریر کرتے ہیں۔

"نوبیل پرائز دیئے جانے کی تقریب میں ڈاکٹر سلام نے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ ایک پاکستانی کے طور پر جانے اور پہنچانے جائیں۔ اس موقع پر ان کا لباس اچکن، پگڑی جس پر سیدھا طرہ بھی اٹھا ہوا تھا اور سنہرے کام والے کھسے پر مشتمل تھا۔"

متذکرہ مضمون کے پہلے کالم میں پروفیسر خواجہ مسعود صاحب لکھتے ہیں۔

"وہ پاکستانیوں سے اپنے دل و جان سے پیار کرتے تھے جب کوئی انہیں بتاتا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔"

ڈاکٹر منیر احمد خان اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ "آج کل" مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء میں رقمطراز ہیں۔

"عالمی شہرت کے حامل سائنس دان ہونے کے علاوہ وہ ایک تخیل پرست، محب وطن، اپنی سرزمین کے خادم اور سب سے بڑھ کر ایک منکسر المزاج انسان تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان میں ہزاروں اعلیٰ تربیت یافتہ سائنسدان چھوڑے ہیں جو اکیسویں صدی میں انکے مشن کو جاری رکھیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ہمارے لئے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کیلئے بہت کچھ کیا لیکن ہمارے پاس ان کا قرض چکانے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

وطن کی مٹی گواہ رہنا!!

ڈاکٹر عبدالسلام کی وطن عزیز پاکستان سے محبت ان کی موت کے بعد بھی قائم رہی وہ یوں کہ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ انہیں پاکستان میں ہی دفن کیا جائے۔

مر کے بھی شمع سے رہ نہ سکا دور
خاک بن بن کے اڑا پروانہ

اس سلسلہ میں پروفیسر خواجہ مسعود صاحب روزنامہ دی نیوز مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں اپنے مضمون "سلام۔ دو دنیاؤں کا انسان" میں لکھتے ہیں۔

اٹلی کی حکومت نے اس عہدے (ڈائریکٹر جنرل یونیسکو۔ ناقل) کیلئے ڈاکٹر سلام کو اپنی طرف سے نامزد کرنے کی پیشکش کی لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا کہ انہیں اپنی پاکستانی شہریت تبدیل کرنا پڑتی۔ انہوں نے اس سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ایک پاکستانی کے طور پر ہی زندہ رہنا اور مرنا چاہتے تھے۔"

روزنامہ پاکستان مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۹۶ء میں ملک کی مشہور ادبی شخصیت جناب عبدالعزیز خالد کا ایک رقت انگیز مضمون بعنوان "وطن میں اجنبی" شائع ہوا ہے۔ جس کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے۔

"پاکستان کے مایہ ناز فرزند، شہرہ آفاق سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام نے آخر جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ ان کی سرزمین وطن سے گہری، بے غبار اور اٹوٹ محبت کا ثبوت ہے۔ کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو اسی خاک پاک نے اپنی آغوش میں لیا۔"

روزنامہ جنگ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۹۶ء نے صفحہ اول پر یہ خبر دی۔

"لندن سے موصولہ اطلاعات کے مطابق نوبیل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی میت پروگرام کے مطابق کل ۲۴ نومبر کو صبح سات بجے لاہور لائی جا رہی ہے اور وہاں سے اسے ربوہ لایا جائے گا۔ عبدالسلام کی وصیت کے مطابق انہیں ربوہ کے قبرستان میں

ان کے والد چوہدری محمد حسین کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالسلام ایک لمبے عرصہ تک بیرونی ممالک میں رہائش پذیر رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی پاکستانی شہریت کو قائم رکھا۔ ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے کیلئے پاکستان اور بیرون پاکستان سے ہزاروں افراد شرکت کریں گے۔ جماعت کی طرف سے تمام مہمانوں کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور ہزاروں رضا کاروں کی ڈیوٹیاں لگائی جا رہی ہیں۔"

ہم زندہ قوم ہیں!!!

اب جماعت کے موقر اخبار "الفضل" مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۹۶ء صفحہ ۱، ۷ سے کچھ بیان حسب انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔

استقبال

"جنازہ کا جلوس شام سوا سات بجے ربوہ پہنچا۔ جہاں لجنہ اماء اللہ کے دفتر کے قریب چوک سے اہل ربوہ کی بڑی بھاری تعداد دونوں اطراف کھڑی اپنے ہیرو کے استقبال کیلئے چشم براہ تھی۔ ان میں سے کئی لوگ شام پانچ بجے سے کھڑے تھے۔"

نماز جنازہ

محترم ڈاکٹر صاحب کا جنازہ جب احاطہ لجنہ سے روانہ ہوا تو خدمت خلق کے رضاکاروں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک وسیع دائرہ بنا لیا جس کے اندر محترم ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے افراد اور جماعت احمدیہ کے چیدہ چیدہ افراد موجود تھے۔ بہشتی مقبرہ کے اندر قبر کے گرد ایسا ہی ایک وسیع دائرہ بنایا گیا تھا۔"

سپرد خاک

"پونے گیارہ بجے جنازہ بہشتی مقبرہ پہنچا جہاں پر قطعہ نمبر ۱۲ میں جہاں محترم پروفیسر عبدالسلام صاحب کے والد محترم حضرت چوہدری محمد حسین صاحب اور والدہ محترمہ ہاجرہ بیگم صاحبہ کی قبریں ہیں وہاں تدفین عمل میں آئی۔ تدفین مکمل ہونے پر محترم صاحبزادہ مرزا منصور

احمد صاحب نے ساڑھے گیارہ بجے دعا کرائی"۔

خوب طے تو نے کیا اپنا سفر سوئے معاد
زندہ باد و زندہ باد، زندہ باد و زندہ باد

پاکستانی سیاست کی سنگدلی یا سرد مہری

قارئین! یہ ڈاکٹر عبدالسلام جس کی قابلیت، حسن اخلاق، ہمدری خلق اور پاکستان سے وفاداری کا ساری دنیا نے کھل کر اظہار کیا۔ اس دنیا کے مایہ ناز ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ ان کی زندگی میں پاکستانی سیاست نے جو سلوک کیا اس کا ذکر آپ اس رسالہ میں دوسری جگہ ملاحظہ کر چکے ہوں گے۔ یہاں پر میں ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست اور میڈیا کا ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے انداز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستانی میڈیا جو فلمی ہیرو یا ہیروئن اور کرکٹ ہیروز کا تذکرہ کئی کئی دن اور پورے پورے صفحات کے ساتھ کرتا ہے اس نے اپنے اس علمی ہیرو کو اپنے اخبارات کے چند کالموں میں جگہ دی اور دوسرے تیسرے دن یہ کالم اندر کے صفحات میں منتقل ہو گئے۔ آپ کے جنازہ اور تدفین کو نہ اخبارات نے اور نہ ہی ملکی ٹی وی نے کوریج دی۔ اور ملکی سیاست کا یہ حال تھا کہ ہمارے ملک کے سیاستدانوں میں سے کسی نے بھی یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ اپنے اس ہیرو جو ساری زندگی اس ملک پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور اس کے نام کی بلندی کیلئے کوشاں رہا۔ اس کے آخری دیدار اور اس کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے آئے۔ پاکستانی سیاست اور میڈیا کے اس سلوک سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ہماری ذہنیت اور سوچ کیا ہے اور علم اور علمی ہیروز کا ہماری نظر میں کیا مقام ہے۔ اور وہ وفات کے بعد بھی وطن میں اجنبی ہی رہا۔

وحدت ـــــ حقیقت اور عبدالسلام

پروفیسر عبدالسلام کی خدمات کا اعتراف

پروفیسر جان زیمان ـ برسٹل یونیورسٹی

عبدالسلام کی زندگی اور کارہائے نمایاں دونوں میں ایک ہی تصور کار فرما ہے اور وہ ہے ارتباط و اتحاد۔ عبدالسلام دین پر ایمان رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کو نظریہ وحدت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وحدت جو کہ فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے اور بنی آدم کو اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیے ہوئے۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے عبدالسلام اس نکتے تک پہنچے کہ بنیادی مادی ذرات کے مابین کار فرما مختلف النوع قوتوں کو اصل میں صرف ایک بنیادی مادی قوت کی مختلف شکلوں کے علاوہ کچھ اور نہ ہونا چاہئے۔ ایک سیاسی اور اخلاقی رہنما کی حیثیت سے انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ قوموں اور تہذیبوں کا اختلاف ایک عالمی سائنسی برادری کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

آج اس عظیم ہستی کا استقبال ہم اپنی فیکلٹی میں اس لئے کر رہے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت تمام دنیا میں نظریاتی طبیعات کے ممتاز ترین ماہرین میں سے ایک ہیں۔ کیمبرج میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی انہوں نے ایسا نمایاں تحقیقی کام کیا تھا کہ اس پر ۱۹۵۰ء میں ان کو اسمتھ پرائز (Smith Prize) سے نوازا گیا۔ اس دن سے آج تک عبدالسلام لگاتار تحقیق کی مہم پر سر کر رہے ہیں۔ ان کے اس تحقیقی مشن کی نوعیت جواہر حقیقت کی مشکل کان کنی کی مانند ہے۔ جس میں عبدالسلام دھیرے دھیرے پتھروں کو ہٹا کر، علمی گتھیوں کو سلجھا کر، حقیقت (کے جواہر و الماس) کو عیاں کرنے کی جدوجہد میں مستقل لگے ہوئے ہیں۔ کوانٹم طبیعات کے پیرہن میں پنہاں مادے کے بنیادی اجزا کی کھوج اور اس کی تفہیم کے ڈرامے کے ہر سین میں عبدالسلام نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ عوامی امور میں بھی کافی عمل دخل رکھنے کے باوجود بنیادی ذرات کی فزکس میں اب تک دو سو سے زائد نمایاں تحقیقی مقالات پیش کر چکے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اب بھی شدید مطالبوں اور ذہنی کاوشوں کی ہل چل کے درمیان لگاتار اپنے لیے راہ بناتے چلے جا رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج بھی عبدالسلام تحقیق کے میدان میں اتنی مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے مصروف کار زار ہیں کہ میں نے ان کے کارناموں کی مکمل فہرست کندہ کرانے کی ہمت ابھی تک نہیں کی ہے۔ کیا معلوم کہ آنے والی صبح میں کہیں کوئی مشاہدہ ہو جس کے نتیجے میں عبدالسلام کی کارگزاریوں کی فہرست میں ایک نئی تھیوری کا اضافہ ہو جائے۔ عبدالسلام غیر معمولی سائنسی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مادی حقائق پر مبنی ایسے نظریاتی رشتے باسانی تجویز کر دیتے ہیں جن کی صداقت کو پرکھنے کی کاوش رائیگاں جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ عبدالسلام کے تشکیل کردہ الیکٹرو ویک قوت کے تصور نے ان کو ۱۹۷۹ء کے طبیعات کے نوبل پرائز میں حصے دار بنایا۔ اس تصور کو انہوں نے ۱۳ سال قبل پیش کیا تھا۔ اس کے بعد تین چار سال تک کسی نے اس پر وقت صرف نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظریے کو سمجھنے کی راہ میں تقریباً ناقابل عبور ریاضیاتی

مسائل در پیش تھے۔ جب یہ مسائل بھی حل ہو گئے تب ان ریاضیاتی پیشین گوئیوں کو احتیاط طلب اور نازک و نفیس تجربات کے ذریعے سچ ثابت کرنے کا نمبر آیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس ولولہ انگیز دور میں (Trieste) ہی میں تھا جب عبدالسلام کے الیکٹروویک قوت کے نظریے کی روشنی میں کی گئی پیشین گوئیوں کی صداقت پر کھنے کے لیے دنیا میں کئے گئے تجربوں کے نتائج آنے شروع ہوئے تھے۔ مختلف براعظموں میں بکھری ہوئی تجربہ گاہوں سے بذریعہ ٹیلیفون اعداد و شمار حاصل کیے جا رہے تھے اور ان کو چیک کیا جا رہا تھا۔ اولین نتائج سے ایسا لگتا تھا کہ شاید حقیقت عبدالسلام کے نظریے کے برعکس ہے، لیکن عبدالسلام کے اطمینان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور وہ اپنے نظریے پر اٹل رہے اور آخر کار کامیابی نے ان کو لبیک کہا۔ اس دن (Trieste) میں ہم سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ یہ کہنا درست ہی ہوگا کہ عبدالسلام میں فزکس کیلئے ایک ایسا ولولہ ہے جو دوسرے لوگوں میں بھی اس علم کیلئے جذبہ کشش کے خوشگوار و سبک احساسات کو خوش اسلوبی سے ابھار دیتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کو الیکٹروویک قوت کے نظریے کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ سب جانتے ہیں کہ نیوٹران جس قوت کے تحت پروٹان اور الیکٹران میں تبدیل ہوتا ہے، اس کو کمزور یا "ویک" قوت (Weak Force) کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قوت جس کی واقفیت عام ہے وہ ہے برقی ذرات کے درمیان کام کرنے والی برقی مقناطیسی قوت (Electromagnetic Force) عبدالسلام نے اپنے الیکٹروویک قوت کے نظریے میں یہ تجویز کیا کہ ذرات کے زوال میں کار فرما قوت کو الگ حیثیت دینے کی بجائے اس کو برقی مقناطیسی قوت کا جز ماننا چاہئے۔ اس وقت اس نظریے کو سمجھنا ہنسی کھیل نہ تھا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ عبدالسلام کا طریقہ فکر و کار دوسروں سے الگ ہے۔ آج کل کے نظریاتی طبیعات کے ماہرین کے مقابلے میں عبدالسلام ریاضیاتی مسائل ذرا پرانے ڈھنگ سے حل کرتے ہیں لیکن بلاشبہ ان کو اس کام میں مہارت حاصل ہے۔ فیراڈے (Faraday) اور میکسویل (Maxwell) اگر آج اوپر بیان کیے گئے کارنامے کو دیکھ سکتے تو بہت خوش ہوتے۔ کیوں کہ عبدالسلام کا یہ کام ان جید سائنس دانوں کے اس معرکۃ الآراء کام سے مشابہت رکھتا ہے جس میں انہوں نے سو سے زائد برس پہلے مقناطیس اور برق کو یک جا کر کے ایک رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔

رسمی انداز میں سائنس کی سمٹی ہوئی تہوں کو پھیلا کر عیاں کرنے کا منظر پر لطف ہوتا ہے۔ قدرے قدامتی طرز میں کام کرنے کی وجہ سے عبدالسلام کو جدوجہد تو خاصی سخت کرنی پڑی لیکن ان کو ایسی کامیابی ملی جس نے کوانٹم طبیعات میں ایک بڑے انقلاب کی آمد کیلئے راہ ہموار کر دی۔ اس نئے انقلاب کا رخ جس منزل کی جانب ہے وہ ہے ارض و سماوات میں کار فرما سب طرح کی قدرتی قوتوں کا اتحاد یعنی ایک اعلیٰ وحدت (Grand Unification) کے تصور کی تشکیل۔ ہو سکتا ہے کہ یہ صرف ایک سراب ہو یا پھر دوسری بات سچ ہو۔ یعنی مادے اور توانائی کی حتمی ساخت کی اصلیت کے بارے میں عبدالسلام کی نظریاتی اسکیم ہی درست ہونی چاہئے۔ ایسی صورت حال میں ظاہر ہے کہ اس اسکیم کی روشنی میں عبدالسلام نے جن مشاہدات کی پیشین گوئیاں کی ہیں وہ کہیں نہ کہیں کھوج لیے جائیں گے اور عبدالسلام کے نظریے کے علاوہ کسی دوسری طرح ان کو نہ سمجھا جا سکے گا۔

عبدالسلام کے اعلیٰ وحدت کے تصور کے مطابق ایک پیشین گوئی جس کی بڑی شہرت ہوئی ہے وہ پروٹان کے زوال کے سلسلے میں ہے۔ پروٹان جو کہ تمام کائنات کا بنیادی جزو ہے، عبدالسلام کے کہنے کے مطابق اس کی عمر کی بھی ایک حد ہونا چاہئے۔ یعنی نیوٹران کی طرح پروٹان کا بھی زوال ہونا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ خوش قسمتی سے نیوٹران کے برعکس پروٹان کے زوال کا امکان بہت کم ہے۔ یعنی پروٹان کی زندگی بہت طویل ہے۔ ہمارے دور حاضر کے پروٹان کو جینے کے لئے کائنات کے شروع ہونے سے لے کر اب تک کے وقت کا ارب ارب گنا وقت ابھی باقی ہے۔ یہ وقت یقیناً اس وقت سے تھوڑا زیادہ ہے جو مجھے عبدالسلام کے نظریات کو پہلے اچھی طرح سمجھنے اور بعد ازاں اس مجلس کے حاضرین کرام کو قاعدے سے سمجھانے کیلئے درکار ہوگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر محترم وائس چانسلر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس خوش گوار محنت سے بچا لیں گے اور عبدالسلام کی عالمی سائنسی شہرت کو ان کو اس فیکلٹی میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لئے ثبوت کے طور پر قبول فرمالیں

گے۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ کے سامنے عبدالسلام کی شخصیت کا ایک اور پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان کا شمار دنیا کے اولین شہریوں میں کیا جاتا ہے ان کو صف اول کا انگلستانی سائنس دان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پچھلے بیس سال سے لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج میں پروفیسر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کافی وقت ٹریسٹے میں صرف ہوتا ہے اور اقوام متحدہ (نیویارک) میں بھی ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ عبدالسلام کی ذات فرد واحد پر مشتمل مختلف اقوام کی اس کارپوریشن کی مانند ہے جو کہ دنیا کے پچھڑے ہوئے ممالک کو ذہنی ٹیکنالوجی بہم پہنچانے کے کام میں ہردم مصروف ہے۔

عبدالسلام کا وطن پاکستان ہے اور ان کو اپنے ملک سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کی..... پرورش ایک چھوٹے سے شہر جھنگ میں ہوئی۔ یہ شہر مغلوں کے محلوں اور باغات کی قدیم جنت یعنی لاہور سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایک وظیفے نے سلام کو کیمبرج میں پہنچا دیا۔ یہاں انڈر گریجویٹ سطح کی تمام فزکس و ریاضیات پر عبدالسلام نے آناً فاناً عبور حاصل کرنے کے بعد بتدریج بلند ہوتی ہوئی تحقیق کے منازل کو تیزی سے طے کرنا شروع کر دیا۔ صرف ۲۵ سال کی تھوڑی سی عمر میں وہ پروفیسر ہو کر لاہور لوٹ آئے۔ ان دنوں عام معیار کے لحاظ سے عبدالسلام کی علمی کامیابی اتنی کافی تھی کہ اس کے سہارے وہ بہت آرام وہ زندگی گزار سکتے تھے۔

لاہور میں انہوں نے تین سال گزارے۔ عبدالسلام کا وقت یہاں شدید کرب اور کشمکش میں گزرا۔ انگریزوں کے زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کا شمار اچھے علمی اداروں میں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود تحقیق کے میدان میں یہاں کسی کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔

لاہور میں گزرے ان سالوں میں عبدالسلام کا سب سے بڑا نقصان جدید سائنسی مسائل پر مشغول کار ہم عصر سائنس دانوں سے رابطے کا منقطع ہو جانا تھا۔ بعد میں عبدالسلام نے اپنے اس ناقابل تلافی نقصان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کے کام پر پژمردگی چھائے رہنے کا سبب وہاں پر باہر کی دنیا سے روابط کا برائے نام وجود ہے۔ خود عبدالسلام ہی کے الفاظ میں:۔

"تیسری دنیا کے ممالک جیسے کوریا، لبنان، برازیل اور پاکستان کے باصلاحیت اور ذہین افراد تدریس و تحقیق میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنے وطن سے دور مغرب یا روس جاتے ہیں اور بعد میں اپنے وطن کے اداروں کی تعمیر نو کی غرض سے واپس آجاتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عام طور پر ماہرین اپنے وطن کی یونیورسٹیوں میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے گرد اگر کوئی چھوٹا سا گروپ بن بھی جاتا ہے تو وہ اتنا حقیر ہوتا ہے کہ علم کی بھٹی کی آگ کو دہکانے اور بھڑکانے کیلئے بالکل ہی ناکافی ہوتا ہے۔ ان اداروں میں اچھی لائبریریوں اور باہر کی سائنس برادری سے علمی لین دین کا فقدان ہوتا ہے۔ نتیجے میں یہ لوگ جو کام کرتے ہیں اس کو کون سمجھے اور اس کی کون تصحیح کرے۔ اس کے علاوہ اس دنیا سے الگ سائنس دانوں کو دنیائے سائنس میں نت نئے ابھرتے ہوئے تصورات کی خبریں بہت دیر سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جن بلندیوں سے یورپ یا روس کے اداروں کے ولولہ انگیز ماحول میں روشناس ہوتے تھے۔ ان کے نئے تحقیقی کام بھی ان بلندیوں کی حدود کے اندر پھڑپھڑا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بے چارے سائنس داں اپنے وطن واپس پہنچ کر علیحدگی کی ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں جو علمی قید کے مترادف ہوتی ہے۔ علمی دنیا سے اس طرح ناطہ ٹوٹ جانا نظریاتی طبیعات میں خاص طور سے اور دوسرے علمی شعبوں میں بھی ان ہونہار افراد کی علمی موت کے برابر ہے۔ جب میں نے لاہور میں یونیورسٹی جوائن کی تھی تو مجھے بالکل اسی طرح کے حالات و حادثات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔"

نوجوان عبدالسلام جیسا کوئی بھی غیر معمولی ذہین شخص دھیرے دھیرے زندہ درگور ہونے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ عبدالسلام ۱۹۵۴ء میں انگلستان واپس آگئے اور فوراً ہی لندن میں علمی منصب پر فائز ہو گئے۔ یہاں رہ کر بھی اپنے وطن سے ذاتی اور علمی سطح پر قربت کے رشتوں کو عبدالسلام نے کبھی کمزور نہ پڑنے دیا۔ اگرچہ عبدالسلام بعد میں اپنے وطن میں کسی باقاعدہ عہدے پر فائز نہیں ہوئے، پھر بھی ان کو اس بات پر فخر ہے کہ نوبل پرائز پانے والے وہ پہلے پاکستانی ہیں۔

عبدالسلام جتنے اعلیٰ درجے کا ذہن رکھتے ہیں ساتھ ہی اتنا ہی وسیع دل بھی ان کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ پاکستان میں گزرے ہوئے

چند ناخوشگوار سالوں کی یاد نے ان کا دل کھٹا نہیں کیا بلکہ یہ یاد ایک ایسے تخلیقی نقطے میں ڈھل گئی جس کے گرد ان کی عظیم علمی کامیابیوں کے وسیع حلقے کی تحقیق وجود پذیر ہوئی۔ عبدالسلام نے یہ تہیہ کیا کہ کم ترقی یافتہ ممالک کے ہونہار نوجوان سائنس دانوں کے لئے اس طرح کی سہولیات میسر کریں گے کہ جس سے وہ سائنس کی دنیا سے کٹ کر نہ رہ جائیں اور علمی موت سے ہم کنار نہ ہونے پائیں اور ان کو اپنے وطن کو بھی خیرباد نہ کہنا پڑے۔ عبدالسلام کا یہ عزم آج ٹھوس حقیقت بن کر دنیا کے سامنے درخشاں ہے۔

صرف ایک سطر جوان کے کارہائے نمایاں کی طویل فہرست میں جلی حروف میں درج ہے، بتاتی ہے کہ عبدالسلام ۱۹۶۴ء سے لے کر آج تک ٹریسٹے کے نظریاتی طبیعات کے بین الاقوامی مرکز

(Internation Centre for Theoretical Physics at Trieste)

کے ڈائریکٹر کے فرائض لگاتار انجام دے رہے ہیں۔ یہ واحد سطر ان پچاس سے زائد انعامات پر بھاری ہے جو کہ نمایاں تحقیقی کارناموں کے عوض دنیا بھر میں بکھری ہوئی یونیورسٹیوں اور مشہور علمی اداروں کی طرف سے عبدالسلام کو عطا کیے گئے ہیں۔ ان کا معرکۃ الآراء کارنامہ یہ مرکز ہے جس کی تخلیق انہوں نے صفر سے کی۔ آج یہ مرکز سب سے زیادہ کامیاب اور قابل احترام بین الاقوامی اداروں میں سے ایک ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان جدید ترین سائنس سے باخبر ہونے کی غرض سے Trieste کے اس مرکز میں آکر مستفید ہوتے ہیں۔ تحقیق کے نئے طریقے سمجھنا اور سیکھنا ہوں تو یہ مرکز ان کی مرادوں کی منزل ہوتا ہے۔ یہاں پر ان کو ترقی یافتہ ممالک کے ترقی پذیر ممالک کے بلکہ دنیا بھر کے سائنس دانوں سے ملاقات کے مواقع ملتے ہیں۔ یہاں آکر وہ خصوصی مضامین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں یا صرف چپ چاپ مطالعہ مقصود ہو تو مرکز کی بہترین لائبریری میں غرق ہو جاتے ہیں یا ہونہار نوجوان سائنس دانوں سے بحث و مباحثے کرتے ہیں یا پھر سویڈن کے بہت سمجھ دار معمر سائنس دان سے مضمون کے باریک نکات کو سمجھتے ہیں۔ ٹریسٹے کا یہ مرکز اس مصروف ترین ریلوے جنکشن کی مانند ہے جہاں علم و دانشوری کی ریلوں کی ہمہ وقت آمد و رفت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صرف چند سالوں کے وقفے میں یہ مرکز شاندار عمارتوں سے پٹ گیا ہے۔ خوش قسمت ہے یہ ادارہ کہ یہاں کا تمام عملہ اپنے کو مرکز کے مقاصد کیلئے وقف کیے ہوئے ہے۔ بس ایک کمی ہے اور وہ ہے سرمائے کی قلت جو یہاں کبھی ختم نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ مرکز پوری طرح زندہ ہے۔ اچھی طرح کام کر رہا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور سائنس کی پوری دنیا کی خدمت میں لگاتار مشغول ہے۔

اس مرکز کے قیام کا معرکہ کس طرح سر ہوسکا؟ ان دنوں نوجوان پروفیسران میں عبدالسلام کو سب سے زیادہ مشکل اور ناقابل فہم پروفیسر تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے شخص نے کس طرح جامد و ساکت بین الاقوامی اداروں جیسے یونیسکو (UNESCO) اور بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) کے جذبات سے عاری اور ہوشیار نمائندوں کو عام روش سے ہٹ کر اس مرکز کے منصوبے پر سرمایہ لگانے کیلئے راضی کیا ہوگا۔ کس طرح عبدالسلام نے اٹلی کی حکومت کو اپنا ایسا دوست بنا لیا جس نے دامے، درمے اور سخنے ان کی مدد کی؟ گزرے ہوئے چند سالوں میں عام مالی بدحالی اور بڑھتی ہوئی کرسی شاہی کے نظام نے بڑے بڑے شاندار منصوبوں کو ناکامی کی نذر کر دیا تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسی نظام میں رہ کر یہ مرکز نہ صرف زندہ رہ سکا بلکہ پھلتا اور پھولتا بھی رہا؟

وہ تنہا قوت جس کی وجہ سے ٹریسٹے کا یہ مرکز نہ صرف قائم ہوا بلکہ شہر آفاق بنتا جا رہا ہے وہ ہے اس مرکز کے ڈائریکٹر عبدالسلام کی ذاتی قوت ارادی۔ محترم وائس چانسلر صاحب میں آپ کو ہوشیار کرنا چاہتا ہوں کہ میکانیات میں ایک ایسی غیر مرئی قوت کا خیالی تصور ملتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ عبدالسلام کی ذات اس قوت کا حقیقی مظہر ہے۔ عبدالسلام اپنے ملاقاتیوں پر بلا تفریق اسی طرح چھا جاتے ہیں۔ چاہے یہ ملاقاتی سیاست دان ہوں یا سرکاری افسران یا بین الاقوامی اداروں کے افسران یا رفقائے کار سائنس دان، عبدالسلام کی دیانت داری، خلوص اور مقصد کی یک سوئی سب کو متاثر کرتی ہے اور بہت موثر انداز سے اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ اقوام کی بے لوث خدمت میں مشغول ہیں۔

ابتدا میں ٹریسٹے کا یہ مرکز اول درجے کی نظریاتی سائنس کیلئے وقف تھا اور یہاں تیسری دنیا کے افراد فزکس میں اعلیٰ ترین سطح پر

کارہائے نمایاں انجام دے کر اونچے مقام پیدا کرتے تھے۔ اس مرکز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اور اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء سے لیکر ۱۹۷۴ء تک پاکستانی حکومت کی سائنسی پالیسی کے معمار اور صلاح کار کی حیثیت سے عبدالسلام جن تجربات سے دوچار ہوئے اس سے ان کو نیا درس ملا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ممالک جو اقتصادی اور سماجی بہتری کی جدوجہد میں نبرد آزما ہیں' ان کے یہاں پہنچنے والی سائنس کے مقاصد میں وسیع النظری ہونا ضروری ہے' عبدالسلام کی طرز فکر میں اس تبدیلی کا اثر مرکز کی کارکردگیوں پر فوراً ہی شروع ہو گیا اور وقت کے ساتھ یہاں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اب جو ورکشاپس اور کانفرنسز یہاں منعقد ہوتی ہیں جو سیمینارز یہاں کیے جاتے ہیں۔ جن خصوصی کورسز کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے یا وظائف کا جو پروگرام یہاں جاری ہے' سب میں ایک ایسا پھیلاؤ آچکا ہے جس کے تحت کار آمد سائنس کے ہر میدان میں مجموعی تحقیق تسلی بخش طریقے سے پرورش پا رہی ہے۔ یہاں پر تربیت حاصل کرنے والے سائنسدانوں کے خصوصی رول کے بارے میں عبدالسلام کہتے ہیں کہ بین الاقوامی اور قومی سائنسی اداروں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ان سائنسدانوں کا رول بہت پرکشش اور مفید ثابت ہوگا۔ عبدالسلام کی ایک اور قابل ستائش عظیم کاوش کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے حال ہی میں عبدالسلام نے چھوٹی اور غریب اقوام جو اپنی بہبودی کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں ان کی ہمت افزائی مدد اور اصلاح دینے کی غرض سے ایک مزید نئے ادارے کے بنیادی ڈھانچے کو قائم کرنے کیلئے عالمی سطح پر جدوجہد شروع کی ہے اور اس اعلیٰ مقصد جہاد میں وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ' اپنی دولت اور نوبل انعام کی شہرت کے ساتھ مصروف ہیں۔ فلسفے کے فطری اور سماجی دونوں وسیع حلقوں میں عبدالسلام لگاتار رابطہ پیدا کرنے' جوڑنے یا متحد کرنے کی جستجو میں جانفشانی سے مصروف ہیں۔ اس راہ پر چلتے ہوئے فطرت میں پنہاں وحدت اور مثالی انسانی برادری کے حقیقی روپ کو عبدالسلام پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اس لئے عالی جناب وائس چانسلر صاحب یہ بہت ہی مناسب ہوگا کہ ہم بھی ان کو عزت و احترام سے نوازیں۔ اسی غرض سے آپ کے روبرو عبدالسلام کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ سب سے بڑھ کر اس اعزاز کے مستحق بن چکے ہیں۔

Ideals and Realities Edited by: Z.Hassan & C.H. Lai: Published by: World Scientific Publishing Co Ple. Ltd.

بقیہ از صفحہ 166

لگے۔ ایک عام سے طالبعلم کی مبارکباد میں کیا بات تھی؟ مگر وہ خاص مبارکباد تھی۔ ساری دنیا کے ممتاز سائنسدانوں کے درمیان ایک ہم وطن کی آواز تھی۔ اس عظیم ہستی کے لئے وہی آواز اپنی آواز تھی۔

لیکن ہم وطنوں نے کیا کیا؟ اپنے سپوت کو جو پردیس جا کر یکتائے روزگار بنا تھا اسی کو نہ اپنایا اور ایک ناقابل تلافی نقصان اپنے مستقبل کا کیا۔ یہ کوئی ایک مثال نہیں۔ پاکستان میں ناقابل تلافی نقصان کا عمل مسلسل چل رہا ہے۔ فیض کے ساتھ کیا نہ کیا جو نام اس دھرتی کا مان ہو سکتے تھے انہی کو بیگانہ کیا۔ جو نام اس کی تاریخ کو سجانے والے تھے انہی کو مٹاتے رہے۔ ایک بری سیاست اور بے بس سوسائٹی نے بزدلی و بے ضمیری کے ساتھ جھوٹ کی پیروی کی۔ غلط اور نااہل لوگوں کو اوپر اٹھایا۔ کرپشن میں لتھڑے ہوئے کرداروں کی پرورش کی اور بدمعاشی کو ترقی دی۔ اس کا نتیجہ ایک بگڑا ہوا بد اخلاق معاشرہ' ایک وگیریٹی سے بھرا ہوا کلچر' جہالت کا دور دورہ' ذہانت اور ہنرمندی کا زیاں۔ پہلے سے زیادہ شعور اور علم کا نور پیدا کرنے والے کتنے تھوڑے ہیں اور کس قدر بے مقام!

سوچنے کی بات یہ ہے ڈاکٹر عبدالسلام نے علم کا جو خزانہ کمایا وہ کس کے کام آیا؟ ساری دنیا کو اس سے فیض ملا' مگر پاکستان کے مقدر میں محرومی کیوں؟ کون لکھتا ہے ان محرومیوں کو؟ کون مجبور کرتا ہے ایک سائنسدان کو سقراط بن جانے پر؟ وہ بھی اس دور میں۔ آج بیسویں صدی کی آخری دہائی میں! ملک سائنس کی ترقی سے بری طرح بچھڑا ہوا ہے' مگر فزکس کا نوبل انعام حاصل کرنیوالا "جلاوطن" کر دیا گیا۔ سوچنے کی بات ہے' غور کا مقام ہے!"

(بشکریہ روزنامہ "خبریں" لاہور ۲۹ نومبر ۱۹۹۷ء: مرسلہ: داؤد احمد صاحب بھلیر انوالہ ضلع گجرات)

گمنام تھا وطن میں

ڈاکٹر صاحب نے سرکاری علاج کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی کہ وہ غریب پاکستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اپنی ذات پر خرچ نہیں کر سکتے

جناب اصغر علی گھرال صاحب

بی بی سی کے ایک پروگرام میں اس ٹریجڈی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا نوبل انعام یافتہ عظیم سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کا سپوت کہتی ہے۔ لیکن خود پاکستان نے انہیں کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ یہ حسرت لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ کاش ان کا وطن بھی انہیں فرزند پاکستان کے نام سے پکارے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پاکستان چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے اور اس کے بعد پاکستان واپس آکر آباد ہونے کی تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ مستقلاً پاکستان میں آباد ہو جائیں۔ لیکن یہاں نہ تو ریسرچ کی عمدہ سہولتیں تھیں اور نہ حکومت کے پاس سائنس کے شعبے کیلئے وافر فنڈز تھے۔ تیسرے ان کی شخصیت کا ایک پہلو بہت "متنازعہ" تھا۔ پروفیسر عبدالسلام ایک ایسے فرقے سے تعلق رکھتے تھے جسے پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا تھا۔ بی بی سی کے مطابق بعض انتہا پسندوں نے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر پروفیسر عبدالسلام لوٹ کر پاکستان آئے تو انہیں قتل کر دیا جائے۔

اب اس بات سے پونے چار سو سال پہلے کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کوپرنیکس اور کپلر کی طرح گلیلیو نے بھی ثابت کر دیا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتی ہے جب کہ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ زمین فرش کی مانند پانی پر بچھی ہوئی ہے۔ کلیسا اپنے عقائد کی یوں کھلی توہین برداشت نہ کر سکا۔ ۱۶۱۶ء میں گلیلیو کو انکوئزیشن کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ اعلان کرے کہ کوپرنیکس کے نظریات باطل ہیں۔ اس نے توبہ کر لی مگر چپکے سے بولا "میں مانوں یا نہ مانوں زمین تو بہرحال گھومتی رہے گی۔"!

۱۶۲۳ء میں گلیلیو کا ایک روشن خیال دوست پوپ بن گیا۔ گلیلیو نے چاہا کہ ۱۶ء والی پابندی ختم کرا دے مگر وہ ناکام رہا۔ البتہ یہ اجازت لینے میں کامیاب رہا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھے گا کہ جس میں ارسطو کے قدیم اور کوپرنیکس کے جدید نظریات پر بحث ہو گی۔ دو شرائط عائد کی گئیں ایک یہ کہ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرے گا' دوسرے اس بحث کے بعد وہ اس "مثبت" نتیجے پر پہنچے گا کہ انسان یہ تعین کر ہی نہیں سکتا کہ دنیا کیسے چل رہی ہے!

یہ کتاب "ڈائیلاگ" یا "مکالمہ" کے نام سے ۳۲ء میں چھپ گئی۔ یہ دونوں عظیم نظاموں اور نظریات پر بحث کرتی ہے۔ کتاب کی سارے یورپ میں زبردست پذیرائی ہوئی' پوپ ڈر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کتاب کی اجازت دے کر غلطی کی ہے کیونکہ لوگ کوپرنیکس کے جدید نظریات کے حامی ہو گئے۔ پوپ خود ضرور روشن خیال تھا مگر مذہبی ماحول سے بڑا پریشان ہوا۔ اس نے گلیلیو پر ۱۶ء کی پابندی کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا دیا۔ عظیم سائنسدان گلیلیو پھر انکوئزیشن کے سامنے لایا گیا۔ اس نے دوسری دفعہ سر تسلیم خم کر دیا لیکن اس دفعہ اسے معاف نہیں کیا گیا اور سزا کے طور پر ہمیشہ کے لئے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں فی الواقعہ اس کی نظر بند ہو گئی یعنی اس کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ اب چند سال قبل کلیسا نے عظیم سائنسدان گلیلیو کے ساتھ اس "حسن سلوک" پر معافی مانگ لی ہے۔ معذرت کر لی ہے۔ اپنے "مقدس فتاویٰ" کو واپس لے لیا ہے۔ اب کلیسا خاص روشن خیال ہو گیا ہے!

پاکستان کے عظیم سائنسدان کے ساتھ سائنسی نظریات کے حوالے سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں تھا مگر مذہبی عقائد کے اختلاف کی بناء پر ایک عظیم انسان کو اپنے ہی وطن میں جن پریشانیوں کا سامنا کرنا

پڑا اور جن حسرتوں کو وہ دل میں لے کر چل بسا یہ ایک المیہ ہے۔ نہ جانے ہمارے علماء کب اتنے فراخ دل ہوں گے کہ **لا اکراہ فی الدین** کے فلسفے پر خود بھی عمل کر سکیں اور انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ قوم کو اس عظیم سائنسدان کے ساتھ اس بے اعتنائی کے لئے یقیناً احساس جرم ہو گا......!!

پارکنسن سے ملتی جلتی خطرناک بیماری میں ایک عرصے تک مبتلا رہنے کے بعد وہ عظیم انسان جسے دنیا ڈاکٹر عبدالسلام کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنسدان تھے ۲۰ نومبر کو صبح ۸ بجے لندن میں انتقال کر گئے۔ ۲۴ نومبر کو ان کا جسد خاکی پاکستان میں لا کر سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی عمر ۷۰ سال ۹ ماہ اور ۲۲ دن تھی۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اور یونیورسٹیوں میں ان کی وفات پر بڑا سوگ منایا گیا ہے۔

گجرات میں تھنک ز فورم کے زیر اہتمام بھی ایک تعزیتی تقریب ہوئی۔ معروف سکالر اکبر علی ایم۔اے نے صدارت کی۔ مقررین نے اس امر پر شدید افسوس کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو پاکستان میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے اور جو مقام ساری دنیا انہیں دے رہی تھی۔ ان کی عظمت کا کماحقہ اعتراف کیا گیا اور نہ ہی ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ چوہدری اکبر علی نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایک ٹریجڈی سے کم نہیں کہ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہم پاکستان میں سائنسی کلچر کو فروغ نہیں دے سکے....!

انہوں نے کہا کہ برطانیہ میں رائل سوسائٹی آف سائنس کے تحت سائنسی علوم کو ترقی ملی۔ ...نیوٹن اس کے سربراہ تھے۔ نیوٹن نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے قوانین بنا دئے ہیں جن کی وہ خود بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس پر مذہبی حلقوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نعوذباللہ اللہ تعالیٰ خود اپنے ہی قوانین کے سامنے بے بس ہے۔ نیوٹن کا جواب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی رضا سے ہی فطرت کے قوانین کی مخالفت نہیں کرتا۔ ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا تو کلیسا نے اس کی بھی زبردست مخالفت کی، بحث چل نکلی بلکہ بحث و مباحثے کا طوفان آ گیا۔ بحث و تمحیص سے ہی بات آگے بڑھتی ہے تاہم "آرتھوڈکس" خیالات کی شکست مقدر تھی۔ وہ ہو کر رہی۔ قدامت پسندی اور توہم پرستی کہاں تک مقابلے میں ٹھہر سکتی تھی۔

ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی "ڈی بیٹ" نہیں ہے۔ الیکٹرانک میڈیا سے بھی توہم پرستی کا پرچار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ایسے عظیم سائنسدان کے لئے برطانیہ، بھارت، اور اٹلی ہی نہیں دنیا کا ہر ملک فخر سے شہرت اور زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات نچھاور کرنے پر تیار تھا مگر انہیں اپنے وطن سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ انہوں نے سائنس کی دنیا میں اپنے ملک کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگائے مگر یہاں تو وہ اپنی مادر علمی میں لیکچر تک نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ہماری جہالت اور تعصب کا بیرومیٹر ہے۔

شبیر احمد ڈار ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے دھانے پر کھڑے آج ہم محض عقیدے کے اختلاف کی بناء پر ایک عظیم سائنس دان اور ایک عظیم انسان کو اس کا جائز مقام دینے کو تیار نہیں۔ انہوں نے کہا ڈاکٹر عبدالسلام کی آخری وقت یہ خواہش رہی کہ وہ پاکستان کو ایک سائنسی انسٹیٹیوٹ دے سکیں۔ انہوں نے کہا یہاں سائنس کی سرکاری طور پر سرپرستی کی بجائے توہم پرستی کی سرکاری سرپرستی ہوتی ہے۔ وہ ملک کو پرانی فزکس کی بجائے جدید فزکس سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ساتھ جو زمین مستقبل کی توسیع کے لئے موجود تھی اسے نام نہاد عوامی نمائندوں نے اونے پونے اپنے ناموں پر الاٹ کروا لیا البتہ حال ہی میں یہ اراضی ان کے پنجوں سے آزاد کرالی گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے زبردست کردار ادا کیا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر پرویز ہود بھائی پاکستان میں ڈاکٹر عبدالسلام کے سب سے بڑے شیدائی اور قدردان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ "مذہبی" حلقے ان کے خلاف بھی منفی پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کے مطابق ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی کی دو بڑی آرزوئیں تھیں۔ ایک تو فزکس کی تحقیقات، جن میں کھو کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ دوسرے وہ اپنے وطن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی چاہتے تھے....!

معروف قانون دان چوہدری مسعود اختر نے ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے چودھری اکبر علی سے سوال کیا کہ

سائنسی کلچر لانے کی ذمہ داری تو سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے۔ سائنس دان تو سائنسی تھیوریوں پر کام کرسکتے ہیں۔ علم کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

اکبر علی ایم۔اے نے کہا کہ ہر نئی سائنسی ایجاد کلچر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سٹیفن نے انجن ایجاد کیا تو یورپ کا کلچر بدل کر رہ گیا۔ کالم نگار عبداللہ خالد خان نے کہا کہ سائنس کی ترویج کے بغیر سیکولر خیالات کے پنپنے کا امکان نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ ہم کرچیین دنیا کے سائنس دانوں کو تو بسروچشم قبول کرلیتے ہیں مگر مادر وطن کے ایک عظیم فرزند کو محض عقیدے کی بناء پر مسترد کردیتے ہیں۔ ہم دوسروں کو متعصب کہتے ہیں۔ انڈیا میں مسلمان اظہر الدین کرکٹ کی دنیا کا ہیرو ہے اور ۹۰ کروڑ اہل بھارت اس پر فخر کرتے ہیں۔

چوہدری بشیر احمد ایڈووکیٹ نے کہا کہ نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان کی ناقدری سے خود پاکستان کو نقصان ہوا ہے اور ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کہا ڈاکٹر عبدالسلام نیوٹن یا آئن سٹائن مذہب کے خلاف نہیں تھے گویا مذہب اور سائنس اکٹھے رہ سکتے ہیں!

معروف دانشور سید آفتاب احمد نے ڈاکٹر عبدالسلام کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں سائنسی تعلیم پر کوئی توجہ ہی نہیں دی جاتی۔ سائنسی تحقیقات پر کم سے کم رقم خرچ کی جاتی ہے۔ ماڈرن دنیا میں سائنسی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو حل کرنے کے لئے "پرابلم" دی جاتی ہیں۔ وہ اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور محنت کرکے اچھے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔ سرکاری الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ آزاد پرنٹ میڈیا میں بھی سائنسی موضوعات پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا دنیا کے کوئز پروگراموں کا تقابل کریں، ان سے سائنسی معلومات میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ سارک کے کوئز مقابلوں میں انڈیا تو خیر ہمیشہ ہی اول آتا ہے، ہم اکثر سری لنکا سے بھی نیچے رہتے ہیں۔ سائنس کے فروغ کے لئے ذرائع ابلاغ کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ اسے یہ رول ادا کرنا چاہئے۔

سید آفتاب شاہ نے کئی واقعات سنائے اور بتایا کہ فزکس کے نئے نصاب کے سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو نے ڈاکٹر عبدالسلام کو بلوایا مگر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار بالخصوص ایک سیاسی مذہبی جماعت کی طلبہ تنظیم نے انہیں بڑا پریشان کیا حتی کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی بے بس ہوگئے اور ان کا مرتب کردہ نصاب رائج نہ کرسکے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا گورنمنٹ کالج لاہور میں کالج کی جوبلی کے حوالے سے تقریبات منعقد ہوئیں۔ ملک کے وزیراعظم صدارت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس ادارے کے قابل فخر فرزندوں کے نام گنوائے لیکن وہ پاکستان کے واحد نوبل انعام سائنس دان کا نام گول کرگئے۔ جانے ڈاکٹر عبدالسلام ادارے کے لئے قابل فخر فرزند نہیں تھے یا وہ ساتھی مولویوں کے ڈر سے ان کا نام زبان پر نہ لاسکے۔ اس سے ملک میں جہالت پسندی کا اندازہ کرلیں۔

آخر میں خود کالم نگار نے عظیم سائنسدان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسلام تو "لا اکراہ فی الدین" اور لکم دینکم ولی دین کے فلسفے کی تبلیغ میں مذہبی رواداری کا سبق دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخین نے اسلام کو سیکولرازم سے بڑھ کر وسیع المشرب دین قرار دیا ہے۔ جس میں کوئی چھوت چھات نہیں۔ جمہوریت میں بھی عقائد کی بناء پر کسی تفریق اور شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی گنجائش نہیں لیکن کتنے ظلم کی بات ہے کہ ملک کا ایک غریب دیہاتی بچہ جو دنیا میں آسمان عظمت پر ایک تارا بن کر چمکا اور اپنے وطن کا نام چار دانگ عالم میں روشن کیا۔ وہ اپنے وطن میں اجنبی رہا بلکہ اسے یوں احساس دلایا جاتا رہا کہ جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہے! ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ لندن میں زیر علاج تھے کہ حکومت پاکستان کو بھی کسی نے توجہ دلائی تو انہیں سرکاری علاج کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کرلی کہ وہ غریب پاکستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اور قومی وسائل کو اپنے ذات پر خرچ نہیں کرسکتے۔

یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبل انعام سمیت گراں قدر سارے انعامات کی رقوم پاکستان میں سائنس کی ترقی اور ترویج کے لئے وقف رکھیں۔ دنیا میں سائنسی اداروں کو قائم کیا۔ انہوں نے کوئی محل نہیں بنایا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ "پاکستان" لاہور یکم دسمبر ۱۹۹۶ء

"میرے فرقہ کے لوگ... علم و معرفت میں کمال حاصل کریں گے"

ہم پہلے پاکستانی نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان و ماہر طبعیات ڈاکٹر عبدالسلام (بانی تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز) کو پوری دنیا کیلئے ان کی عظیم الشان خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

قائد و اراکین عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ ڈرگ کالونی کراچی

او بہشتی اے ۔۔۔ او جنتی اے

گورنمنٹ کالج کے مالی مکرم بابا سید صاحب کے حوالے سے گفتگو

(تحریر مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

کہتے ہیں کہ اکثر سائنسدان جذبات سے عاری، دنیا و مافیہا سے بے خبر، کائنات کے سربستہ رازوں کا سراغ لگانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ دنیا میں بھوک اور افلاس کا شکار تڑپتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ شاید یہ بات دوسرے سائنسدانوں کے بارے میں توجیہ ہو لیکن فزکس کا شہزادہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک ایسی شخصیت تھے جن کے سینے میں انسانی ہمدردی سے لبریز ایک دل دھڑکتا تھا۔ ایک سلام وہ تھا جو دن رات لیبارٹریوں میں پارٹیکلز اور مادہ کی دنیا میں گم رہتا تھا۔ دوسرا سلام وہ تھا جو ترقی پذیر ممالک میں مصائب والام کا شکار تڑپتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ممالک بھی ترقی کریں تاکہ یہاں کے لوگ بھی سکھ کا سانس لے سکیں۔ ان کا خواب تھا صلح صفائی اور امن آشتی کا معاشرہ۔ جہاں ہر طرف خوشحالی ہو۔ امن ہو۔ غریب بھی سکھ کا سانس لے سکے۔

جب بھی انہیں کوئی انسان دکھ میں مبتلا نظر آتا آپ مقدور بھر اس کی مدد کرتے۔ ان میں سے ایک گورنمنٹ کالج لاہور کا مالی بابا سید بھی تھا۔ بابا سید تو ڈاکٹر سلام صاحب کے نزدیک بہت ہی محترم تھا کیونکہ جب ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو بابا سید نے بھی ڈاکٹر سلام کا بہت خیال رکھا اور ڈاکٹر سلام صاحب بھی آخری عمر تک بابا سید کی مدد کرتے رہے۔ بابا سید تو اس وقت اس دار فانی سے کوچ کر چکا ہے لیکن جب ہم اس کی بیوہ اور بیٹے رونق علی سے ملے تو اس نے ہمیں بتایا کہ میرے والد صاحب بتاتے ہوتے تھے کہ جب ڈاکٹر صاحب تعلیم کے حصول کے لئے گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں قیام پذیر تھے تو میرے والد صاحب وہاں مالی تھے اور ڈاکٹر صاحب کو ہاسٹل کا کھانا موافق نہیں آیا۔ اس لئے کچھ عرصہ میرے والد صاحب گھر سے کھانا پکوا کر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں دے آتے اور باقاعدگی سے ڈاکٹر صاحب کو دودھ اور مکھن وغیرہ بھی پہنچاتے رہتے۔

بابا سید کے ذمہ یہ بھی ڈیوٹی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر ڈاکٹر صاحب کا کمرہ باہر سے لاک کر دیتے تاکہ ڈاکٹر صاحب کو پڑھائی کے دوران کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور پھر مقررہ وقت پر جاکر باہر سے کمرہ کھول دیتے۔ مہینہ کے آخر پر جب ڈاکٹر صاحب کے والد محترم تشریف لاتے وہ کھانے وغیرہ کے اخراجات کی ادائیگی فرما دیتے تھے۔ بعد میں جب میرے والد صاحب ریٹائرڈ ہوئے تو انہیں کوئی پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ نہیں ملا اور کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوا اور مزید یہ کہ ہمیں گورنمنٹ کالج کا مکان بھی خالی کرنے کا حکم مل گیا۔ والدہ نے پریشانی میں ڈاکٹر سلام صاحب کو خط لکھا۔ آپ نے فوراً جواب دیا کہ میرے جھنگ والے مکان میں شفٹ ہو جاؤ۔ اس پر میرے والد صاحب نے لکھا کہ میرے لئے لاہور چھوڑنا ممکن نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اچھی خاصی رقم بھجوا دی اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا معمول رہا کہ وہ ہر مہینہ باقاعدگی سے کچھ رقم بھجواتے رہے اور یہ سلسلہ والد صاحب کی وفات تک جاری رہا اور بعد میں بھی گاہے بگاہے ہماری بھی مدد کرتے رہے۔

جب اس بارے میں بابا سید کی بوڑھی بیوہ سے پوچھا گیا تو اس کے منہ سے تو یہی چند فقرے بار بار سننے کو ملے پتر "او بہشتی اے۔ او جنتی اے۔ او بہت نیک سی۔ اداں کوئی کسی دا خیال نئیں کرواجناں انہیں ساڈا خیال کیتا۔"

یعنی وہ بہشتی تھا اور بہت نیک تھا۔ اس طرح کوئی کسی کا خیال نہیں کرتا جس طرح اس نے ہمارا خیال رکھا۔ میرے خاوند نے بہت لوگوں کی مدد کی لیکن کسی نے نیکی یاد نہیں رکھی سوائے ڈاکٹر صاحب کے۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔

پہلے احمدی نوبل انعام یافتہ سائنسدان

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں جن کی

وفات سے دنیائے سائنس میں جو خلاء پیدا

ہوا درخواستِ دعا ہے کہ خدا ایسے سینکڑوں

احمدی سائنسدانوں سے اس کو پورا کرے۔ آمین

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ ڈیفنس کراچی

ادارہ "خالد" کو

"عبد السلام نمبر"

کی اشاعت پر

دلی مبارکباد

پیش کرتے ہیں۔

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ ناظم آباد کراچی

اسلام اور سائنس

"اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے"

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے مقالہ کی تلخیص

(مرسلہ: مکرم ملک مبشر احمد صاحب۔ کراچی)

قرآن کریم اور سائنس

⊙ قرآن کریم میں بطور ایک سائنس دان مجھ پر فرض کیا گیا ہے کہ میں فطرت کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان کی تلاش طبیعات، حیاتیات، طب اور ہیئت وغیرہ کے مشاہدات میں کروں کہ ان میں سب کیلئے نشانیاں ہیں۔

⊙ قرآن شریف کی ساڑھے سات سو آیات میں (یعنی اس پاک کتاب کے تقریباً آٹھویں حصے میں) اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ایمان لانے والے فطرت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کے بھید کھولنے کیلئے کوشاں رہیں کہ انہیں عقل اسی لئے دی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تحصیل علم کو اپنی روز مرہ زندگی کا حصہ بنائیں۔

⊙ درود و سلام آنحضرت ﷺ پر کہ انہوں نے تعلیم کو ہر مرد و عورت کیلئے ضروری قرار دیا۔

⊙ آنحضرت ﷺ کے وصال کے سو برس کے اندر ہی مسلمانوں نے اس زمانے کے علوم پر عبور حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام سے ترقی کا ایک سلسلہ جاری ہوا جس سے ان کو ایسی علمی برتری حاصل ہوئی جو آئندہ تین سو سال تک باقی رہی۔

⊙ اسلامی دنیا میں سائنس کی ترقی کا نقطہ عروج ۱۰۰۰ء کے آس پاس تھا۔ یہ زمانہ ابن سینا کا تھا جو قرون وسطیٰ کے آخری عالم تھے۔

اسلامی تہذیب کا ایک قیمتی عطیہ

اہل یونان نے تدوین کا کام کیا، عام اصول بنائے اور انہیں علمی زبان میں بیان کیا۔ لیکن طویل اور مسلسل تجربات کا صبر آزما طریقہ اور تجربہ کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی مزاج کے خلاف تھا۔ جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے۔ ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کروایا۔ اسلامی تہذیب کا ایک نہایت قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔

ایمان اور سائنس

سائنس میں ہر نظریہ صرف عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور ہر قدم پر اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اہل ایمان کیلئے تمام ثابت شدہ حقائق ان کے رب العالمین کے عظیم منصوبہ کا جزو ہوتے ہیں۔ یہ جس صورت میں بھی ظاہر ہوں ان کی نگاہیں منور ہوتی ہیں اور وہ وارفتگی کے ساتھ خالق حقیقی کے حضور سربسجود ہو جاتے ہیں۔ جن معاملات میں طبیعات خاموش ہے میرا ایمان اسلام کے کامل پیغام پر ہے۔ اس کا صاف اشارہ قرآن کریم میں سورۃ البقرہ کے آغاز میں "یومنون بالغیب" کے الفاظ میں ہے۔ غیب سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ سب کچھ کہ جس کا علم نہیں ہو سکتا۔ (یا نہیں ہو سکا)

دنیائے اسلام میں سائنس کا زوال

اس زوال کا آغاز ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ شروع ہوا تھا اور آئندہ ڈھائی سو سالوں میں یہ مکمل ہو گیا۔ اس کی کئی ایک خارجی وجوہات بھی تھیں مثلاً منگولوں کی لائی ہوئی تباہی و بربادی، لیکن میرے خیال میں یہ زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اس کا بنیادی سبب اندرونی حالات تھے۔ سب سے پہلے تو اسلامی سائنس والوں کی اپنے آپ میں محدود ہونے والی وہ کیفیات تھیں جس سے ان کی سائنسی کاروائیوں کا رشتہ باقی دنیا سے ٹوٹ گیا اور دوسری طرف تحقیقی اور تخلیقی طرز فکر کی حوصلہ شکنی جیسا منفی رویہ تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام اور اگلی صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام سخت مذہبی گروہ بندیوں اور سیاست دانوں کی شہ پر بڑھتی ہوئی تنگ نظری کا شکار تھی۔ اسی دور سے اسلامی دنیا کے زوال کی بنیاد پڑی۔ ہر طرف کٹرپن کا رواج تھا۔ رواداری عنقا تھی، چنانچہ تقلید عام ہو گئی اور اجتہاد کا دروازہ تمام علوم پر بند ہوا۔ سائنسی علوم کا بھی یہی حال ہوا۔ اب کیا حالت ہے؟ کیا اب اسلامی دنیا سائنسی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنے لگی ہے؟؟ اس وقت روئے زمین پر اہم ترین تہذیبوں کے حوالے سے سائنس سب سے زیادہ کمزور اسلامی ممالک میں ہے۔

کچھ لوگ یہ وہم کرتے ہیں کہ جدید سائنس لامذہبیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ خیال بھی ہے کہ سائنس دان ایک دن مابعد الطبیعاتی حقائق کا انکار کر دیں گے۔ میں سمجھتا ہوں سائنس کی طرف یہ رویہ ان پرانے جھگڑوں کی وراثت ہے جن میں قدیم فلسفی الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ارسطو کے تصور کائنات کو بلاچون و چرا مان لیا تھا اور ان میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کو ان خیالات کو اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ یکجا کرنے میں مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔ ایسے رویئے سائنس کی ترقی میں روک رہا کرتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس قسم کے بلکہ اس سے بھی زیادہ لغو جھگڑوں میں قرون وسطی کے عیسائی اہل مکتب مبتلا تھے۔

اسلامی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت

اس وقت اسلامی دنیا کو چھ جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلے خطے میں جزیرہ نما عرب اور خلیج فارس کے نو ممالک ہیں۔

۲۔ دوسرے خطے میں شمالی عرب کے ممالک شام، اردن، فلسطین کا مغربی کنارہ اور غزہ ہیں۔

۳۔ تیسرے علاقے میں ترکی، مسلم وسطی ایشیا، ایران، افغانستان اور پاکستان ہیں۔

۴۔ چوتھے گھنی آبادی والے علاقے میں بنگلہ دیش، ملائشیا اور انڈونیشیا ہیں۔ اسی علاقہ میں ہندوستان اور چین کی کثیر تعداد والی مسلم اقلیتیں بھی ہیں۔

۵۔ پانچویں علاقے میں شمالی افریقہ کی ریاستیں شامل ہیں۔

۶۔ چھٹے حصے میں افریقہ کے غیر عرب ممالک ہیں۔

اسلامی ممالک میں اٹھارہ سے پچیس سال کی عمر کے افراد میں سے صرف دو فیصد یونیورسٹیوں کے سائنس کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک کے اس عمر کے افراد میں سے بارہ فیصد سائنس سے متعلق شعبوں میں داخل ہوتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق اور ترقی پر خرچ (بلحاظ مجموعی قومی پیداوار) اور ترقی یافتہ ممالک میں اسی خرچ کے درمیان ایک اور چھ کی نسبت ہے۔

ساری اسلامی دنیا میں سائنس اور انجینئرنگ کے محقق ۴۵ ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ جب کہ صرف جاپان میں ان کی تعداد ۴ لاکھ ہے۔

صرف طبیعات میں اسلامی برادری کے سائنس دان ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کا دسواں حصہ ہیں اور سائنسی تخلیقی کاموں میں ان کا حصہ ترقی یافتہ ممالک کے کاموں کا صرف ایک فیصد ہے۔

تیل پیدا کرنے والے امیر مسلمان ممالک نے خطیر سرمایہ جنگوں میں ضائع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد سائنس کی ترقی کیلئے بہت کم رقم بچتی ہے۔ اسلامی دنیا میں تجارت کا انتظام پوری طرح سے درآمد شدہ ٹیکنالوجی کے شکنجے میں ہے اور سائنسی نظام تخلیق کی بجائے

منقولات کی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں سیاست اور سائنس کی پالیسی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس علاقہ میں شخصی استبداد کا تسلط ہے۔ اس میں کہیں رحمدلی ہے تو کہیں صورت حال بالکل برعکس۔ اس لئے جب بھی کوشش کی جاتی ہے کہ سائنس اس سرزمین میں جڑ پکڑے تو دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس علاقہ سے ترقی یافتہ ممالک کی طرف ذہین افراد کی ہجرت سے سارے مشرق وسطیٰ کی علمی حالت کمزور ہوتی جارہی ہے۔

کیا اسلامی دنیا میں سائنس کی حیات نو ممکن ہے؟

میں نہایت انکسار سے کہوں گا کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی معاشرے اور مسلمان نوجوان اس کو اپنا ایک مقصد بنا لیں۔ ہماری نظریاتی روایات اس کی امین رہی ہیں۔ ہمارے قرون اولیٰ کے تجربات اس سے معمور رہے ہیں۔ یہ آسان راہ نہیں ہے۔ لازم ہوگا کہ اسلامی برادری اپنے کام کرنے والے افراد میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو سائنس کی اعلیٰ تربیت دینے کا انتظام کرے اور قومی پیداوار کا ایک سے دو فیصد حصہ بنیادی اور کام میں آنے والی سائنس کی ترقی کیلئے مخصوص کر دے اور اس رقم کا کم سے کم ایک چوتھائی سے ایک تہائی حصہ صرف بنیادی سائنس پر خرچ کرے۔

جاپان میں ایسا سب کچھ ہو چکا ہے جب وہاں کے شہنشاہ نے میجی انقلاب کے زمانہ میں یہ قسم کھائی تھی کہ روئے زمین کے جس کونے سے بھی علم حاصل ہو سکے حاصل کیا جائے۔ روس میں اسٹالن نے ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ لڑائی میں تباہ شدہ معیشت کے زمانے میں طے کیا کہ سائنس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور یہ فیصلہ کر دیا کہ سائنس دانوں اور انجینئروں کی آمدنی میں تین سو فیصد کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ ذہین نوجوان جوق در جوق سائنس کے تحقیقی میدان میں آئیں۔ سائنس پر اسی قسم کا زور آج کل عوامی جمہوریہ چین میں دیا جارہا ہے۔ وہاں یہ منصوبہ بنایا جارہا ہے کہ وہ جلد ہی خلائی سائنس، جینیٹکس، مائکرو الیکٹرانکس، ہائی انرجی فزکس، فیوژن فزکس اور تھرمو نیوکلیئر انرجی کو قابو میں لانے والے میدان میں بہت آگے بڑھ جائیں۔ چین نے یہ حقیقت سمجھ لی ہے کہ آج کی بنیادی سائنس کل کی قابل عمل سائنس ہوگی اور یہ کہ سائنس کی سرحدوں پر گھوڑے تیار حالت میں رکھے جائیں!

یہ بات مدنظر رہے کہ اسلامی ممالک کی قومی پیداوار چین کی قومی پیداوار سے زیادہ ہے اور چین کو ہم پر صرف چند دہائیوں کی برتری حاصل ہے۔ کیوں نہ ہم چین سے اپنی گم کردہ حکمت کی بات سمجھ لیں؟؟

سائنس کے قوانین اس کی روایتیں اور طریقہ کار ساری دنیا کیلئے ایک جیسے ہیں اس لئے یہ خوف یا وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہماری روایات و ثقافت کو نقصان ہوگا۔ مقامی ضروریات کو مدنظر رکھ کر سائنسی ترقی کرنی چاہئے۔

اسلامی ممالک میں سائنس دانوں کی سرپرستی کی کمی ہے۔ آج کل یہ حال ہے کہ ایک عرب یا مسلمان سائنس دان اگر ضروری قابلیت رکھتا ہے تو اسے پورا یقین ہے کہ وہ مغرب یا امریکہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ وہاں اس کا خیر مقدم ہوگا' حفاظت' عزت اور کام کرنے کا مساوی موقع ملے گا۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ کہیں ہم اپنے سائنس دانوں میں تفریق تو نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کی ملازمت محض اس لئے ختم کر دیتے ہیں کہ ان کی پیدائش ایسے ملک میں ہوئی جہاں کی حکومت سے ہمارے کچھ عارضی اختلافات ہیں۔

میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کی سیاسی دولت مشترکہ کے بننے کا انتظار کئے بغیر اسلامی ممالک کی سائنس کی دولت مشترکہ بنائی جائے۔ ماضی میں اس کی مثال موجود ہے۔ جب وسط ایشیا کے رہنے والے بو علی سینا اور البیرونی عربی میں لکھتے تھے اور اس کو بالکل قدرتی بات سمجھتے تھے..... یا....... ابن الہیثم بغیر کسی اندیشہ کے خلفائے بنو عباس کی مملکت بصرہ سے ان کے رقیب بنو فاطمہ کے زیر نگیں مصر چلے گئے تھے کہ باوجود ہر قسم کے اختلافات کے (بشمول فرقہ وارانہ اختلافات) وہاں انہیں عزت اور مرتبت ملے گی۔ یہ خیال رہے کہ اس زمانہ میں مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات اتنے ہی شدید تھے جتنے کہ آج کل۔

اسلامی سائنس کی دولت مشترکہ کیلئے ضرورت ہے کہ شعوری طور پر اس کے لئے کوشش کریں اور اس کوشش میں ہم دونوں یعنی اہل سائنس اور اہل حکومت برابر کے شریک ہیں۔ اسلامی دنیا میں سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہی حالت سائنسی ذرائع اور علمی سرمایہ کی ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اسلامی ممالک اپنے ذرائع کو ملا کر سائنس کے تحقیقاتی ادارے بنائیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے اسلامی ممالک کے سائنس دان اپنی اپنی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ایک عرصہ کیلئے مثلاً پچیس برسوں کیلئے ان کو خاص رعایتیں دیں۔ ان کو ملک کے سیاسی و مذہبی جھگڑوں سے الگ رکھا جائے تاکہ وہ ایک علمی جماعت کی طرح کام کر سکیں۔ بالکل اس طرح جیسے ماضی میں سائنس کی اسلامی دولت مشترکہ میں کام ہوتا تھا۔

مسلمان ممالک کی سائنسی سرگرمیاں بین الاقوامی سائنس سے وابستہ نہیں ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ سوائے مصر کے کوئی اسلامی ملک چند ایک سے زائد بین الاقوامی سائنسی تنظیموں کا ممبر نہیں ہے۔ مسلم ممالک میں سائنس کے بین الاقوامی مراکز نہیں ہے۔ ان کے ہاں بہت کم بین الاقوامی سائنسی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ان کے سائنس دانوں کو دوسرے ممالک کے سائنسی مراکز میں جانے یا کانفرنسوں میں شرکت کے مواقع نہیں ملتے بلکہ اس طرح کے علمی سفروں کو "تفریح" گردانا جاتا ہے۔

سائنسی تنہائی کے اس احساس ہی کی وجہ سے میرے دل میں سائنس کے ایک ایسے عالمی مرکز کے قیام کا خیال آیا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان اپنے وطن کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہے بغیر کچھ مدت کیلئے آکر اپنے مضمون میں تازہ ترین باتیں سیکھ سکیں۔ یہ مرکز اقوام متحدہ کے دو ذیلی اداروں کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ دیگر ممالک کے علاوہ اسلامی ممالک کے تقریباً ۷۵ سائنس دان بھی ہر سال یہاں آتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں سائنس کی پیشہ وارانہ تنظیموں کا کوئی ٹھیک نظام نہیں ہے۔ ایسے ادارے بھی نہیں ہیں جو سائنسی پیش رفت کا جائزہ لیتے رہیں۔ ایسے سائنسی مراکز بھی نہیں جن کا انتظام سائنس دان ہی کرتے ہوں اور نہ ان کاموں کیلئے سرکاری بندشوں سے آزاد سرمایہ کا نظام ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کے احیاء کیلئے کم از کم پانچ شرطیں پوری ہونا چاہئیں۔ یعنی اس مقصد سے شدید جذباتی لگاؤ، فیاضانہ سرپرستی، حفاظت کا انتظام، خود مختاری اور سائنسی کارکردگی میں بین الاقوامی نقطہ نظر۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔

دنیائے اسلام میں احیاء سائنس کیلئے ضروری اقدامات

الف:۔ کلام پاک میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے ایک تفکر یعنی قوانین فطرت پر غور اور دوسری تسخیر یعنی ان قوانین فطرت کا فن کے ذریعے استعمال کر سکنا۔ اس ہدایت خداوندی اور موجودہ حالات کے پیش نظر پہلی بات جو امت کے کرنے کی ہے وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی ثانوی، آخری اور یونیورسٹی کے درجوں تک کی جائے۔

مختلف اداروں، مثال کے طور پر عالمی بنک کے شائع کردہ اعداد و شمار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ممالک میں سائنسی تعلیم میں داخلہ لینے والوں کی تعداد دوسرے ترقی پذیر ممالک کے اوسط کو بھی نہیں پہنچتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کا تو ذکر ہی کیا۔

اسلامی دنیا کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں خوب ترقی دینی ہوگی۔ اس کے لئے لائق اساتذہ اور اچھے سائنسی ساز و سامان کی ضرورت ہوگی۔ غالباً سب سے زیادہ ضرورت تو اس بات کی ہوگی کہ سائنسی تعلیم کو ہونہار طلباء کے لئے ایسا پرکشش بنایا جائے کہ وہ آگے چل کر اسے چھوڑ نہ دیں۔ سائنس چھوڑ دینے کے بہت سے واقعات ہوتے ہیں اور اس کی بہت بڑی وجہ معاشی تنگ دستی ہے۔ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی طویل تعلیم دلا سکیں جو پیشہ ور سائنس دان کیلئے ضروری ہے۔ امت میں سائنس کی تعلیم کے عام رواج کیلئے ایک ایسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی جس سے ان نو عمر طلباء کی ہمت افزائی ہو سکے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اور جن کی عمر چودہ برس

کے آس پاس ہو۔

ہندوستان کے ایک دورہ میں مسلمان ماہرین تعلیم سے ایک گفتگو کے دوران مجھے یہ اندازہ ہوا کہ صرف شمالی ہندوستان کے بیس بڑے شہروں میں سائنسی تعلیم کے وظیفوں کی مد میں قریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت اتنی بڑی رقم پیش نہیں کر سکتی۔ تمام دنیائے اسلام کے ہونہار طلباء کے وظائف کیلئے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر سالانہ وظیفوں کی ضرورت ہوگی۔ اتنے کثیر سرمایہ کی فراہمی بہت آسان نہیں ہے۔ ابتداء میں غالباً تیل پیدا کرنے والے ممالک کو خود اپنے یہاں کے لئے اپنے وظائف کے انتظام میں فیاضی سے پہل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اس سرمایہ کے دروازے کو دوسرے مسلمان ملکوں کیلئے کھولا جا سکتا ہے اور ان میں جغرافیائی اعتبار سے خاص ضرورت کے مضامین کی تقسیم ہو سکتی ہے۔

(ب):۔ ۱۹۷۳ء میں میری تحریک پر حکومت پاکستان نے لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں درخواست کی تھی کہ اسلامی دنیا ایک ارب ڈالر سے امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن کے برابر سائنس کی ترقی کیلئے سرمایہ کا انتظام کرے۔ اس کے آٹھ برس بعد صرف پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہو سکا یعنی جتنا مانگا گیا تھا اس کا صرف 1/20 ملا۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات ہے۔

اسلامی دنیا میں ٹیکنالوجی

اب میں ٹیکنالوجی کا ذکر کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں تفکر اور تسخیر پر برابر کا زور دیا گیا ہے۔ یعنی جتنی تاکید علم کو حاصل کرنے کی فرمائی گئی ہے اتنا ہی زور سائنس کے علم کے ذریعے سے فطرت کے قوانین سے عملی فائدہ اٹھانے پر بھی دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی مثالیں دیکر سمجھایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ اسی طرح حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کا ٹیکنالوجی کی مدد سے دفاع کرنے کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے۔ قرآن کریم یہ باتیں سبق حاصل کرنے کیلئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ ان پر عمل کریں۔

حضور اکرم ﷺ بڑے شوق سے حفاظت کیلئے نئی ایجاد کو قبول فرماتے تھے۔ خندق کے استعمال کے ذریعے دشمن کے حملہ کو

روکنا اور خیبر کی تسخیر کیلئے منجنیق بنائے جانے کا ارشاد (گو کہ اس کی تیاری سے قبل خیبر پر قبضہ ہو گیا) آپ ؐ کے ٹیکنالوجی استعمال فرمانے کی ہی مثالیں ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی ممالک کو وہ کونسی ایسی روکائیں در پیش ہیں جو ان کو اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی حاصل نہیں کرنے دیتیں۔ بالخصوص وہ ٹیکنالوجی جس کی بنیاد جدید ترین سائنس پر ہے۔

عرب مسلمان ممالک میں ہائیڈرو کاربن' پیٹرو کیمیکلز' تعمیرات' وسائل نقل و حرکت' لوہے' فولاد' ادویات' کھاد بنانے کے کارخانے اور دیگر صنعتی منصوبے وغیرہ جتنے گزشتہ کچھ برسوں میں لگائے گئے ہیں پہلے کبھی نہیں لگے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان تمام منصوبوں کو ایسی فضا میں عملی شکل دی گئی جس میں ٹیکنالوجی سیکھنے کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ چنانچہ کسی ایک عرب ملک میں بھی یہ ٹیکنکل صلاحیت نہیں ہے کہ ان کارخانوں کا از خود نقشہ تیار کریں یا ان کو تعمیر کر سکیں یا ان میں ترقی پیدا کر سکیں۔ اس کے برعکس جاپان کو دیکھیں جس کی آبادی عرب ممالک کی آبادی کے تقریباً برابر ہے۔ جاپان نے پیٹرو کیمیکلز مشینوں کے میدان میں چند دہائیاں قبل ہی قدم رکھا ہے۔ انہوں نے پہلے دن سے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ ان مشینوں کو برآمد کریں گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اگر اس کام کے جاننے والے شروع میں وہاں نہ بھی ہوتے تو بھی ایسے لوگوں کا تیار کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس بنیادی سائنسی معلومات موجود تھیں۔

صنعت و حرفت میں یہ غفلت صدیوں سے جاری ہے۔ مثلاً ۱۸۰۰ء میں استنبول میں برطانوی سفیر نے اپنا مشاہدہ تحریر کیا تھا کہ یہاں لوگوں کو جہاز رانی کا علم نہیں۔ مقناطیس کا استعمال یہ نہیں جانتے۔ سفر سے پیدا ہونے والی روشن خیالی کو نہیں سمجھتے یہ صلاحیت مذہبی نخوت اور غیر ملکیوں سے حسد کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے۔ سائنس دان مفقود ہیں۔ توپ بنانے والوں' جہاز سازوں یا اور ٹیکنیکل کام کرنے والوں کی عزت نہیں ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے تجارت کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کیلئے تیار شدہ قیمتی مال لاتے ہوں جس کو تیار کرنے میں خود ان کو کچھ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

صنعت و حرفت میں خود کفیل نہ ہونے کی وجہ ہر اسلامی ملک میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے وہ ماہرین فن نہیں ہیں۔ (چند ممالک کے سوا) جاپان' چین' کوریا' سویڈن اور فرانس میں ماہرین فن سائنس دان اور منتظمین ملک باہمی مفاہمت' اشتراک' لگن اور بھروسہ کی فضا میں کام کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا کو یہ راز پھر سیکھنا ہے۔ زراعت' صحت عامہ' توانائی' مواصلات' دفاع غرضیکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہر شعبے میں ذاتی مہارت پیدا کرنی لازمی ضرورت ہے۔

ابن خلدون کی یہ پر زور نصیحت دنیائے اسلام کو سمجھنی چاہئے کہ بہتر صلاحیتوں کی جستجو ہی بعض لوگوں کو دوسروں پر فوقیت دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو اقوام اس جستجو کو بیکار سمجھنے لگتی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔

حرف آخر

عالم اسلام سائنس کی طرف متوجہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ بغیر سائنس کے مادی ترقی ممکن نہیں ہے۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک دنیائے اسلام کی سائنسی زبوں حالی کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

میں سخت شرم محسوس کرتا ہوں کہ جب کسی اسپتال میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہاں جان بچانے والی جتنی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں چاہے وہ پنسلین ہو یا کوئی اور دوا' ان کے دریافت کرنے اور بنانے میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "احیاء العلوم" کے پہلے باب میں ایسی سائنسوں کی تخلیق اور ترقی پر زور دیا ہے جو اسلامی معاشرہ کیلئے ضروری ہیں مثلاً صحت عامہ کی سائنس۔ انہوں نے اس قسم کی سائنس کو فرض کفایہ بتایا ہے۔ میں اسلامی دنیا کے دولت مند افراد' حکمرانوں' سائنس پالیسیوں کے ذمہ داروں اور علمائے دین کی توجہ سائنس کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ سائنس اس لئے ضروری ہے کہ اس سے مادی کائنات کے بھید کھلتے ہیں۔ فطرت کے قوانین کا علم ہوتا ہے اس کی حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے دفاع کیلئے بھی ضروری ہے۔ یہ ساری دنیا کو ایک دھاگے

بقیہ صفحہ 164 پر

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی تقاریر اور لیکچرز پر مبنی کتب کا تعارف

(تحریر و تعارف مکرمہ صبوحی ناصر صاحبہ۔ ربوہ)

Science and Technology

Challenge for the South

سن اشاعت: نومبر ۱۹۹۲ء : صفحات کی تعداد: ۲۳۲

اشاعت زیر انتظام: .T.W.A.S اور .T.W.N.S.O

مطبع Tipografia_Litografia "Modera" Trieste Italy

تعارف:۔

یہ کتاب ڈاکٹر عبدالسلام کے ان تاریخی نوٹس پر مشتمل ہے جو انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جنوبی ممالک کی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے ۲۲، ۲۴ اپریل ۱۹۹۲ء کو اٹلی میں ہونے والی T.W.N.S.O کی کانفرنس میں بیان کئے۔ یہ کتاب مشرق و مغرب میں سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی، کارہائے نمایاں اور بہترین نتائج کا احاطہ کرتی ہے اور جنوبی ممالک کو اس بات کی تحریک پیش کرتی ہے کہ وہ بھی موجودہ چیلنجز کا سامنا کریں اور مشرق و مغرب کی ترقی سے استفادہ کریں۔ اس کتاب میں .T.W.N.S.O کی کانفرنس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں درپیش جن مسائل کو زیر بحث لایا گیا انہیں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور Louis Emeni ji ڈائریکٹر OECD نے باہم مل کر ICTP کے Adriatico Guest House میں کیا تھا۔ اس کانفرنس سے متعلق مزید معلومات، بشمول کانفرنس کی خاص جھلکیاں ایک علیحدہ ضمیمہ میں پیش کی گئی ہیں لیکن ان میں سے چند معلومات کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کو ہر جگہ سمجھا اور جانا جاتا ہے لیکن اکثر جنوبی ممالک میں صورتحال مختلف اور نازک ہے۔ یہاں تک کہ ان ممالک میں سائنس و ٹیکنالوجی سے صرف لفظی یا زبانی حد تک دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان ممالک میں پسماندگی، غربت اور استحصال کا مقابلہ صرف سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ان نوٹس کے ذریعے ان ممالک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے۔ .T.W.N.S.O کے افتتاحی اجلاس میں تیسری دنیا کے ۳۶ ممالک کے نمائندگان نے شرکت کی۔ اگر ہم اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر لیں تو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

پہلا حصہ (صفحہ 1 تا 170) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلق نوٹس پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے (صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۳) میں عبدالسلام صاحب کی بطور عظیم سائنس دان ذات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک Acknowledgement کے ذریعے ڈاکٹر سلام صاحب نے سابقہ ساؤتھ کمیشن کے صدر مسٹر جولیس نائریرے Mr. Julius Nyerere اور اپنے ساتھی ممبران کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے سلسلے میں ان کے تحقیقاتی دور کے دوران مفید مباحثوں کا اہتمام کروایا۔ اس کے علاوہ ۴-۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء میں Trieste میں ہونے والی .T.W.N.S.O کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے والے ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور سے Louis Emeni ji کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے Trieste کے

دورے کے دوران ڈاکٹر صاحب سے سیر حاصل مباحثے اور رابطے جاری رکھے اس کے علاوہ Susan Biggin اور اپنی سیکرٹری Anne Gatti کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس کتاب کو شائع کرنے میں بھرپور معاونت کی۔

اس کتاب کے تیسرے حصے (صفحہ ۱۷۵ تا ۲۲۷) میں I.C.T.P کے مقاصد اور اس کی کارکردگی کے جائزے کے ساتھ ساتھ اس کے منتخب شدہ تحقیقاتی میدان کے موضوعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں ضروری سامان اور تحقیقی ماحول مہیا کرنے کے سلسلے میں I.C.T.P. کے طریقہ کار کوششوں اور نتائج کے بارے میں بھی تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی I.C.P.T کی ممبرشب کی درجہ بندی اور طریقہ کار کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۱۹۳ پر Physics for the poor کے عنوان سے ڈاکٹر سلام صاحب کے مختصر حالات' I.C.T.P کے قیام کے مقاصد اور ان میں کامیابی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ڈاکٹر صاحب نے روم میں منعقدہ کانفرنس میں

Pontifical Academy of Sciences of the vatican third world Academy of (T. W. A. S) Sciences

کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ چنانچہ صفحہ (۱۹۹) پر T.W.A.S. کے قیام کے مقاصد' ابتدائی حالات' سہولتوں اور فوائد پر جامع نوٹ تحریر کیا گیا ہے۔ (صفحہ ۲۰۶) پر تیسری دنیا کے ممالک کا ایک گوشوارہ بھی ترتیب دیا گیا ہے جس میں اکیڈمی کے مختلف درجہ کے ممبران کی تعداد اور ان کی مکمل تعداد الگ الگ دکھائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ (صفحہ ۲۰۷ تا ۲۰۸) پر T.W.A.S. کی طرف سے ۷۹ ممالک کے سائنسدانوں کو دیئے جانے والے انعامات اعزازی رکنیت اور تحقیقی امداد کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

Abdus Salam A Biography

مصنف کا نام: جگجیت سنگھ

سن اشاعت: ۱۹۹۲ء : صفحات کی تعداد: ۲۱۳

مطبع: Viking Penguin India

تعارف:۔

۱۹۶۳ء میں UNESCO کی طرف سے دیئے جانے والے Kalinga Prize کے حامل اور کئی تحقیقی مقالوں اور کتابوں کے مصنف جگجیت سنگھ کی ۱۷ ابواب پر مشتمل زیر نظر کتاب محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد چوہدری محمد حسین صاحب کو دکھائے جانے والے کشف' آپ کی پیدائش' مڈل سکول جھنگ میں داخلے سے لیکر ایم۔ اے کرنے تک کا تعلیمی سفر بڑے جامع اور مفصل پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ Imperial College اور Cambridge University میں ڈاکٹر سلام صاحب کے قیام اور تحقیق پر تفصیلی مواد ہمیں دو الگ الگ ابواب میں ملتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں I.C.T.P کے قیام کی اہمیت اور وجوہات بھی تفصیلاً بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا باب نمبر8 The Ahmaddiya Jammat خاصی توجہ کا حامل ہے۔ اس باب میں وہ تمام حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کی رو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ پاکستان میں ایک متنازعہ دوسرے درجہ کے شہری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس باب میں جماعت احمدیہ کے آغاز سے لیکر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے تک نیز احمدیوں کو پاکستان میں درپیش مشکلات کے بارے میں نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی چونکہ ایک مخلص احمدی تھے۔ تو جو مشکلات انہیں ذاتی طور پر پاکستان میں پیش آئیں اور پھر جس طرح کی سنگین مخالفت کے پیش نظر انہیں مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا ان سب حالات و واقعات کو نہایت جامع پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس اور معاشرے سے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خیالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی بیماری کے آغاز اور ۱۹۹۰ء تک کے وہ تمام حالات بھی درج ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی ذات سے وابستہ تھے۔

کتاب کے آخری صفحات میں ان تمام اعلیٰ ایوارڈ' اسناد اور اعزازی ڈگریوں کا ذکر ہے جو فزکس کے شعبے میں ان کے درجہ کمال کا اعتراف ہیں۔ ان میں شعبہ فزکس سے متعلقہ امن اور سائنسی تعاون میں ترقی کے اعتراف میں دیئے جانے والے ایوارڈ اور اعزازی تمغہ جات کا ذکر ہے جو ڈاکٹر صاحب نے حاصل کیے۔

Selected Papers of Abdus Salam (with commentry) Vol. 5. World Scientific series in 20th Century Physics

مصنفین کے نام: A. Ali. _ C. Isham_ T. Kibble. Riazuddin

صفحات کی تعداد:۶۷۹

مطبع پریس: World Scientific publishing co. Pte. Ltd. Singapora

تعارف

اس صدی کے عظیم ماہر نظریاتی طبیعات ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے فزکس اور ریاضی سے متعلق ۲۷۶ دستاویزات (Papers) پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب کی ترتیب مندرجہ ذیل مصنفین کی باہمی کوششوں اور تعاون کا نتیجہ ہے۔

1. Mr. A. Ali (Desy)
2_ Mr. C. Isham (Imperial college of Sc. and Technology)
3. Mr. T. Kibble (Imperial college of Sc. and Technology)
4. Mr. Riazudding (King Fahd university of petroleum and minerals)

World scientific series in 20th century physics کے اب تک چار Volumes شائع ہو چکے ہیں۔

Physics of elementary particles سے متعلق عبدالسلام صاحب کی ۲۷۶ دستاویزات (Papers) اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک کے سائنسی اور تعلیمی پالیسیوں پر بھی بہت سی کتب لاتعداد ضمیمے اور دستاویزات منظر عام پر آ چکے ہیں۔ طبیعات سے متعلق سلام صاحب کی ان دستاویزات کی تواریخ کی ترتیب سے پانچ بڑے درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ہر گروپ اپنے موضوع کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور جامع تحقیق کا احاطہ کرتا ہے۔ زیر نظر کتاب مندرجہ ذیل پانچ درجوں میں موضوعاتی اعتبار سے تقسیم ہے۔

1. Quantum field theory and dispersion relations
2. Symmetries and Electroweak Unification
3. Lepton_Hadron Unification
4. Gravity, Supersymmetry and Strings
5. Condensed Matter and Biology

کتاب کا آخری Section_5 سلام صاحب کے انتہائی حالیہ کیے گئے کام سے متعلق ہے جس میں ان کے جدت پسند خیالات کے تسلسل اور دلچسپیوں کی تشریح کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے گزشتہ تحقیقی کام سے قطعی مختلف یہ دستاویزات Elementary Particles کی بجائے طبیعات اور حیاتیات کے خالص مادہ کے اہم بنیادی مسائل اور ان کے حل پر مشتمل ہیں۔

Evolutionary Biology میں ایک طویل عرصے سے درپیش الجھنوں سے متعلق بہترین حل اس کتاب کی دو دستاویزات میں بیان ہے۔

1. The role of chirality in the origin of life (page 626)
2. Chirality, Phase transition and their Induction in Amino acid (p635)

کتاب کے پانچوں Sections کے آغاز میں مختصراً ہر دستاویزات سے متعلق معلومات تعارف ہے۔ اس کتاب کے والیم پانچ میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بہت سے مضامین کی طویل فہرست چھوڑ دی گئی ہے مثلاً Science Policy تیسری دنیا میں ترقی، بین الاقوامی امن وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بہت سے موضوعات کو دیگر مجموعات میں پہلے ہی شامل کیا جا چکا ہے۔ کتاب کے آخری صفحات پر ڈاکٹر صاحب کے کل ۲۷۶ دستاویزات کی تواریخ کے لحاظ سے فہرست پیش کی گئی ہے۔ (1943ء تا 1993) کتاب کے انتہائی ابتدائی صفحات چھوڑ کر

تعارف سے پہلے ڈاکٹر سلام صاحب کی Post Card سائز تصویر ہے۔ اس کے علاوہ آخری صفحات پر ڈاکٹر سلام صاحب کا بائیو ڈیٹا بھی معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔

اسلامی دنیا کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنسدان

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام۔ (تعارف اور خدمات)

ناشر: بزم ڈاکٹر عبدالسلام : کراچی۔ پاکستان

صفحات کی تعداد: ۲۰۳ : اشاعت اول: مارچ ۱۹۹۶ء

: اشاعت دوم: اگست ۱۹۹۷ء

مطبع پریس: Y. I. PRINTERS KARACHI

تعارف:۔

زیر نظر کتاب بزم ڈاکٹر عبدالسلام کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا سوانحی خاکہ ہے جس میں ان کی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز ڈاکٹر سلام صاحب کے ابتدائی حالات زندگی، ان کی تعلیمی کارکردگی اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ جوں جوں کتاب کے اوراق پڑھتے جائیں قاری پر یہ واضح ہوتا جاتا ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے کتنے کوشاں رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام دنیا خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک پر سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے بغیر ان ممالک سے غربت، افلاس، بھوک، پسماندگی اور دیگر مسائل کا حل ممکن نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش تھی کہ پاکستان میں سائنس کی علیحدہ وزارت قائم کی جائے اور سائنسی علوم کو وزارت تعلیم سے الگ کر دیا جائے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن پاکستان کی مضبوط نوکر شاہی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اگرچہ پاکستان میں اپنے مختصراً قیام کے دوران ڈاکٹر سلام صاحب نے بطور سائنسی مشیر خدمات انجام دیں لیکن پاکستان میں آپ کی خدمات سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ سو آپ مجبوراً انگلستان واپس چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف تھا کہ پاکستان میں سائنس کا مزاج رکھنے والے طلباء و طالبات کی کمی نہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی پاکستان کی ناگزیر ضرورت ہے اور اس کے ذریعہ پاکستان زرعی، تجارتی اور صنعتی ترقی کر سکتا ہے اور اقوام عالم میں اپنا ایک الگ مقام بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلام صاحب کو نوبل انعام دئے جانے پر روزنامہ "ڈان" کراچی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں ان کی کامیابی کا راز بتاتے ہوئے لکھا ہے:۔

"محترم ڈاکٹر صاحب کا تعلق دین دار اور مخلص گھرانے سے ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی قرآن کریم سے بے انتہا عشق تھا۔ اس لئے آپ نے ساری عمر اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے بھی قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کی۔ نوبل انعام وصول کرنے کے بعد جوابی خطاب میں سورۃ الملک کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی جس میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک ترتیب ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں ہے"۔ ان آیات کی تلاوت کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے ان کی تشریح کی تو حاضرین حیران ہوئے کہ قرآن کریم ایسے الہامات پر مشتمل ہے"۔

کتاب کے صفحہ ۲۸ تا ۲۹ پر نوبل انعام ملنے پر ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے جو کہا وہ بھی تفصیلاً درج ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے جناب وارث میر کو ۳ دسمبر ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر صاحب نے جو انٹرویو دیا تھا وہ بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو نوبل انعام ملنے پر مختلف ملکی اور غیر ملکی اہم شخصیتوں کے تہنیتی پیغامات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ صفحہ ۴۴ تا ۴۹ ڈاکٹر صاحب کے عالمی اعزازات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (صفحہ ۵۱ تا ۹۵) مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۹۶ء کو بزم ڈاکٹر عبدالسلام کے زیر اہتمام ہونے والے سیمینار کی مکمل کاروائی بھی تفصیل سے بیان کی گئی۔ (صفحہ ۹۶ تا ۱۰۳) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سانحہ ارتحال کی مکمل رپورٹ اور تدفین تک کے تمام واقعات کے علاوہ ان کے جسد خاکی، نماز جنازہ کی ادائیگی اور تدفین کی کچھ نادر تصاویر بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ گو کہ ان کی طباعت اتنی معیاری نہیں۔

رموز فطرت

دنیائے سائنس کے مہر درخشاں ڈاکٹر عبدالسلام

مصنف کا نام: محمد زکریا ورک صاحب

تاریخ اشاعت: ۱۹۹۶ء : صفحات کی تعداد: ۲۰۰ صفحات

مقام اشاعت KIGSTON, ON K7L 4V6, CANADA

تعارف:۔

محمد زکریا ورک صاحب کے اب تک کئی جرائد اور اخبارات میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی مصنف کی ایک شاندار تصنیف ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت اور عالمی کارناموں پر مختلف مشہور افراد کے توصیفی بیانات کے علاوہ چند اخبارات و رسائل کے تعریفی اداریے وغیرہ شامل ہیں۔ بی۔بی۔سی۔ لنڈن سے نشر ہونے والا ڈاکٹر عبدالسلام کا ریڈیو انٹرویو بھی اس کتاب میں اہمیت کا حامل ہے۔ (صفحہ ۲۰ تا ۲۴)

علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر اسرار احمد علی کا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے متعلق ایک مضمون ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"عبدالسلام کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں کئی کمال ہیں، کئی خوبیاں ہیں۔ عبدالسلام کی عظمت کی مضبوط بنیاد یہ ہے کہ وہ عظیم سائنسدان ہیں۔ سائنس کے میدان میں انہوں نے نہایت کم عمری میں اپنی عظمت کا سکہ جمالیا تھا........ وہ مستقل اپنی گراں قدر سائنسی تخلیقات سے طبیعات کو نوازتے رہے اور ذراتی طبیعات کو نئی نئی راہوں سے روشناس کراتے رہے"۔

"ان کے خیال میں ملت اسلامیہ کے زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے تکنیکی انقلاب سے خود کو باخبر نہ رکھا.........بشرطیکہ وہ علم و دانش کی راہ اپنالے"۔

(مضمون صفحہ ۱ تا ۸)

کتاب میں (صفحہ ۲۷ تا ۳۶) شامل اشاعت برسٹل یونیورسٹی انگلینڈ کے پروفیسر جان زیمان کا ۲ جولائی ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کئے جانے پر دیا جانے والا خطاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔

(صفحہ ۳۷ تا ۳۹) پر روزنامہ "ڈان" کا ۲۸ نومبر ۱۹۹۲ء کا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا انٹرویو بھی نہایت اہم ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں TORANTO کے معروف ریڈیو سٹیشن CHIN پر جولائی ۱۹۸۰ء میں نشر ہونے والا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا انٹرویو بھی شامل ہے۔ اس انٹرویو کا مکمل متن کتاب کے لئے سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک کے پروفیسر نرندر ناتھ نے فراہم کیا ہے:۔

پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی ذات اور شخصیت سے متعلق ایک چھوٹا سا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر سلام سے کچھ سوالات پوچھے ہیں جن کے نہایت تفصیلی اور مدلل انداز میں ڈاکٹر صاحب نے جوابات دیئے ہیں۔ (صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۷)

کتاب کے صفحہ (۱۸۲ تا ۱۸۴) ڈاکٹر سلام صاحب کے اقوال زریں بھی انتہائی اہم ہیں۔

(صفحہ ۱۹۷ تا ۱۹۹) اٹلی کے روزنامہ "کور پردی لامپرا" کے ۱۳ نومبر ۱۹۹۰ء کو شائع ہونے والے مضمون بعنوان "عبدالسلام کے دو عشق۔ مذہب اور سائنس" کو بھی کتاب میں اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔ صفحہ ۲۱۴ پر کتابوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جن میں سے ۷ کتابیں وہ ہیں جو کہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف کردہ ہیں جب کہ ۶ کتابیں وہ ہیں جو ان کی شخصیت، زندگی اور تخلیقی کارناموں پر مختلف مصنفین نے تحریر کی ہیں۔ کتاب میں چند نادر تصاویر بھی شامل ہیں جن میں کچھ تو ان کی مصروفیات کو ظاہر کرتی ہیں اور کچھ تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔

قصہ مختصر "رموز فطرت" اہم ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے جو مطالعے کے دوران قاری کی توجہ ہٹنے نہیں دیتی اور اسے ایک ہی نشست میں اس کتاب کو ختم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔
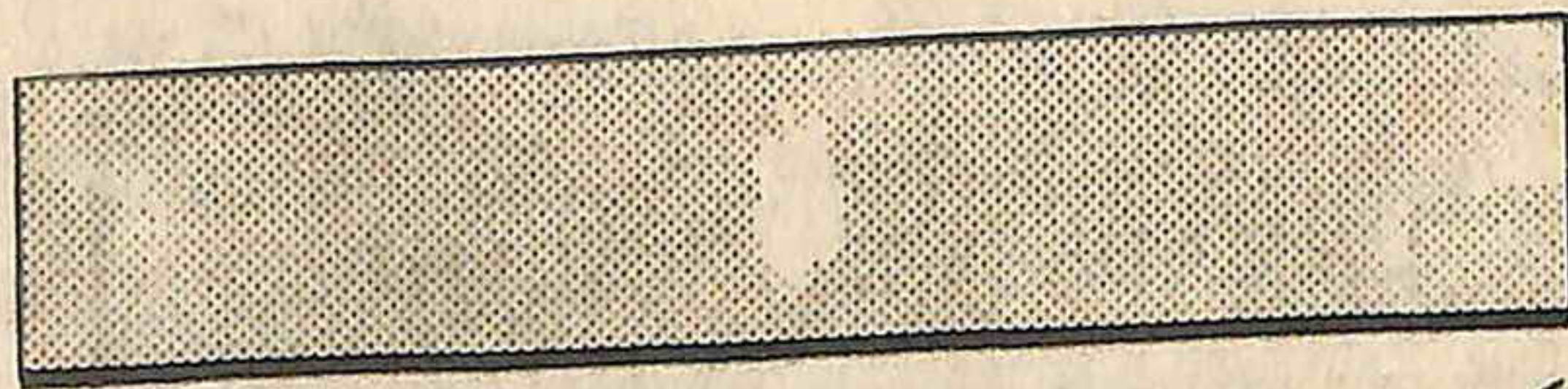
پاکستان اور کے نوبل انعام یافتہ سائنسدان "پروفیسر عبدالسلام"

سوانح حیات

مصنف کا نام: عبدالباری قیوم شاہد

صفحات کی تعداد: ۸۰ : مطبع پریس: بک ورلڈ پریس لاہور

تعارف:۔

قیوم اکیڈمی پبلیکیشن کے زیر اہتمام مصنف عبدالباری قیوم شاہد کی یہ کتاب محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی مختصراً سوانح حیات ہے۔

کتاب کا آغاز امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد بر موقع سالانہ اجتماع لجنہ اماء اللہ مرکزیہ بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے ہوتا ہے۔ جس میں حضور نے ڈاکٹر سلام صاحب کی شخصیت' عقل و فراست اور اعلیٰ ذہنی استعداد کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور انکساری بھی بیان کی ہے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ ایک عظیم سائنسدان ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو دیگر عام لوگوں جیسا ہی سمجھتے ہیں۔

اس سوانح حیات میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی حالات' تعلیمی سرگرمیاں' انگلستان جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا' پاکستان میں کچھ عرصہ ملازمت کرنا اور پھر دوبارہ انگلستان واپس جا کر اپنا تحقیقاتی مشن شروع کرنا' نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تمام دنیا کے مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود سے متعلق پالیسی کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام دنیا پر یہ واضح کیا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کو سمجھے بغیر دنیا میں ترقیاتی انقلاب لانا ناممکن ہے اور انقلاب کے بغیر پسماندگی دور نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں "میرے اپنے جذبات تو یہ ہیں کہ میں صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اٹلی کی طرح کے ادارے میں اور ملکوں میں بھی قائم کرسکوں......... میری تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں سائنس تحقیقات کا ایک اعلیٰ ترین ادارہ قائم کر جاؤں۔ میں اس سلسلے میں لیبیا بھی جا رہا ہوں"۔ (صفحہ ۳۴ تا ۳۵)

IDEALS AND REALITIES

SELECTED ESSAYS OF ABDUS SALAM

مصنف کا نام: C.H.LAI, AZIM KIDWAI

صفحات کی تعداد: 509

مطبع پریس: WORLD SIENTFIC PUBLISHING PVT. LTD۔ SINGAPORE

تعارف:۔

یہ نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سائنسی ترقی کے حوالے سے دیئے گئے لیکچرز پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ ۱۹۹۳ء تک اس کے تین ایڈیشن منظر عام پر آچکے تھے۔ جس میں سے پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں اور دوسرا ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ ہر ایڈیشن میں پہلے کی نسبت کچھ باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

زیر نظر تیسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی شعبہ فزکس میں غیر معمولی دلچسپی اور ان کے تیسری دنیا اور ترقی پذیر ممالک میں سائنسی میدان میں ہونے والی ترقی و ترویج سے گہرے لگاؤ کو بڑے مفصل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل لیکچرز میں ڈاکٹر صاحب نے سائنسی مسائل اور دستیاب وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے نیز سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیمی پالیسی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کتاب میں ۷۔۵ نومبر ۱۹۸۶ء کو ترکی کے بارے میں استنبول میں دیا جانے والے ڈاکٹر سلام صاحب کا خصوصی لیکچر "TURKEY IN THE YEAR OF 2000" بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ

"THIRD WORLD HIGHER EDUCATION AND ITALY"

کے عنوان سے نومبر ۱۹۸۵ء میں Trieste کے مقام پر دیا جانے والا لیکچر بھی شامل اشاعت ہے۔ جس میں تیسری دنیا اور اٹلی میں ترقی کا جائزہ اور اصطلاحات پیش کی گئی ہیں۔ نیز

INTERNATIONAL CENTER FOR THEORETICAL PHYSICS

THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENE

THIRD WORLD NETWORK OF SCIENTFIC ORGNAIZATION

کے قیام کے مقاصد اور ان کے کردار پر بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

ISLAM AND SCIENCE کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے دو لیکچرز بھی شامل اشاعت ہیں جن میں سے ایک پیرس میں UNESCO کے مرکزی دفاتر میں اپریل ۱۹۸۴ء کو دیا گیا تھا جب کہ دوسرا لیکچر اٹلی میں ۲۳۔۲۱ جون ۱۹۸۸ء کو دیا گیا۔ ان دونوں لیکچرز کا موضوع قرآن پاک کی آیات اور اسلامی لٹریچر کی روشنی میں سائنس اور اسلام کا موازنہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لیکچرز میں یہ وضاحت بھی کی کہ "وہ" ایک "صاحب دین حق" کیوں ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ میں ہونے والی سائنسی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔

سائنسی میدان میں ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ ترین خدمات کا اعتراف ان کو ۱۹۷۹ء میں سویڈن میں دیا جانے والا نوبل انعام ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جو تاریخی خطاب دیا تھا وہ بھی زیر نظر ایڈیشن کا حصہ ہے۔ (صفحہ ۳۷۵ تا ۳۷۷)

A man of Science, ABDUS SALAM

Nobel Laureate in Physics 1979

مصنف کا نام: John Ziman

صفحات کی تعداد: 99 : سن اشاعت: 1987ء

مطبع پریس: Research Centre for cooperation with Developing Countries Ljubliana. Yogoslavia.

تعارف:۔

پروفیسر جان زیمان کی تصنیف کردہ کتاب A MAN OF SCIENCE محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سائنسی اور تحقیقی کاوشوں پر مبنی ہے۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر جان زیمان کا خطاب ہے جو انہوں نے ۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو BRISTOL یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو DOCTOR OF SCIENCE کی اعزازی ڈگری دیئے جانے کی تقریب میں دیا تھا۔ اس خطاب میں پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر سلام کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

(صفحہ ۱۱ تا ۸۰) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے مندرجہ ذیل لیکچرز ہیں جو انہوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف مواقع پر دیئے۔

1. Physics and the Excellences of the Life it Brings.
2. Third World Higher education.
3. Science transfer for Development and Global Problems of science and Technology.
4. Highlights of science for a developing country.

کتاب میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی بطور سائنسدان، معلم، سائنس ایڈمنسٹریٹر اور امن کے سفیر، خدمات اور جدوجہد پر مبنی کاوشوں کا مکمل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مکمل BIO--DATA بھی آخری صفحات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اب تک ملنے والے تمام ملکی اور غیر ملکی اعزازات، انعامات، ڈگریاں، تمغہ جات اور ممبر شپس کی مکمل تفصیل بھی کتاب کا حصہ ہے۔ نظریاتی طبیعات سے متعلق ڈاکٹر سلام صاحب کے اب تک تقریباً ۲۵۰ PAPERS بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی ذات، ان کی تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں سے متعلق اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تفصیل بھی اس کتاب میں ملتی ہے۔

Abdus Salam Nobel Laureate from a Muslim Country

(سوانح حیات)

مصنف کا نام: ڈاکٹر عبدالغنی : صفحات کی تعداد: ۲۳۴

مطبع پریس: معارف پرنٹرز لمیٹڈ کراچی : تاریخ اشاعت: ۱۹۸۲ء (پہلا ایڈیشن)

تعارف:۔

محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی ابتدائی زندگی اور ان کے سائنسی و تحقیقی میدان میں کئے گئے کمالات پر مبنی مصنف ڈاکٹر عبدالغنی کی یہ کتاب ہر اس قاری کے لئے جو ڈاکٹر سلام صاحب کی ذات اور کارناموں سے گہرا شغف رکھتا ہے دلچسپی اور معلومات کا مظہر ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنف نے ڈاکٹر سلام صاحب کے ابتدائی حالات زندگی اور شخصیت اور پھر درجہ بدرجہ ان کی تعلیمی مدارج میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ان کے سائنسی اور تحقیقی کارناموں کو اتنے اعلیٰ پیرائے میں سپرد تحریر کیا ہے کہ ہربات اور ہر واقعہ اپنے اندر مکمل دلچسپی سمیٹے ہوئے ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی تجربات کو بھی موقع محل کے لحاظ سے شامل تحریر کیا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ڈاکٹر سلام صاحب سے مختلف مواقع پر ہونے والی ملاقاتوں کو اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ قرار دیتے ہوئے بڑی تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔

بقول مصنف ۱۹۵۸ء میں مجھے ذاتی طور ڈاکٹر سلام صاحب سے جدید فزکس پر طویل گفتگو کا موقع ملا جس کے نتیجہ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ سائنس پر صرف مغرب کی ہی اجارہ داری نہیں جیسا کہ پچھلی صدی بلکہ کئی صدیوں سے ہوتا آرہا ہے بلکہ یہ تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ ہے۔

مصنف نے شہرہ آفاق ماہر تعلیم اور سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور جناب قاضی ایم۔ اسلم صاحب سے، جن کے گھر میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے ۱۹۵۳ء۔۱۹۵۱ء تک کے عرصہ کے دوران تقریباً ۱۸ مہینے قیام فرمایا، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متعلق ہونے والی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"عبدالسلام صاحب بہت محنتی انسان تھے لیکن انہوں نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا کہ وہ سخت محنت کر رہے ہیں۔ جب بھی کوئی ان کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ سلام صاحب کو اپنی میز پر کام میں مصروف پاتا لیکن ڈاکٹر سلام صاحب فوراً کھڑے ہو کر اندر آنے والے سے نہایت پرسکون اور دلنشین انداز میں گفتگو کرنے لگتے، یہاں تک کہ آنے والا واپسی کی اجازت مانگتا۔ واپس جاتے ہوئے اگر وہ مڑ کر پیچھے دیکھتا تو ایک بار پھر وہ سلام صاحب کو اس طرح کام میں منہمک پاتا کہ گویا انہیں کسی نے مخل کیا ہی نہیں تھا"۔ (صفحہ ۴۰ تا ۴۱)

اگست ۱۹۶۵ء میں سیدو شریف میں ہونے والی سوات سائنس کانفرنس کے موقع پر آخری دن جب مصنف کی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ملاقات ہوئی تو بقول مصنف ڈاکٹر صاحب بہت اداس اور غمگین نظر آرہے تھے۔ مصنف کے ہمراہ کار میں تشریف فرما ہوئے۔ انہوں نے انتہائی دھیمے لہجے میں کہا کہ "اس بہیمانہ اور ملتوی شدہ جنگ سے کچھ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ ہماری نوخیز محب وطن نوجوان نسل کو قربانی پیش کرنا پڑی"۔ (صفحہ ۷۵)

بھٹو دور میں حکومت میں احمدیوں کو ناٹ مسلم قرار دئے جانے پر جب مصنف نے ڈاکٹر صاحب کا رد عمل جاننا چاہا تو انہوں نے کہا "ہمارے علماء نے کئی سالوں سے یہ روش اپنائی ہوئی ہے کہ جو مسلمان ان سے اختلاف کرے اسے "کافر" قرار دے دیا جائے...... چنانچہ ان ملاؤں کے کہنے پر بو علی سینا کی طرح جسے اس دور میں کافر ہونے کی سزا سنائی گئی تھی، میں بھی کافر قرار دیا گیا ہوں"۔ (صفحہ ۸۸)

کتاب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے مندرجہ ذیل Technical Papers شامل ہیں۔

1. Renaissance of Sciences in Arab and Islamic Lands March 1981.

2. The nature of the Ultimate explanation in Physics Nov 1979.

3. Gauage Unification of Fundamental forces

اس کے علاوہ ۲۰ اگست ۱۹۵۷ء میں پاکستان ٹائمز میں ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت اور ان کی سائنسی تحقیقات پر شائع ہونے والا ایک آرٹیکل بھی شامل ہے۔ (صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۴)

غرض ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی زندگی، شخصیت، سائنسی اور تحقیقی کارناموں کے حوالے سے پروفیسر عبدالغنی صاحب کی لکھی ہوئی یہ کتاب آسان فہم انگریزی زبان میں قابل مطالعہ بھی ہے اور دلچسپی و معلومات کا آئینہ بھی۔

Science & Education in Pakistan

مصنف کا نام: ڈاکٹر عبدالسلام : صفحات کی تعداد: ۱۴۰
مطبع پریس: سنگ میل پبلیکیشنز : سن اشاعت: ۱۹۸۹ء

تعارف:۔

زیر نظر کتاب محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے چند مضامین پر مشتمل ہے جنہیں نسیم احمد صاحب نے Edit کیا ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جن میں انہوں نے پاکستان میں سائنسی تعلیم اور تحقیق سے متعلقہ مسائل کو زیر بحث لاکر ان کا حل پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں ہونے والی نئی سائنسی پیش رفتوں کا بھی خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں جناب نسیم احمد صاحب نے کتاب کی نوعیت' پاکستان کی تعلیمی صورت حال اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایڈیٹر کے الفاظ میں اگست ۱۹۸۷ء میں پاکستان اپنے ۴۰ ویں یوم آزادی کیطرف گامزن ہے۔ پاکستان میں موجودہ سائنس اور تعلیم کی صورتحال اس کی عوام اور غیر ممالک کیلئے انتہائی کم حد تک باعث اطمینان ہے۔ نہ صرف ناخواندگی عام ہے بلکہ خواندگی کے میدان میں پاکستان کا ایشیا کے صرف دو ممالک افغانستان اور نیپال سے انتہائی مشکوک حد تک فرق ہے۔ پاکستان کا تعلیمی خرچ Per Capita ایشیا میں سب سے کم ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے جو Fellow of the Royal Society اور کسی بھی اسلامی ملک سے نوبل انعام حاصل کرنے والے پہلے شخص ہیں۔ پاکستان میں سائنس اور تعلیم کیلئے اور امداد کیلئے اپنی انعامی رقم کا عطیہ دے کر اپنی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ پاکستان کے سچے پر خلوص اور خدمت کیلئے وقف سپوت ہیں۔ اور تیسری دنیا کے انتھک مجاہد بھی۔

اٹلی کی حکومت کی فراخدلانہ مدد کیساتھ ساتھ وی آنا میں International Atomic Energy Agency اور پیرس میں اقوام متحدہ کی تعلیمی' سائنسی اور ثقافتی تنظیم کے تعاون سے Trieste میں .I.C.T.P آج دنیا کے تقریباً ۲۵۰۰۰ کے لگ بھگ سائنس دانوں اور محققین کیلئے باعث توجہ ہے۔ جن میں سے نصف تیسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وینس سے ۱۵۰ کلو میٹر مشرق میں واقع اس بے مثال ادارے کے ذریعے ڈاکٹر عبدالسلام کی کوشش ہے کہ تیسری دنیا میں بہت سے "سلام" پیدا ہوں جو ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ان اقوام میں جہاں ذہنی تاریکی کے غلبے نے سائنس کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے وہاں سائنسی ترقی کی مشعل کو روشن رکھیں۔ عبدالسلام صاحب کا ایک اور تحقیقاتی قدم جو انہوں نے اٹھایا۔ وہ تیسری دنیا کی سائنسی اکیڈمی کا قیام ہے جس سے تیسری دنیا کے تقریباً ۱۰۰ انتہائی نامور سائنسدان تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل عبدالسلام کی تقاریر جو پیغام لئے ہوئے ہیں وہ لامحدود توجہ اور ان تمام سوچنے والے پاکستانیوں کی خالص امداد کی مستحق ہیں جو اپنے ملک کو آئندہ صدی میں پسماندہ اور جاہل قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے روشن معاشرے کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اپنے عوام کو بہترین معیار زندگی مہیا کر سکے۔ اس کتاب میں وہ خطاب بھی شامل ہے جو پچھلے سال عبدالسلام صاحب نے نتھیا گلی میں ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں دیا تھا اور بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان میں شائع نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر عبدالسلام صاحب نہ صرف ایک ممتاز' مانے ہوئے اور معزز سائنسدان ہیں بلکہ وہ ایک ایسے مخلص دانا ہیں جن کی ہدایات اور نصائح کو نظرانداز کرنا ہمارے لئے سخت خطرناک ہے۔ پاکستان میں سائنس اور تعلیم سے منسلک افراد کا یہ فرض بنتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے کہا اس میں اپنی گہری دلچسپی اور توجہ ظاہر کریں اور ان تمام معقول تدابیر اور کوششوں کو آگے بڑھائیں جس سے پاکستان سائنس اور تعلیم کے میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین کے حوالے سے پاکستان کی معاشی' تعلیمی' سائنسی صورتحال کا جائزہ پیش کیا ہے اور اراکین حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ بغیر سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی سے آگاہی کے ترقی کا حصول ممکن نہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے موجودہ اور متوقع آنیوالے مسائل کو بھانپ کر ان کے خطرات سے نمٹنے کیلئے حل بھی پیش کیا ہے۔ بقول پروفیسر ایوان ارسو۔ "یہ پہلی اور اہم ترین بات ہے کہ عبدالسلام صاحب کے غم اور ناامیدیاں کسی ایک شخص واحد کی نہیں ہیں۔ جب وہ اپنی تمام تر داخلی قوت' شخصیت اور حق کیساتھ ان غم اور ناامیدیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آواز ترقی پذیر ممالک کے ان فرقوں اور جماعتوں کی گونج ہوتی ہے جو دنیا کی درجہ بندی سے دوچار ہیں۔ جو غیر مساوات ناانصافی اور غیر ترقی یافتہ ہونے کا داغ برداشت کر رہے ہیں۔ مصنف بے شک خود کو اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں جو دنیا کی تاریخ

کی تخلیق میں اقوام کے حقوق کیلئے لڑنے والے کا ہوتا ہے۔ ایک ایسی تاریخ جو اقوام کی روحانیت کے اہم مقامی وسائل کے مطابق ہو' جو ان کی خوشحالی کیلئے زیادہ مساوات پر مبنی ہو اور جو امن اور ترقی کیلئے ایک بہتر دنیا کی تخلیق کر سکے۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کا مکمل بائیو ڈیٹا دیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ ان تمام انعامات' اعزازات' ڈگریوں اور تمغہ جات کی تفصیل بھی ہے جو انہیں مختلف مواقع پر مختلف حکومتوں اور ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کی طرف سے ملے۔ مزید بر آں ڈاکٹر صاحب نے اب تک سائنسی اور طبیعاتی موضوعات پر جتنے مضامین اور کتب وغیرہ تصنیف کیں ان کی بھی مکمل تفصیل درج ہے۔

تعارف وخلاصہ برائے رسالہ خالد از مکرمہ منورہ حمید صاحبہ

RENAISSANCE OF SCIENCES

IN ISLAM COUNTRIES

۳۳۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر عبدالسلام کی کئی ایک تصانیف میں سے ایک ہے جو کہ H.R. DALAFI اور M.A. HASSAN نے مرتب کی ہے۔ کتاب کا دیباچہ FRANCESCO GABRIELI نے جب کہ اس کا تعارف دونوں ایڈیٹر صاحبان نے پیش کیا ہے۔

کتاب کل ۶ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر صاحب کے مسلم اور غیر مسلم ناظرین کے سامنے دیئے گئے لیکچروں پر مشتمل ہے۔ جو سب کے سب اسلام اور سائنس کے بنیادی موضوع سے متعلق ہیں۔ دوسرا حصہ اسلام میں سائنس کی ترقی کے لئے کئے گئے اقدامات سے متعلق ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں جو مضامین پیش کئے گئے ہیں وہ سائنسی ترقی کے عالمی رجحانات اور انکا اسلامی ملکوں میں کی جانے والی کوششوں سے موازنہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب کے چوتھے باب میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا وہ مضمون شامل ہے جو انہوں نے حضرت سر ظفر اللہ خان صاحب کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر لکھا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے علمی کارناموں کو BIODATA کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی چند صفحات کو ڈاکٹر صاحب کی چند نادر تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری پر ڈاکٹر عبدالسلام کی اس تڑپ کا گہرا اثر پڑتا ہے جو ان کے دل میں اسلامی ممالک اور تیسری دنیا میں سائنس کی ترقی کے لئے تھی۔ اس کے علاوہ اسلام میں سائنسی ترقی کے زوال اور موجودہ حالات میں اسلامی ملکوں کے سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کی وجوہات کو تجزیاتی رنگ میں بہت تفصیل سے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

آپ اپنے لیکچرز میں جن میں مسلمانوں کو مخاطب ہو کر ان کو احساس دلاتے ہیں کہ فزکس ساری دنیا کے بنی نوع کا ورثہ ہے اور تیسری دنیا کے ممالک جو مواقع اور وسائل کی کمی سے اپنے آپ کو سائنس کی ترقی سے خارج سمجھتے ہیں ان کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو مظہر کائنات پر غور کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور اس میں کسی مخصوص قوم یا علاقے کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک کھلا چیلنج ہے اور اگر کوئی مضبوط ارادہ باندھ لے تو تحقیق کے دروازے سب کے لئے یکساں کھلے ہیں۔

آپ ان مسلمان طبقات کے نظریے کی سختی سے تردید کرتے ہیں جن کے خیال میں مسلمانوں کو اعلیٰ سائنسی علوم کے حصول میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ کتاب میں اکثر مقامات پر قرآنی آیات سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر کائنات کے سربستہ رازوں کو کھولنے کی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔

سائنسی میدان میں مسلمان ملکوں کے مغربی اقوام کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے کا تذکرہ بڑے دکھ سے کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھتے ہیں۔

"مجھے ابھی تک یاد آتا ہے جب ایک نوبل انعام یافتہ

یورپین سائنسدان نے مجھ سے کہا "سلام کیا تم واقعی ضروری سمجھتے ہو کہ ہمیں ان قوموں کو کھلانے اور زندہ رکھنے کے لئے ان کی مدد کرنی چاہئے جنہوں نے انسانی خزانہ علم میں ایک نقطے کا اضافہ نہیں کیا"۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ یہ نہ بھی کہتا تو میرے احساس خودداری کو اس وقت بڑی ٹھیس پہنچتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہسپتالوں میں استعمال ہونے والی پنسلین کے بنانے میں بھی مسلمان ملکوں کا کوئی حصہ نہیں"۔ (صفحہ ۲۷)

آپ نے اسلامی ممالک کو سائنسی ترقی کے میدان میں ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لاکھڑا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کے لئے ایک لمبی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ایک پرجوش جذبہ قوت ارادی کی بھی۔ اس ضمن میں آپ جاپان کی اپنے اکثر لیکچروں میں مثال دیتے ہیں کہ ۱۹۶۹ء کے بعد جاپان کے شاہ MUTSUSHITO کے دوبارہ اقتدار میں آنے سے ۱۹۹۵ء تک جاپان نے اس کم عرصے میں کن خطوط پر منصوبے بنائے کہ وہ امریکہ کے مقابل پر آکھڑا ہوا۔ جو بنیادی ارادہ ان کے سارے منصوبوں کی بنیاد بنا وہ یہ تھا کہ علم حاصل کرنا ہے خواہ کہیں سے بھی کرنا پڑے۔ اس کے لئے انہوں نے شروع میں باہر سے سائنسدان اور انجینئرز اپنے ملک میں بلائے، اپنے طلباء پڑھنے کے لئے باہر بھیجے۔ بیرونی ماہرین کی مدد سے یونیورسٹیاں اور ریسرچ سنٹر قائم کئے اور باہر سے فارغ التحصیل طلباء نے اپنی یونیورسٹیاں اور ریسرچ سنٹرز میں باہر سے درآمد شدہ ماہرین کی مدد سے تربیت حاصل کی اور یوں ایک قلیل مدت میں جاپان کے پاس اپنے سائنسدانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما و ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد جاپان کا دوبارہ اپنی معیشت کو سنبھالنا بھی ان کی اولوالعزمی کی ایک زندہ مثال ہے۔ آج اسی جذبے کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ جن کا پہلا فرض ہی قرآن کریم میں علم سیکھنا اور سکھانا بتایا گیا ہے۔

کتاب کے بعض مقامات پر محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے "اسلامی سائنسی فاؤنڈیشن" بنانے والے منصوبے کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ جس میں اس ادارے کے قیام کے مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کی تفصیلی منصوبہ بندی درج کی گئی ہے۔ کتاب میں بیشتر مقامات پر مختلف گوشوارے دئے گئے ہیں جن میں آپ نے اپنے لیکچرز کے دوران اسلامی ملکوں میں سائنسی میدان میں ہونے والے کاموں کا مغربی رفتار سے موازنہ پیش کیا ہے اور ایک افسوسناک حقیقت کو ہم پر کھولا ہے کہ مسلمان ملکوں میں GNP کا صرف ۲ فی صد حصہ سائنسی ترقی پر خرچ کیا جاتا ہے جب کہ مغربی اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہ ۱۲ فی صد ہے۔ اس طرح مسلمان اور مغربی ملکوں میں سائنسی میدان میں کام کی رفتار اور ترقی کا تناسب 6:1 ہے جو کہ خطرناک صورتحال ہے۔

صفحہ ۲۴۰ پر مشرق وسطی کے ایک ایڈیٹر کو ۱۹۸۶ء میں انٹرویو دیتے ہوئے عرب ممالک میں سائنس کی ناکامی پر دکھ کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ جن پانچ عناصر کی سائنسی میدان میں ترقی کے لئے ضرورت ہے ان کا عربوں میں شدت سے فقدان ہے۔ ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے' پرجوش ارادہ' اچھے ذہنوں کی حوصلہ افزائی' سائنسدانوں کو اپنا کام جاری رکھنے کے لئے تحفظ کی فراہمی' سائنس COMMUNITY کی خود مختاری اور سائنسی کوششوں کا بین الاقوامی اشتراک۔

عرب فلسطین کا تذکرہ تو کریں گے' مغرب سے جنگ کی بات بھی کریں گے لیکن کوئی سائنس کی بات نہیں کرتا۔ ITCP کی ترقی کے لئے فنڈز دینے میں سوائے کویت کے کسی عرب ملک کو دلچسپی نہیں۔

آپ نے عربوں کے اس رویے کے تعلق میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیکچرز میں اسلامی ممالک میں سائنسی طرز و عمل کے پیچھے رہ جانے کی وجوہات اور ان کے ازالے کے لئے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت پر بے حد زور دیا ہے۔

صفحہ ۳۱۷ پر آپ کا اٹلی میں جون ۱۹۸۸ء میں دیئے جانے والے لیکچر کا وہ حصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں آپ مغربی دنیا کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ سائنس صرف عیسائی و یہود قوموں کی اختراع ہے۔ آپ نے انسانی ترقی کے اس دور میں جس کا تعلق ۱۰۰۰ء سے ہے ثابت کیا ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے عظیم سائنسی کارنامے انجام دیئے جو آج کے نئے سائنسی دور کے لئے بنیاد کا کام کر رہے ہیں۔ آپ نے خصوصیت سے ابن الہیثم' ابن سینا اور البیرونی کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

شکریہ احباب (مدیر کی طرف سے)

الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ ڈاکٹر عبدالسلام نمبر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس کو پسند کریں گے اور مفید پائیں گے۔ ایسے وقت میں ان احباب کے لئے دعا کرنا نہ بھولئے گا جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اس نمبر کو بہتر اور معیاری بنانے یا آپ تک اس شکل میں پہنچانے کے لئے ہمارے ساتھ تعاون کیا اور ہمارے شریک کار رہے۔ ان سب کا نام بنام ذکر کرنا تو ممکن نہیں البتہ اجمالی رنگ میں سب سے پہلے تو مضمون نگار احباب ہیں۔ جنہوں نے متعدد مضامین ارسال کئے لیکن ظاہر ہے کہ سارے کے سارے تو شائع نہیں ہوسکتے تھے۔ پر کچھ مضامین بہت تاخیر سے موصول ہوئے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ان سب کو جزا دے جن کے مضمون شائع ہوگئے۔ ان کے نام تو ظاہر ہے کہ ساتھ آگئے البتہ جن کے مضمون شائع نہیں ہوسکے ان کے بھی نام ہم دے رہے ہیں۔ کچھ دوست ہیں جنہوں نے مضامین اور شائع شدہ اخبارات و رسائل ارسال کئے اور خوب ہاتھ بٹایا۔۔۔۔ اور توقع سے بڑھ کر تعاون کیا۔ ان میں مکرم عبدالمالک صاحب لاہور، مکرم منور علی شاہد صاحب لاہور، مکرم ناصر احمد صاحب راولپنڈی، ڈاکٹر صاحب کے بھائیوں میں سے مکرم چوہدری عبدالرشید صاحب لندن اور چوہدری عبدالحمید صاحب لاہور، محترمہ حمیدہ بشیر صاحبہ ہمشیرہ صاحبہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایسا ہی ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ صاحبہ محترمہ امتہ الحفیظ صاحبہ کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے گو تاخیر سے رابطہ کیا لیکن ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے پر خلوص تعاون کے ساتھ رابطہ کیا اور نوبل انعام میں ملنے والے میڈل کی تصویر بھی ارسال کی جو بوجوہ ہم شائع نہیں کرسکے۔

اسی طرح حبیب الرحمان زیروی صاحب اسسٹنٹ لائبریرین خلافت لائبریری کے بھی بہت ممنون ہیں کہ جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے کتب، تراشہ جات اور تصاویر بہم پہنچائیں اور محترم ملک مبشر احمد صاحب سابق قائد علاقہ سندھ (جو کہ محترم ڈاکٹر عبدالسلام کے بھانجے بھی ہیں) خاص طور پر شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں کہ کراچی سے ڈاکٹر صاحب کی تصاویر اور ذاتی البم لے کر آئے اور رسالے کے لئے پیش کیں۔ ایسا ہی مکرم عبدالباسط صاحب آف ملتان نے بھی ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تصاویر اور مواد پیش کیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اس نمبر میں شائع شدہ مضامین کا ایک حصہ وہ ہے جو کہ آڈیو ویڈیو کیسٹس سے Transcribe کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام کافی محنت طلب تھا۔ اس میں خاکسار کا ہاتھ بٹایا ہے خاکسار کی اہلیہ مکرمہ امتہ القیوم سعدیہ صاحبہ اور ان کی ہمشیرہ مکرمہ امتہ الحئی آسیہ صاحبہ نے، مسودات کو چیک کرنا، خود سارا لکھنا۔۔۔۔ یہ سارا کام انہوں نے کیا اللہ تعالیٰ انہیں بہت جزا دے اور اس حوالے سے مرکزی شعبہ سمعی بصری اور اس کے نگران مکرم منیر احمد صاحب بسمل اور ان کے رفقاء کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے ہمیں یہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹس بلا تردد عنایت کیں اور ان کی Transcription شائع کرنے کی اجازت بھی دی۔

Transcription کے ضمن میں ایک اہم نام بغرض دعا خاص طور پر قابل ذکر ہے اور وہ ہے محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ ربوہ کا کہ جنہوں نے اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود ہماری درخواست پر ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ ثانی اور صاحبزادے مکرم عمر سلام صاحب کے ساتھ انگریزی میں کیا ہوا انٹرویو ویڈیو ٹیپ سے بامحاورہ اور ترجمہ میں لکھا اور چند گھنٹوں میں یہ سارا کام کرکے ارسال بھی کردیا۔۔۔۔ ان کے اس پر خلوص تعاون پر دل اللہ تعالیٰ کی حمد اور ان کیلئے تشکر کے جذبات سے لبریز ہے۔

ایسا ہی انٹرویوز کے حوالے سے برادرم مکرم حافظ راشد جاوید صاحب کا نمایاں حصہ اس خاص نمبر میں ہے۔ آپ کئی بار اس غرض کے لئے اپنے کاموں کا حرج کرکے لاہور گئے اور وہاں سے احباب کے انٹرویوز کئے۔ ان کو لکھا اور اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی لندن میں ادا کی جانیوالی نماز جنازہ کی تصاویر ویڈیو سے پرنٹ کروانے میں بھی برادرم حافظ صاحب نے ساری محنت کی اور اب وہ تصاویر اس نمبر میں شامل ہیں۔ آپ کے لئے اور آپ

بقیہ صفحہ 213 پر

خُدا حافظ و ناصِر

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی نمازِ جنازہ ــــ ایک پُرتاثر

(مدیر "خالد" کے قلم سے)

یوں تو روز ہی دن چڑھتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اور تاریخ کے بعد تاریخ اور مہینوں کے بعد مہینہ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جو مہینوں بلکہ سالوں پر بھی بھاری ہو جاتے ہیں۔ اپنی یادوں اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے امر ہو جاتے ہیں اور تاریخی یادگار بن جایا کرتے ہیں۔ ایسے ہی بہت سارے یادگار دنوں میں سے ایک دن ۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء کا دن بھی ہے۔ جس دن کہ ڈاکٹر عبدالسلامؒ خلافت کا ایک منکسر المزاج، عاجزی کا مجسمہ، خلافت کا وفادار عاشق اپنے محبوب آقا سے ہمیشہ کیلئے لندن سے رخصت ہوا۔

محبتیں اور شفقتیں لٹانے والے آقا نے بھی جس پیار اور شان سے اپنے محبوب ساتھی کو رخصت کیا لندن کے سورج کو بھی کم کم ہی ایسے نظارے دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے۔ گو کہ ہم لوگ اپنے مادی جسموں کے ساتھ شامل نہیں تھے لیکن ایم ٹی اے کی براہ راست منظر کشی کے ذریعہ ہم اپنے تمام ترجذبات و احساسات کے ساتھ ان قابل رشک تاریخی لمحات میں شامل تھے۔

حضور انور کا جنازہ پڑھانے سے قبل اپنے بابرکت ہاتھوں سے کچھ چھڑکنا اور پھر ان عطر بیز "بَرْدًا وَّ سَلٰمًا" کی تاثیر رکھنے والے قطرات محبت کو نچھاور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنا اور دیر تک دیکھتے چلے جانا عاقبت سنوار جانے والی یہ نظریں دیر تک اس معصوم چہرے پر پڑتی رہیں۔ اس کے بعد آپ نے ڈاکٹر صاحب کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ لاریب جس کی تاثیر مسیحائی روح تک اتر گئی ہوگی۔ زمین و آسمان اس محبت بھرے نظارے کو دیکھنے کیلئے ذرا سی دیر کیلئے تھم سے گئے ہوں گے۔ سورج بھی رک کر، جھک کر دیکھ رہا ہوگا کہ ایسے نظارے اس نے بھی دیکھے تو ہوں گے لیکن شاذ شاذ، کبھی کبھی، کہیں کہیں۔

ایسی موت پر تو ہزاروں زندگیاں قربان ہونے کو تیار ہوتی ہیں۔ پھر طویل دعائے جنازہ اور اس کے بعد وین تک حضور انور کا اپنے کاندھوں پر اٹھا کر رخصت کرنا کہ لو! اللہ کے حوالے۔

اللہ نگہبان خدا حافظ و ناصر

ان محبتوں اور خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پانے والی (انشاء اللہ) دعاؤں کے اعزازات سے سجا ہوا پرسکون چہرے کے ساتھ۔ نفس مطمئنہ کا نورانی رنگ چڑھائے ہوئے۔ عبدالسلام کا جسد خاکی اپنے وطن، ہاں وہی وطن جس کی محبت میں ڈاکٹر صاحب کا دل مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہا، اسی وطن میں آیا

پہلے لاہور میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر ربوہ کیلئے روانگی ہوئی۔ ربوہ ـــــ تمام احمدیوں کا روحانی مرکز، دلوں کو قرار بخشنے والا اور روحوں کو تسکین پہنچانے والا ربوہ، دور و نزدیک سے آئے ہوئے لوگ، شہر شہر اور بستی بستی سے آئے ہوئے، رات کی سردی میں کھڑے منتظر، جس میں اپنے پرائے سبھی تھے۔ بچے بوڑھے، مرد خواتین، پڑھے لکھے ان پڑھ، پروفیسرز اور تانگہ بان، صنعتکار اور خوانچہ فروش، سب ایک ہی غم میں ایک قطار میں کھڑے اس کے چہرے کا آخری دیدار کرنے کیلئے بے چین۔ یوں لگتا تھا کہ جانے والا پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تانگہ بان کا بھی اتنا ہی قریبی ہے جتنا کسی پروفیسر کا۔ ایک ان پڑھ بوڑھے دیہاتی کا بھی اتنا ہی پیارا ہے جتنا کہ نوجوان افسر کا۔ ایسے جیسے اس کو رخصت کرنے والے ایک ہی گھر کے ایک ہی کنبے کے افراد تھے جو اپنے ایک نیک، مجذوب اور بزرگ فلسفی کو الوداع کہنے آئے ہیں۔

بیمار کی نبض کی طرح یہ قطار دیر تک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ رات بھی بھیگ گئی۔ سب سوگوار اس جانے والے اپنے بھائی کیلئے زیر لب دعا گو اور سوگوار۔ اس قطار میں سے اس ہجوم میں چند ایک کے جذبات جو دراصل سبھی دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں قارئین تک پہنچانا چاہوں گا۔

○ محترم حضرت مرزا عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ امیر جماعتہائے احمدیہ صوبہ پنجاب

"مکرم و محترم ڈاکٹر صاحب بڑی محبت والے وجود تھے۔ جس کے ساتھ خود بخود پیار پیدا ہوتا تھا۔ آپ کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری بہت تھی۔ میں جب بھی لندن گیا تو آپ کو ضرور ملا ہوں۔ گزشتہ سال ۹۵ء میں جب میں گیا ہوں تو اس وقت آپ ہسپتال میں تھے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ آپ کے پاس بیٹھا رہا بات تو آپ کر نہیں سکتے تھے۔ البتہ ہاتھ پکڑ کر وہ بیٹھے رہے اور یوں ہم آنکھوں آنکھوں میں دیر تک باتیں کرتے رہے اور دل میں دعائیں کرتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

اس مرتبہ ۹۶ء جب میں لندن گیا تو آپ ہسپتال سے اپنے گھر آ چکے تھے۔ میں وہاں حاضر ہوا۔ بہت ہی پیارے وجود معلوم ہوتے تھے۔ بڑی محبت کے ساتھ آپ ملے۔ میں آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ آپ نے بہت محبت سے میرا ہاتھ تھامے رکھا آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے گو زبان سے بول نہیں سکتے تھے لیکن ان کے چہرے سے محبت اور درد کا جو معصومانہ پیار ا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر میرے لئے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔
ان کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں عاجزی بہت تھی باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ نے شہرت کے آسمان پر بٹھایا۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب تحفہ بھیجی اور اس پر لکھا کہ جو بچے کو اپنے باپ سے محبت ہوتی ہے اس جذبہ کے تحت میں کتاب پیش کرتا ہوں۔ چونکہ حضرت ڈاکٹر صاحب کے والد صاحب کے ساتھ بھی محبت کے تعلقات تھے اس وجہ سے وہ بھی خاص طور پر تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا وصال دنیاوی لحاظ سے تو بہت نقصان دہ معلوم ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمتیں ہوتی ہیں جب وہ چاہتا ہے جسے چاہے بلا لیتا ہے جب وہ چاہتا ہے کسی کو بھیجتا ہے اس لحاظ سے ہم ہر بات پر راضی ہیں گو کہ طبیعت غم سے بھری ہوئی ہے انکی جدائی کی وجہ سے۔

○ مکرم و محترم چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل اعلیٰ تحریک جدید

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے متعلق مجھے کہنے کی ضرورت نہیں اتنی معروف شخصیت ہے۔ بحیثیت ایک عظیم احمدی کے ایک عظیم سائنسدان کے مجھے فخر ہے کہ میں جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میں ان کا شاگرد رہا نہایت شفیق اور مہربان اور حوصلہ افزائی کرنے والے استاد تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

○ محترم سید میر محمود احمد صاحب ناصر وکیل التعلیم

ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب جہاں سائنس کی دنیا میں چوٹی کا مقام رکھتے تھے وہاں جو میرا ذاتی تجربہ ان کے ساتھ ہے وہ ان کی محبت، شفقت اور انکساری کا ہے اس وجہ سے ان کو ایک غیر معمولی مقام حاصل تھا وہ اٹلی میں تھے اور میں امریکہ میں (مربی) تھا میں نے ان کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ جب کبھی یہاں تشریف لائیں تو آپ ہمیں پہلے بتا دیں تاکہ ہم یہاں کوئی تقریب کر لیں گے۔ چنانچہ آپ تشریف لائے اور پہلے مجھے اطلاع کر دی ہم نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں واشنگٹن اور اس کی اردگرد کی یونیورسٹیوں کے فزکس کے چوٹی کے لوگ آئے۔ عالمی شہرت کے یہودی پروفیسر بھی جو ان کے ہم پلہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت لطیف اور عمدہ تقریر کی اور یوں دعوت الی اللہ کا ایک بہت عمدہ موقعہ ملا۔ اس وقت میں نے آپ کی محبت، شفقت اور سادگی انکساری کا قریب سے جائزہ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا سا بھی علم آ جائے تو غرور پیدا ہو جاتا ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب میں کسی قسم کا کوئی غرور اور تکبر نہیں آیا۔ نہایت عاجز، منکسر المزاج تھے اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

۱۱ بجے لجنہ کے دفاتر کی وسیع گراؤنڈ میں حضرت خلیفۃ المسیح کی عدم موجودگی میں امیر مقامی و ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب تشریف لائے۔ ہزاروں سوگواروں کو ساتھ لیکر ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ ادا کی۔ ربوہ کے خدام کے خوبصورت نظم و ضبط کے ساتھ جنازہ بہشتی مقبرہ لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب (اپنی خواہش اور وصیت کے مطابق جس کو حضرت خلیفۃ المسیح نے از راہ شفقت منظور فرمایا) اپنے بزرگ صالح والدین کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب ربوہ کی اس قطعہ زمین میں ابدی نیند سو رہے ہیں کہ کچھ ایسی سرزمین کے بارے میں خدا کے فرستادے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کچھ یوں دعا فرمائی تھی۔

"اور میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس میں برکت دے اور اس کو بہشتی مقبرہ بنا دے اور یہ اس جماعت کے پاک دل لوگوں کی خوابگاہ ہو جنہوں نے درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم کر لیا اور دنیا کی محبت چھوڑ دی اور خدا کیلئے ہو گئے اور پاک تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لی۔ آمین یا رب العالمین۔

.... اور پھر میں تیسری دفعہ دعا کرتا ہوں کہ اے میرے قادر کریم اے غفور و رحیم! تو صرف ان لوگوں کو اس جگہ قبروں کی جگہ دے جو تیرے اس فرستادہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور غرض نفسانی اور بدظنی اپنے اندر نہیں رکھتے اور جیسا کہ حق ایمان اور اطاعت کا ہے۔ بجا لاتے ہیں اور تیرے لئے اور تیری راہ میں اپنے دلوں میں جان فدا کر چکے ہیں جن سے تو راضی ہے اور جن کو تو جانتا ہے کہ وہ بکلی تیری محبت میں کھوئے گئے اور تیرے فرستادہ سے وفاداری اور پورے ادب اور انشراحی ایمان کے ساتھ محبت اور جانفشانی کا تعلق رکھتے ہیں۔ آمین یا رب العالمین"۔

(رسالہ الوصیت صفحہ ۱۸۔ ۲۰ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۶۔ ۳۱۸)

اے خدا بر تربتِ اُو ابرِ رحمتہا ببار
داخلش کُن از کمالِ فضل در بیت النعیم

بقیہ از صفحہ 210

کے ساتھ لاہور میں جن دوستوں نے تعاون کیا خصوصاً مکرم انصر رضا صاحب، مکرم منصور احمد صاحب اور مکرم ندیم احمد خان صاحب۔۔۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ بہترین جزا دے۔

اس رسالہ کو خوبصورت بنانے میں ہمارے مینیجر صاحب مکرم مبارک احمد صاحب خالد جو کہ عرصہ ۳۴ سال سے ان رسائل کے ساتھ وابستہ ہیں ان کی محنت اور مفید مشورے بھی شامل ہوتے ہیں اور دیگر کارکنان پریس اور شعبہ اشاعت بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ رسالہ کی کمپوزنگ میں مکرم مقصود اظہر گوندل صاحب، مکرم سید صہیب احمد صاحب اور اس کی پیسٹنگ مکرم حبیب الرحمٰن غوری صاحب نے کی اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزا دے۔ مکرم برادرم ڈاکٹر سلطان احمد مبشر صاحب مہتمم اشاعت اور محترم صدر صاحب مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان کا بھی شکریہ کہ جن کی مسلسل توجہ اور نگرانی اور ہر قسم کا تعاون شامل حال رہا جس کی بدولت اتنا ضخیم اور ۴۰ کے قریب تصاویر سے مزین رسالہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اور سب سے آخر پر جیسا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ جس کی بدولت ہر قسم کی مشکل آسان ہوتی چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بے پایاں فضل سے نوازے۔ پردہ پوشی کا سلوک فرمائے اور مقبول خدمت دین کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی

ٹریسٹے سنٹر ICTP کا نام تبدیل کر کے سلام سنٹر رکھ دیا گیا

(منیر احمد خان صاحب سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)

شکریہ دی نیوز ۲۱ نومبر 1997ء

پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنس دان اور بیسویں صدی کے دس عظیم ترین ماہرین طبیعات میں سے ایک ڈاکٹر عبدالسلام گزشتہ سال جلاوطنی کی حالت میں لندن میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے وطن کیلئے بے شمار اعزازات حاصل کیے اور سائنس کی دنیا میں پاکستان کے تاثر کو بہت بہتر بنایا۔ وطن کے اس مایہ ناز فرزند کی نعش آخری خواہش کے مطابق تدفین کیلئے پاکستان لائی گئی مگر آپ کے تابوت کو بھی کسی اعزاز اور گارڈ آف آنر کے ساتھ وصول نہیں کیا گیا جھنگ میں جہاں آپ نے پرورش پائی تھی آپ کی تدفین بڑی خاموشی کے ساتھ ہو گئی۔ (سہواً لکھا گیا ہے ورنہ آپ کی تدفین ربوہ میں ہوئی ہے۔ مترجم) ہمارے اعلیٰ حکام نے انہیں اس لئے نظر انداز کیا کہ وہ احمدی ہونے کے باعث غیر مسلم تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ایسے پاکستانی تھے جو اپنے وطن عالم اسلام اور تیسری دنیا کے لئے باعث عزت تھے۔ مگر ہماری کم نگاہی اور سیاسی مصلحتوں نے ہمیں ایک ایسے شخص کو خراج تحسین پیش کرنے سے بھی روک دیا جس نے ہماری خاطر بہت کچھ کیا ہے۔

ہم تو ڈاکٹر عبدالسلام کو نظر انداز کر سکتے ہیں مگر دنیا انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ چھوٹے لوگوں نے آپ کے مفاد کو چھوٹا کر کے دکھانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ ناکام رہی ہیں کیونکہ آپ تو درحقیقت اس دور کے عظیم ترین انسانوں میں سے ہیں اس لئے آپ کی شہرت کو داندار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم ڈاکٹر عبدالسلام کے عظیم کارناموں کو حقیر کر کے دکھانے کی کوشش کریں گے تو ہم خود دنیا کی نظروں میں حقیر ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات کے بعد ہم ان کی کوئی یادگار تعمیر کرنے میں بھی پس و پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بددیانت رہنماؤں، جاہل ماہرین تعلیم اور خود اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے نام پر ہم نے سڑکوں، پلوں اور اداروں اور شہروں کے نام خود ان کی زندگیوں میں رکھے ہیں۔ حالانکہ انسان کی حقیقی قدر و منزلت کی پہچان اس کے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ سٹالن کی طرح کے ظالم آمروں اور جھوٹے اور جعلی ہیروز کے نام تاریخ بڑی بے رحمی سے مٹا ڈالتی ہے۔ لیکن ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں آپ کی وفات کی پہلی برسی کے موقعہ پر عصر حاضر کے مشہور ترین اور اہم ترین ماہرین طبیعات کے اجتماع میں جس میں کئی نوبل انعام یافتہ بھی شامل تھے۔ عالمی شہرت رکھنے والے نظریاتی طبیعات کے ادارہ (ICTP) کا نام تبدیل کر کے عبدالسلام سنٹر رکھ دیا گیا ہے۔ جدید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک عظیم ادارے کا نام تیسری دنیا کے ایک سائنس دان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ پاکستانی حکومت کی خواہش پر نہیں کیا گیا بلکہ ادارے کی سرپرستی کرنے والوں کا اپنا فیصلہ ہے۔ ان سرپرستی کرنے والوں میں اٹلی کی حکومت، انٹرنیشنل اٹومک انرجی ایجنسی اور اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تنظیمیں شامل ہیں۔ اٹلی کی حکومت اپنے کسی نوبل انعام یافتہ کے نام پر اس کا نام رکھنے کیلئے اصرار کر سکتی تھی کیونکہ وہ اس ادارے کا ۸۰ فیصد خرچ جو ۱۵ ملین ڈالر سالانہ ہے دیتی ہے۔ یہ ان سب کی فراخ دلی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کے نام پر اس کا نام رکھا

Stop Press

The News International, Friday, November 21, 1997

Salam remembered

Munir Ahmed Khan

A year ago Professor Abdus Salam, Pakistan's only Nobel laureate and one of the ten leading men of physics in the 20th century, died in exile in London. He had won innumerable laurels for his country and raised its image in the world of science. Following his last wish the body of this illustrious son of the soil was flown to his homeland, but there was no honour guard to receive him. He was buried quietly in Jhang where he grew up. Our authorities ignored him because he was a non-Muslim being an Ahmadi, but he was a Pakistani who brought great credit to his country, the Muslim world and the third world as a whole. Our perspectives and political expediency prevented as from paying homage to man who has done so much for us.

We can ignore him but the world remembers him. Little men have tried to belittle him with little effect as his fame, as one of the truly great of our era, is impressible. By trying to downplay his achievements we only diminish ourselves in the eyes of the world. We are reluctant to erect any memorial to him even after his death. However, some shady leaders, ignorant educationists and self-proclaimed wizards have got roads, bridges, institutions and towns named after them even during their lifetime. The real worth of a man is recognised after he is no more and history is merciless in obliterating the names of fake heroes or tyrants such as Stalin and others.

But the world will always remember our Salam. On his first death anniversary at Trieste, Italy, before an assemblage of most eminent physicists of the day, including several more laureates, the name of the world famous International Centre of Theoretical Physics (ICTP) has been changed to Abdus Salam Centre. This is the first time in modern history that a centre of excellence in Europe has been named after a scientist from the third world.

This was not done at the urging of the Pakistani government but represented a voluntary decision by the sponsors of ICTP, which include the government of Italy, the International Atomic Energy Agency and the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation. Italy which contributes $15 million a year (or 80 per cent of the total budget) could have insisted on naming it after one of its own Nobel laureates. But it is a tribute to the generosity of the Italian government and others to name it after a man who actually conceived and built it as a centre of learning for the whole world.

Salam was respected by the highly sophisticated world physics community because he added a new dimension to human knowledge. He reduced the number of elementary forces from four (namely gravity, strong nuclear, electromagnetic and weak nuclear) to three by proving that the weak nuclear and electromagnetic forces were one. This is a great step towards the unification of all four forces which is the goal of all physicists.

While other eminent physicists have been driven by quest of knowledge alone, his imagination was fired by the belief in Oneness of the Creator and the ultimate unification of all forces in Nature as they have the same source. Towards the end of his life he had turned to applying the tools of mathematics and physics to understand how the biological processes proceed and the cells divide themselves. Time did not permit him to complete his work but the lead he has given may inspire others to solve this problem and win a Nobel prize.

Even though he lived in exile for 45 years he never forgot Pakistan. He was tempted by many to change his nationality but he refused this even after he had been knighted by the Queen. He believed in Pakistan. He wanted Pakistan to flourish and use science and technology to accelerate its economic and social development.

Salam, as chief security adviser to three presidents over 14 years, urged them to invest more in science, technology and education and headed many commissions to prepare plans for their promotion. Unfortunately, his recommendations were ignored by political leaders and policy makers. He advised President Ayub Khan to seek technology instead of loans from the US. This persuaded President Kennedy to send the Revalle mission on water-logging and salinity to Pakistan. He worked the setting up of Suparco for space research.

Salam was a member of the Pakistan Atomic Energy Commission for 14 years and helped guide its programmes in performance in many areas. He supported the establishment and Pinstech and Kanupp. If his recommendations were accepted by Ayub Khan Pakistan would have had its nuclear fuel reprocessing plant and other key facilities in the sixties when they were available without safeguards and at a low cost.

Salam was a man of the East and the West and enjoyed world-wide respect. Kings and queens, presidents and prime ministers received him and sought his advice. Once there was a dinner in his honour with the Chinese prime minister as chief guest. To everybody's surprise the president, contrary to all protocol, decided to join because he wanted to greet this amazing man.

His contributions to the cause of science and technology in the third world are immense. To break the isolation of the scientists of the developing countries (from which he himself suffered while at Government College, Lahore) he established the ICTP at Trieste. It is a place where scientists from poor countries can meet those from the rich and those of the East can interact with those from the West in the cold war years. By interacting with great minds of the day, scholars and researchers from the developing countries were inspired and planted the seeds of science in their own lands which are flowering now. His vision for science was broad and regarded as an instrument for development. He started the Third World Academy and research centres in such fields as computers, lasers, genetic engineering and biotechnology materials and energy. He encouraged cooperation not only between North and South but also between South and South.

With all his glory and fame he remained a humble man. He never exhibited his prestige and standing to amass wealth and build palaces. He gave the proceeds from his Nobel prize for awarding scholarships to the needy. He will remain a role model for young scientists all over the world.

It was his greatest wish that Pakistan should have a first rate centre for physics. He had hoped that the annual Seminar on Physics and Contemporary Needs will lead to the establishment of such a centre to help build a new generation of physicists and mathematicians in Pakistan. He himself wanted to lecture there. Unfortunately, the proposal for such a centre has been mired in bureaucracy and conflicts. The best tribute which the physicists of Pakistan can pay to him is to rise above their differences and set up such a centre so that young physicists can follow in Salam's footsteps.

The writer is former chairman, Pakistan Atomic Energy Commission.

جس نے ساری دنیا کے فائدے کے لئے یہ علمی درسگاہ تعمیر کی۔

دنیا کے عظیم ماہرین طبیعات ڈاکٹر عبدالسلام کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ انہوں نے انسان کے علم میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ آپ نے چار بنیادی قوتوں کے متعلق ثابت کیا کہ وہ درحقیقت تین ہیں۔ چار بنیادی قوتیں کشش ثقل، مضبوط نیوکلیائی طاقت، برقی مقناطیسی طاقت اور کمزور نیوکلیائی طاقت ہیں۔ آپ نے ثابت کیا کہ کمزور نیوکلیائی طاقت اور برقی مقناطیسی طاقت دراصل ایک ہی ہیں۔ چار بنیادی قوتوں کو ایک ثابت کرنے کی جانب یہ ایک بہت عظیم قدم تھا۔ اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے تمام ماہرین طبیعات کوشاں ہیں۔

دنیا کے مشہور ماہرین طبیعات محض علمی پیاس بجھانے کیلئے تحقیق کرتے ہیں مگر ڈاکٹر عبدالسلام کی جستجو کا سفر خالق کائنات کی واحدانیت پر ایمان کے ساتھ آگے بڑھا ہے۔ ان کا اعلان یہ تھا کہ چونکہ یہ تمام قوتیں خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اس لئے بالآخر یہ ایک ثابت ہونگی کیونکہ ان کا منبع و ماخذ ایک ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ریاضی اور طبیعات کی مدد سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ زندگی کا عمل اور خلیات کی تقسیم کا عمل کیسے آگے بڑھا ہے۔ انہیں اس کام کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی مگر اس میدان میں آپ کی پیش رفت سے ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگ مدد لیکر اس مسئلہ کو حل کر سکیں اور نوبل انعام کے حقدار ٹھہریں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اگرچہ ۴۵ سال جلاوطنی میں گزارے مگر آپ پاکستان کو کبھی بھی نہیں بھولے۔ بہتوں نے آپ کو پاکستانی شہریت واپس کرنے کی ترغیب دی اور اس کے لئے کئی لالچ دیئے مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا۔ یہاں تک کہ جب برطانیہ کی ملکہ کی طرف سے آپ کو نائٹ کا خطاب مل چکا تھا تب بھی آپ اس بات کیلئے تیار نہیں ہوئے کہ اپنے ملک کی شہریت واپس کر کے کسی اور ملک کی شہریت قبول کر لیں۔ آپ پاکستان پر ایمان رکھتے تھے اور اسے پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو پاکستان کی اقتصادی اور سماجی ترقی کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آپ چودہ سال تک پاکستان کے تین صدور کے سائنسی مشیر رہے اور اس حیثیت سے آپ نے بار بار انہیں یہ ترغیب دی کہ وہ سائنس، ٹیکنالوجی اور تعلیم میں زیادہ سرمایہ کاری کریں۔ بہت سے ایسے کمیشن جنہوں نے ان شعبوں میں ترقی کیلئے منصوبے تیار کیے آپ ان کے سربراہ رہے۔ مگر بدقسمتی سے آپ کی سفارشات سیاسی رہنماؤں اور پالیسی بنانے والوں نے ہمیشہ نظرانداز رکھیں۔ آپ نے صدر ایوب خان کو یہ مشورہ دیا کہ امریکہ سے قرضوں کی بجائے ٹیکنالوجی حاصل کی جائے۔ اسی لئے صدر کینڈی نے Revalle Mission پاکستان بھیجا جس کا مقصد سیم اور تھور کے مسائل کا جائزہ لینا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے خلائی تحقیق کیلئے سپارکو کی تعمیر و تشکیل کے منصوبے پر بھی کام کیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ۱۴ سال تک ممبر رہے اور اس کے کئی منصوبوں اور کاموں میں مدد دیتے رہے۔ Kanupp اور Pinstech کے قیام میں بھی آپ کا تعاون شامل تھا۔ اگر صدر ایوب آپ کی سفارشات کو قبول کر لیتے تو پاکستان ری پروسنگ پلانٹ اور دیگر سہولتیں ساٹھ کی دہائی میں ہی حاصل کر لیتا جب کہ وہ کم قیمت پر اور عالمی پابندیوں کے بغیر مہیا ہو سکتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب مشرقی بھی تھے اور مغربی بھی۔ آپ کو ایک عالمی احترام نصیب ہوا۔ مختلف ممالک کے بادشاہ، صدور، وزرائے اعظم آپ کا استقبال کرتے تھے اور آپ کے مشورے کے متمنی رہتے تھے۔ آپ کے اعزاز میں ایک مرتبہ چین میں ایک عشائیہ دیا گیا جس میں چینی وزیر اعظم مہمان خصوصی کے طور پر شامل تھے۔ یہ بات سب کیلئے حیران کن تھی کہ چینی صدر نے سفارتی آداب و روایت کے برعکس اس تقریب میں شمولیت کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ اس عظیم انسان سے ملنا چاہتے تھے۔

تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کیلئے آپ نے بہت سے کام کیے ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کی باقی دنیا سے علیحدگی کو ختم کرنے کیلئے آپ نے ٹریسٹ میں ICTP کا ادارہ قائم کیا۔ (آپ جو گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں ایسی ہی تنہائی اور علیحدگی کا شکار رہ چکے تھے) یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں غریب ممالک کے سائنسدان امیر ممالک کے سائنس دانوں سے مل سکتے ہیں۔ یہی وہ ادارہ ہے جہاں سرد جنگ کے زمانے میں مشرق اور مغرب کے سائنس دان رابطہ

بقیہ صفحہ 129 پر

الله کے حوالے

MTA International
Janaza Prayers for 22/11/96
Prof. Dr. Abdus Salaam Sahib

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع
ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے

MTA
International
"LIVE"
22/11/96
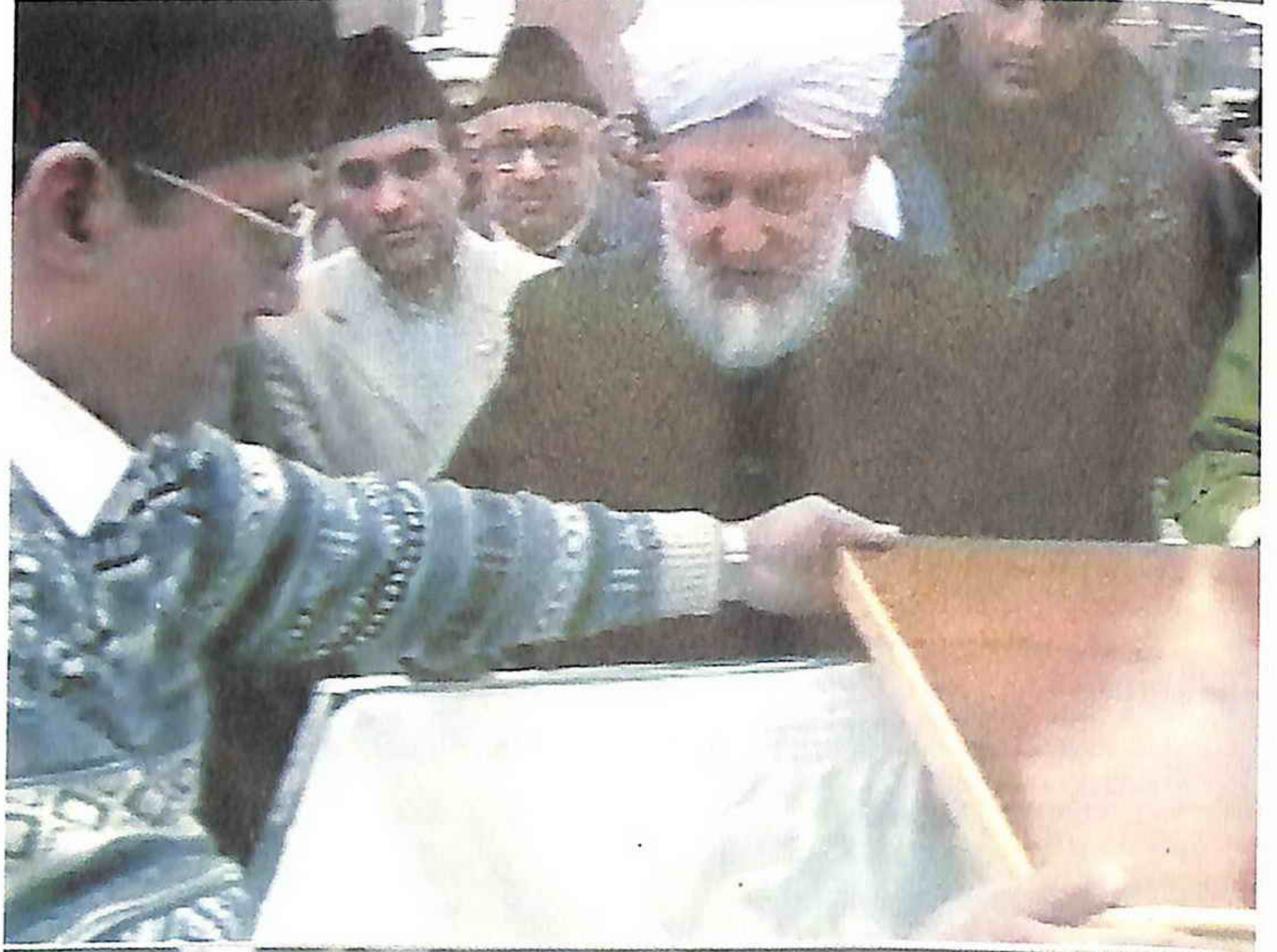
حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
جنازے کو کندھا دیتے ہوئے

(یہ تصاویر ویڈیو سے لی گئی ہیں
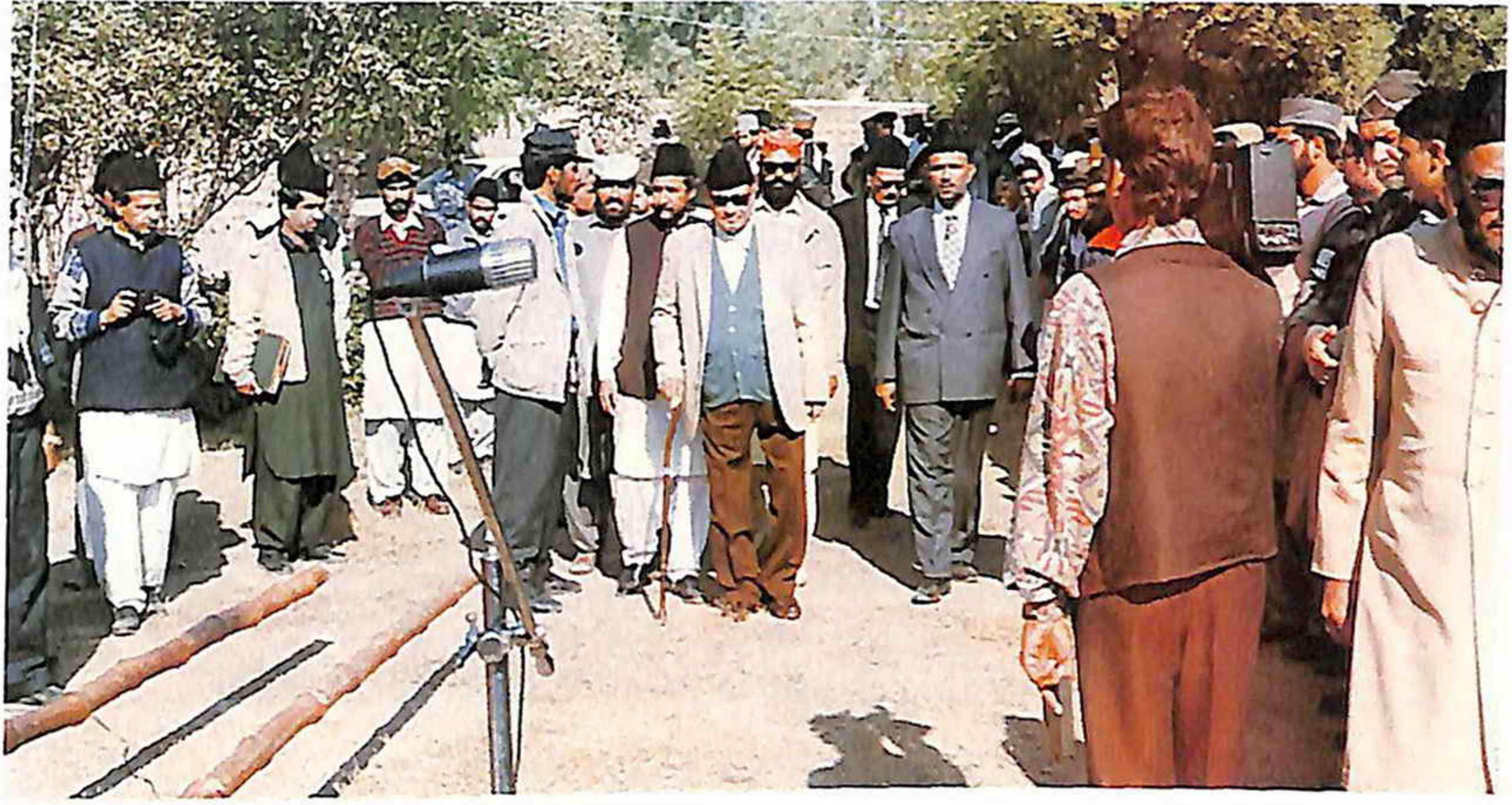
محترم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب امیر مقامی و ناظر اعلیٰ ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے تشریف لا رہے ہیں
تصویر میں دائیں راجہ منیر احمد خان صاحب صدر مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان اور بائیں محترم ملک خالد مسعود صاحب
ناظر امور عامہ صدر انجمن احمدیہ۔

ربوہ میں ادائیگی نماز جنازہ کا منظر

عالم پہ اپنی دھاک بٹھا کر چلا گیا
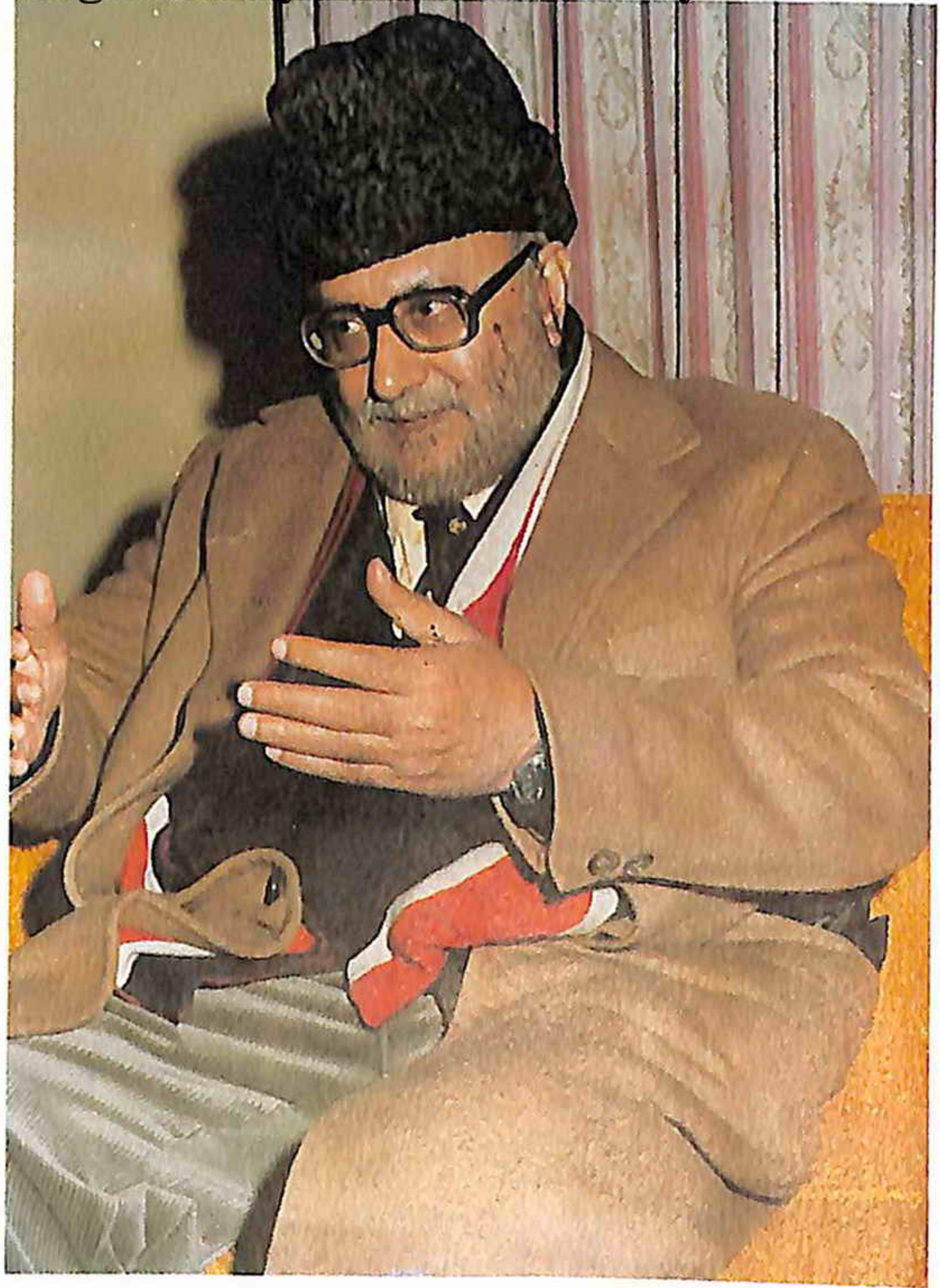
محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے جنازے کی آمد و انتظار اور دعا کے لمحات

اکابرینِ سلسلہ انتظار کرتے ہوئے محترم سید میر محمود احمد صاحب ناصر، محترم چوہدری حمید اللہ صاحب، محترم مولانا سلطان محمود انور صاحب

محترم ڈاکٹر صاحب مصروفِ کار

ڈاکٹر صاحب اپنے بہنوئی
مکرم ملک بشیر احمد صاحب
کے ساتھ
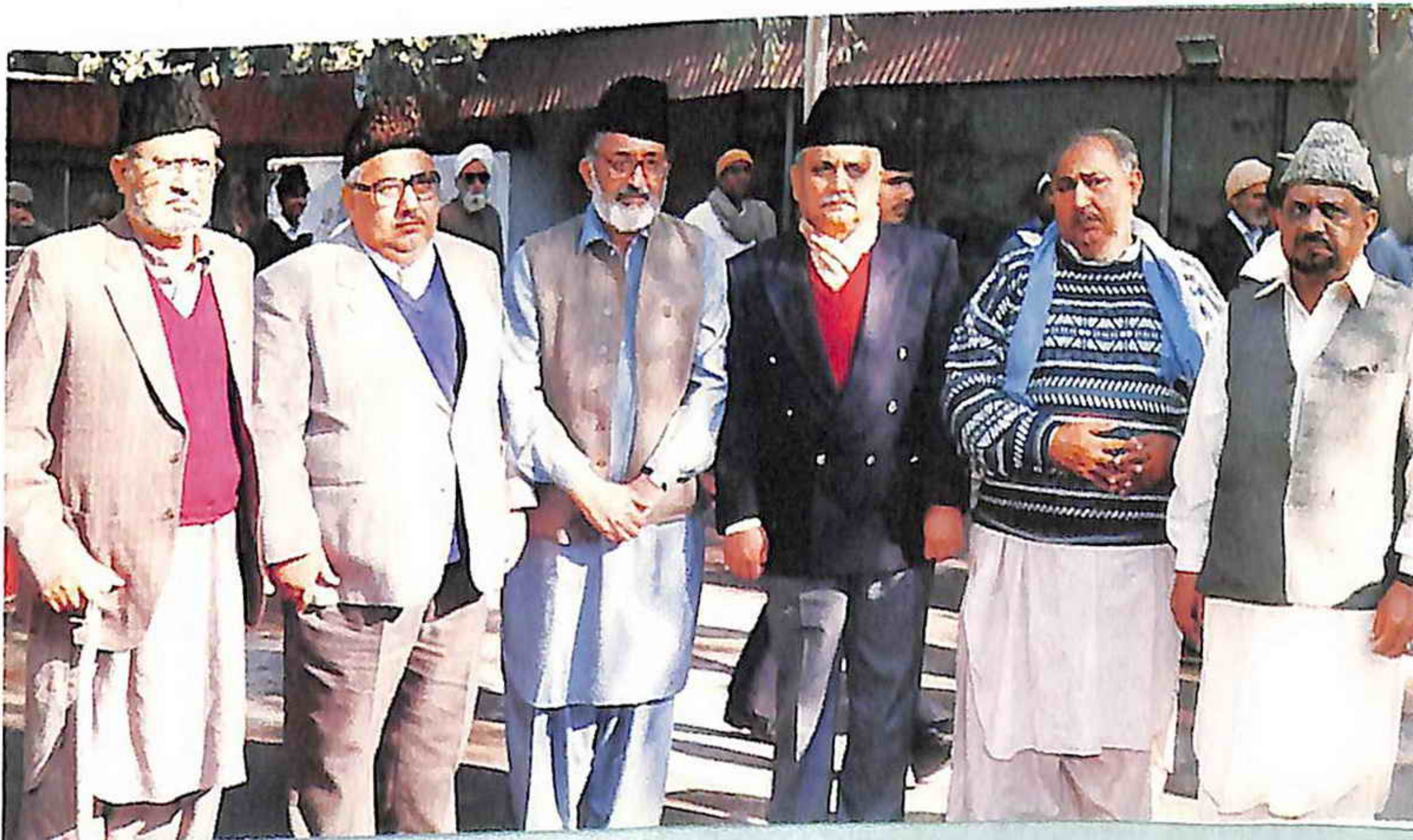
قرارداد تعزیت

بروفات محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

جماعت احمدیہ کے مایہ ناز فرزند اور عالمی شہرت کے حامل پاکستان کے قابل فخر سپوت محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو بعمر ۷۰ سال آکسفورڈ انگلستان میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ 20 جنوری 1926 کو اپنے ننھیال "سنتوکھ داس" ضلع ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جھنگ شہر کے ایک مخلص اور فدائی اور صاحب کشف والہام بزرگ تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم سے لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے تک آپ نے اول پوزیشن کا اعزاز حاصل کیا اور اس دوران کئی تعلیمی ریکارڈ قائم کئے۔ کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں اپنی غیر معمولی استعداد کی بناء پر چھ سال کا تعلیمی دور صرف تین سال میں مکمل کیا۔ آپ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ ریاضی کی حیثیت سے تدریسی فرائض ادا کرتے رہے اور پھر امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ اسی کالج میں صدر شعبہ بھی مقرر ہوئے اور اس دوران کئی ممالک میں تحقیقی لیکچر دیئے۔

محترم پروفیسر صاحب کو پاکستان، برطانیہ، اٹلی، پیرو، وینزویلا، پولینڈ، اردن، ترکی، بھارت، بنگلہ دیش، نائیجیریا، فلپائن، سوڈان، چین، امریکہ، کینیا اور ارجنٹائن وغیرہ ممالک نے متعدد اعزازی ڈگریاں پیش کیں۔ اس طرح پوری دنیا سے انہوں نے متعدد ایوارڈ حاصل کئے۔ علاوہ ازیں نشان امتیاز (پاکستان)، نشان اندلس (وینزویلا)، نشان استقلال (اردن)، نشان میرٹ (اٹلی)، جیسے اعزازات بھی آپ کو حاصل ہوئے۔ دنیا کی چھ یونیورسٹیوں میں آپ کا تقرر ہوا۔ اس کے علاوہ بے شمار عالمی اکیڈمیوں اور سوسائٹیوں کے رکن، منتخب فیلو اور بانی رہ چکے ہیں۔ ٹریسٹ اٹلی میں آپ کا قائم کردہ ادارہ "انٹرنیشنل سینٹر برائے نظریاتی فزکس" آپ کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کے ذریعہ تیسری دنیا کے ہزاروں سائنسدانوں نے استفادہ کر کے اپنے اپنے ملک کو فائدہ پہنچایا۔ آپ کا شمار دنیا کے نامور اور شہرہ آفاق سائنسدانوں میں ہوتا ہے کہ جن پر دنیائے سائنس بجا طور پر فخر کرے گی۔

آپ نے 1979ء میں فزکس میں نوبل انعام حاصل کیا۔ آپ نے 250 کے قریب تحقیقی مقالات لکھے اور متعدد کتب تصنیف فرمائیں۔

آپ جہاں خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر غیر متزلزل یقین اور ایمان کی بناء پر تمام سائنسدانوں میں ممتاز اور منفرد مقام کے حامل تھے وہاں احمدیت کی صداقت کا بھی ایک عظیم نشان تھے کہ آپ اس علم و معرفت سے نوازے گئے جس کا وعدہ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کو دیا گیا تھا۔ جیسا کہ حضور نے فرمایا:۔

"خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کریں گے"۔ (تجلیات الٰہیہ)

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی وفات سے جو ایک خلا پیدا ہوا ہے ہماری خدائے واحد و یگانہ و علیم و حکیم سے دعا ہے کہ وہ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کی اس پیشگوئی کے حامل سینکڑوں ہزاروں "عبدالسلام" جماعت احمدیہ کو عطا فرمائے۔ جن کا آغاز بھی نیک ہو اور انجام بھی نیک ہو۔ جنہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے وہی عظمتیں نصیب ہوں جو مرحوم ڈاکٹر صاحب کے حصہ میں آئیں۔ مجلس عاملہ خدام الاحمدیہ پاکستان اپنے پیارے امام ہمام ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اور محترم ڈاکٹر صاحب کے جملہ اہل خانہ و لواحقین اور عالمگیر جماعت احمدیہ کے تمام ممبران سے دلی تعزیت کا اظہار کرتی ہے۔ (راجہ منیر احمد خان صدر مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان) ہم ہیں ممبران عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان

مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ علی پور چٹھہ

ضلع گوجرانوالہ عالمی بیعتوں کے

پُرمسرت سلسلوں پہ اپنے پیارے امام ایدہ اللہ

تعالیٰ اور احبابِ جماعتِ احمدیہ کی

خدمت میں دِلی مبارکباد پیش کرتی ہے

جلسہ سالانہ .U.K کے انعقاد پر

پیارے آقا ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمتِ اقدس میں

دلی مبارکباد

چیمہ برکس کمپنی

نزد منصور والی اسٹیشن وزیر آباد

پروپرائٹر:- لیاقت علی چیمہ گوجرانوالہ کینٹ

فون نمبر:- ۲۶۱۴۰۵

اعلیٰ کوالٹی اور وزن میں پوری اینٹوں

کی خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ہر دن چڑھے مبارک ہر شب بخیر گزرے

عالمی بیعت کے تاریخی موقع پر

اپنے پیارے امام ایدہ اللہ تعالیٰ کیلئے محبت کے جذبات کیساتھ

چیمہ ٹریڈرز

کھیوے والی تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

پروپرائٹر:- چوہدری غلام سرور چیمہ

بہترین باسمتی چاول کی خرید و فروخت کے لئے

تشریف لائیں

مبارک صد مبارک

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع

ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی

خدمتِ اقدس میں جلسہ سالانہ U.K

کی عظیم الشّان کامیابی پر

مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

از

بشارت احمد ریحان

گوجرانوالہ کینٹ

"میرے فرقہ کے لوگ علم و معرفت میں
کمال حاصل کریں گے۔"

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے اِس الہام کے
ایک مصداق ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام کی یاد میں
کہ جن کی وفات نہ صرف شعبہ طبعیات کے لئے
بلکہ ساری دُنیا اور بالخصوص تیسری دُنیا کیلئے
ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ نارتھ کراچی

دُنیا کے قابلِ فخر وجود محترم پروفیسر ڈاکٹر
عبدالسّلام صاحب کی یاد میں کہ جن کی
رحلت سے ہم نہ صرف یہ کہ ایک عظیم
سائنسدان بلکہ ایک محبِّ وطن اور
شفیق انسان سے محروم ہو گئے ہیں۔

قائد و اراکین عاملہ مجلس خدّام الاحمدیہ صدر کراچی

نوبل اِنعام یافتہ سائنسدان

ڈاکٹر عبدالسلام

کو عالمِ اسلام اور ساری دُنیا کے لئے
ان کی گرانقدر خدمات پر خراجِ تحسین
پیش کرتے ہیں۔

قائد و اراکینِ عاملہ مجلس خدّام الاحمدیہ النّور کراچی

خداوند تعالیٰ سے دُعا ہے کہ
ڈاکٹر عبدالسّلام صاحب
کے درجات کو بلند فرمائے
اور آپ کو جنّت الفردوس کے
اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ آمین

قائد و اراکین عاملہ مجلس خدّام الاحمدیہ محمود آباد کراچی

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی یادیں!

اے عبدالسلام! اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے ـــــ وہ دِن دُور نہیں جب آپ کی جگہ ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں فرزندانِ احمدیت توحید کے عقیدے کو دُنیا میں قائم کرنے کے لئے اِس میدان میں پیش پیش ہوں گے۔

قائد مجلس و اراکینِ عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ گلشنِ احمد کراچی

مجلس اطفال الاحمدیہ

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور کو

سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں

حسنِ کارکردگی کی بناء پر

علمِ انعامی مجلس اطفال الاحمدیہ پاکستان

حاصل کرنے پر مبارکباد

منجانب اراکینِ جماعتِ احمدیہ

حلقہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

"میرے فرقہ کے لوگ اِس قدر علم
اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے
کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے
دلائل اور نشانوں کے رُو سے
سب کا مُنہ بند کر دیں گے۔"

(تجلّیاتِ الٰہیہ)

خدا سے دُعا ہے کہ جماعتِ احمدیہ عالمگیر میں
ایسے لوگ بکثرت پیدا ہوں۔ آمین

منجانب:-

مجلس خدام الاحمدیہ ضلع حافظ آباد

احبابِ جماعتِ احمدیہ سے درخواستِ
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعتِ احمدیہ عالمگیر
پر اپنے غیر معمولی افضال نازل فرمائے
اور اپنے تائیدی نشانات سے نوازے
آمین۔

منجانب:- قائد و اراکینِ عاملہ

مجلس خدام الاحمدیہ لانڈھی کورنگی کراچی

UNIVERSAL®

SIGN OF QUALITY

ORIGINAL

UNIVERSAL VOLTAGE STABILIZER
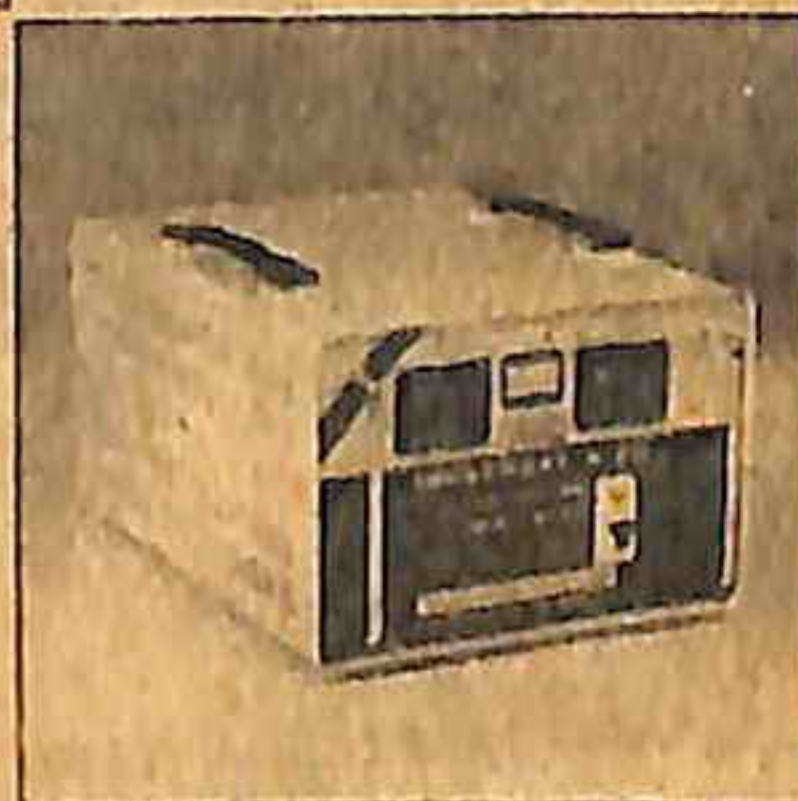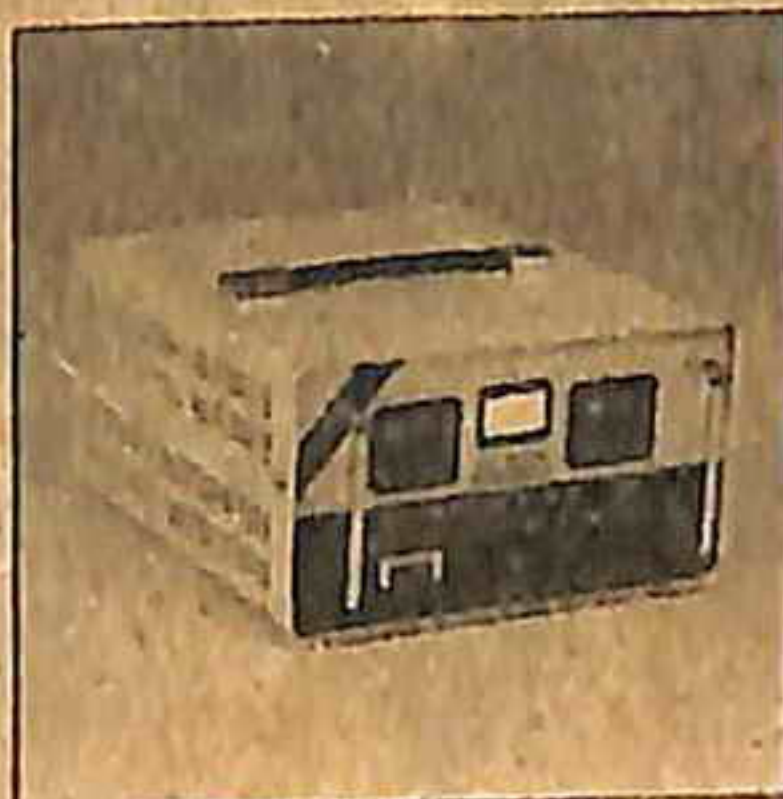
Registered Trade Mark No. 77396
Design patent No. 6439

Guaranteed Original Stabilizer.

Dealers BHAI BHAI TRADERS RABWAH
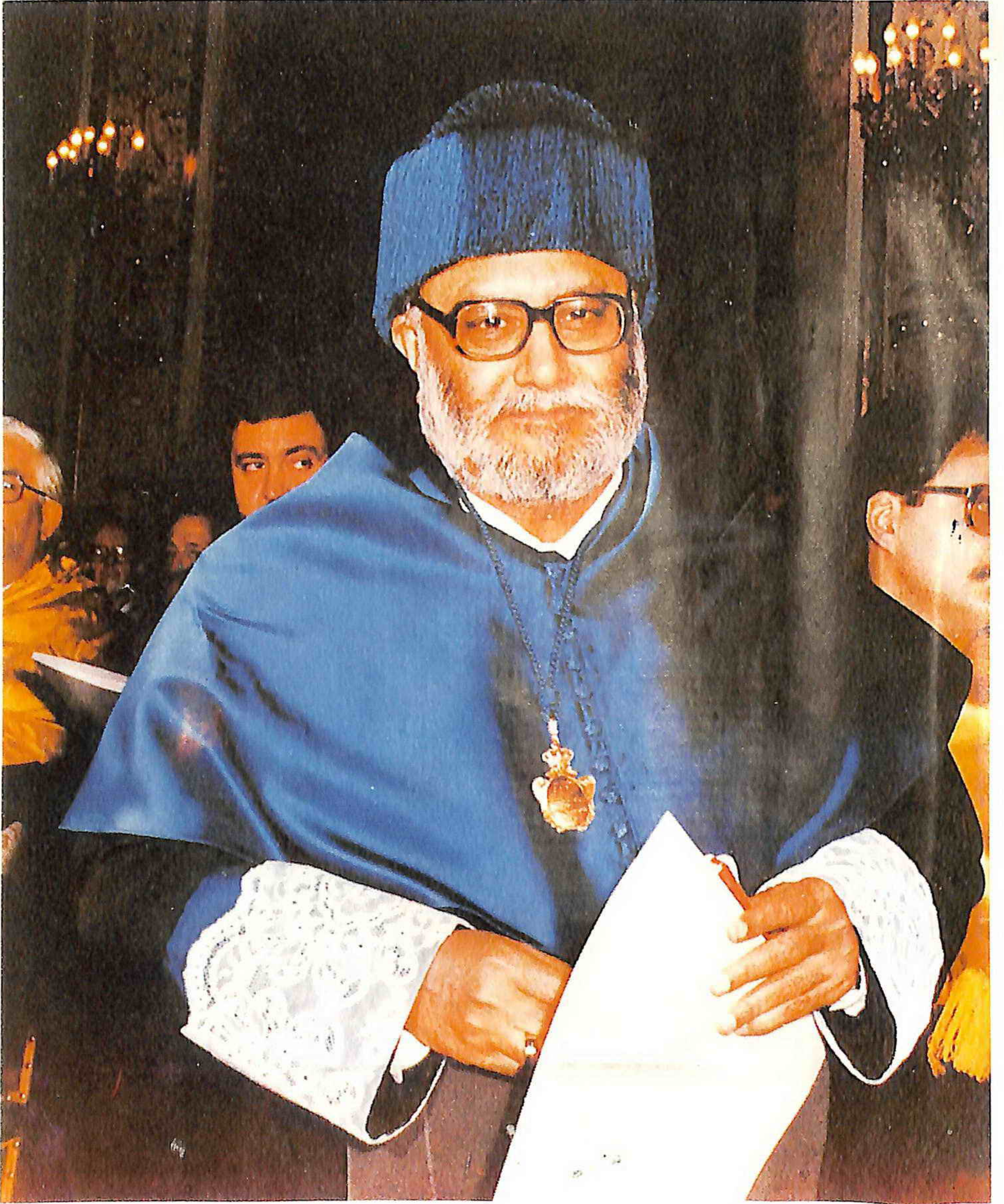
سپین کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کرتے ہوئے